قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2020 قیمت 15₹

ماہنامہ اُردو دُنیاَ

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

لفظ ان کے ہونے کی گواہی دیں گے

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

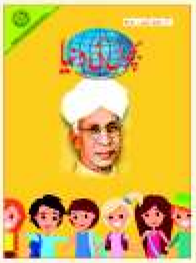

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22، شمارہ:12، دسمبر 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ۔ نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

زبان اور زمینی صورت حال

مقامی اور علاقائی زبانوں کا فروغ بے حد ضروری ہے — سیدہ نسیم سلطانہ 8

تعلیم و ترسیل

ڈیجیٹل لٹریسی — ف س اعجاز 12

خود انحصاری کا مہاتما گاندھی ماڈل اور نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 — وجیتا پرویز 15

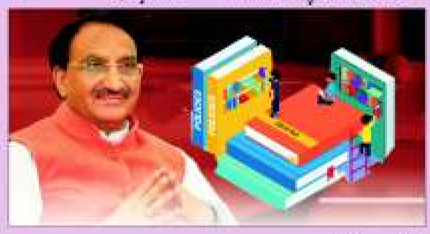

نقد و نگاہ

ادب میں اخلاقی اقدار کا تقاضا — محمد کلیم ضیا 19

جدید میتھلی اور ہندی قطب نما بابا ناگارجن — مشتاق احمد 22

مظہر امام کی نظمیں — شہاب ظفر اعظمی 24

'پیسہ اور پرچھائیں' کے ڈراموں میں المناک تصویر — سرفراز جاوید 27

اردو نصاب ہندوستان کے مدرسوں میں — توقیر راہی 32

چراغ دل

اروبندو گھوش ہندوستانی روحانیت کا مسیحا — شیخ عقیل احمد 34

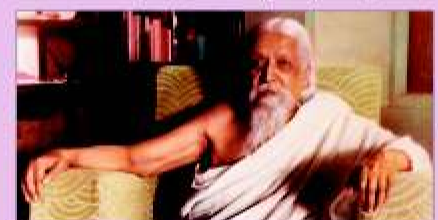

جہان غالب

غالب کی عظمت — نسرین بیگم 38

اس شکل سے گزری غالب — پرویز شہریار 41

غالب تاریخ کے دوراہے پر — ثاقب عمران 43

یاد مظفر

مظفر حنفی: یادیں باتیں — مناظر عاشق ہرگانوی 47

آہ مظفر حنفی — پی پی سریواستو رند 49

مظفر حنفی کی شاعری میں جدید حسیت — محسن جلگانوی 51

ادبیات فارسی

سیمیں دانشور — مہدیہ یزداں شیخ 55

ناول 'ہمسایہ ہا' — نگار 58

ہندوستان میں فارسی لغت نگاری — قمر حیدر 60

شخصیات

رشید اختر ندوی اور ان کی ناول نگاری — محمد جمیل اختر جلیلی ندوی 63

جگر اور ان کی عشقیہ شاعری — ندیم احمد 67

راحت اندوری: منفرد لہجے کا شاعر — محمد نوشاد عالم 69

نیا آسمان نئے ستارے

عابد پشاوری کی غزل گوئی — محمد رفیع 71

کمپیوٹر

ورک شیٹ کو سجانا 73

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 75

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 87

ہماری بات

اردو زبان کا دائرہ بہت کشادہ ہے مگر اس کی موضوعاتی زمین تنگ ہوتی جارہی ہے جب کہ یہ وہ زبان ہے جس میں سائنسی، سماجی، معاشی اور دیگر علوم کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ بہت سے علوم وفنون کا دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ بھی کیا گیا اور اس طرح اردو زبان کا کینوس علمی اور ادبی اعتبار سے وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ دنیا کے بیشتر موضوعات کا احاطہ اردو کے شعری اور نثری ادب میں کیا گیا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا زاویہ ہو جسے اردو زبان میں تشنہ چھوڑا گیا ہو۔ اردو زبان کی اسی وسعت اور ہمہ گیری کی وجہ سے اسے قبولیت کی سند بھی ملی ہے اور مقبولیت کی معراج بھی نصیب ہوئی ہے۔

اردو میں جتنی بھی اصناف ہیں چاہے شاعری کی ہوں یا نثر کی سب میں مہتم بالشان کتابیں موجود ہیں اور ان کتابوں کی وجہ سے بہت سے نئے علمی زاویوں سے شناسائی کی صورت بھی نکلی ہے۔ ماضی میں ہمارے اکابر اور اسلاف نے اتنی عمدہ کتابیں تصنیف اور تالیف کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ وسائل اور ذرائع کی کمی کے باوجود انھوں نے کیسے کیسے علمی اور ادبی ذخائر اردو کو عطا کیے اور کیسے کیسے بیش بہا شاہکار اردو زبان کو میسر آئے۔ یہ ان لوگوں کی محنت، لگن اور جدو جہد کا ہی ثمرہ تھا کہ آج اردو زبان کے پاس نہایت ہی وقیع اور بیش بہا ذخیرہ ہے اور اسے کسی بھی اعتبار سے دوسری زبانوں سے کمتر نہیں کہا جاسکتا۔ مگر المیہ یہ ہے کہ آج کے عہد میں جب کہ ہمیں ٹیکنالوجی کی سہولیات میسر ہیں اور ہمارے پاس علمی اور ادبی مواد تک رسائی کے بہتر ذرائع اور وسائل موجود ہیں، پھر بھی ہمارا علمی اور ادبی سرمایہ سکڑتا اور سمٹتا جارہا ہے۔ موضوعات کی سطح پر بھی تنگ دامنی کا احساس دامن گیر ہے کیونکہ اب جامعات میں انھی موضوعات پر تحقیقی وتنقیدی مقالے لکھے جاتے ہیں جن پر پیشتر کام ہو چکا ہوتا ہے اور یہاں بھی صورتِ حال یہ ہے کہ بات 'حیات اور کارنامے' سے آگے نہیں بڑھتی۔ نئے انکشافات یا نئے زاویوں کی جستجو کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی اور اس کے ساتھ ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ ہماری تنقید اور تحقیق کی سوئی صرف چند ناموں پر اٹک کر رہ گئی ہے۔ وہی چند ادبی شخصیتیں ہیں جن پر تنقیدی مضامین لکھے جاتے ہیں یا تحقیق ہوتی ہے۔ جب کہ ان معروف شخصیات کے علاوہ بھی اردو میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کی خدمات بہت وقیع ہیں مگر وہ تحقیق وتنقید کے دائرے سے ابھی تک باہر ہیں۔ ان کے حوالے سے کوئی بھی کتاب یا کوئی بھی مقالہ وجود میں نہیں آتا۔ خاص طور پر قصبات اور قریات میں بہت سی معتبر ادبی ہستیاں ہیں جن پر ہماری نگاہ نہیں جاتی، ماضی میں اردو شاعروں کے جو تذکرے مرتب کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر مولوی عبدالحق نے جن تذکروں کو اپنے بیش قیمت مقدمات کے ساتھ شائع کیا ہے ان میں شعرا کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے حوالے سے کوئی تحقیقی اور تنقیدی کام نہیں ہوتا۔ جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ ایسے شعرا کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور ان کے ادبی آثار سے قارئین کو متعارف کرایا جائے کیونکہ اب تذکروں سے بھی اردو داں طبقے کو زیادہ نسبت نہیں رہی ہے اور یہ سارے شعرا تذکروں کے صفحات میں ہی قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جدید دور نے بہت سے اہم موضوعات دیے ہیں جن پر تحقیق وتنقید کی ضرورت ہے۔ مگر ہمارے یہاں بین علومی اور بین لسانی موضوعات پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی جس کی وجہ سے عصر حاضر کے بہت سے مسائل وموضوعات سے ہم محروم رہ جاتے ہیں۔ سائنس اور دیگر سماجی، اقتصادی علوم میں جس طرح کے نئے زاویے تلاش کیے جارہے ہیں اردو ادب میں بھی اس طرح کی جہات کی جستجو بہت ضروری ہے تاکہ ہم عصر حاضر کے چیلنجز کا سامنا کرسکیں اور دنیا کو یہ باور کراسکیں کہ اردو زبان موضوعات کے اعتبار سے بھی کسی زبان سے کم تر نہیں ہے اور یہ تبھی ممکن ہوگا کہ جب ہم دوسری زبانوں کے مسائل اور موضوعات پر بھی نگاہ رکھیں گے اور وقت کے تقاضے کے مطابق اپنی تحقیق اور تحریر کو وسعت دیں گے۔

شیخ عقیل احمد

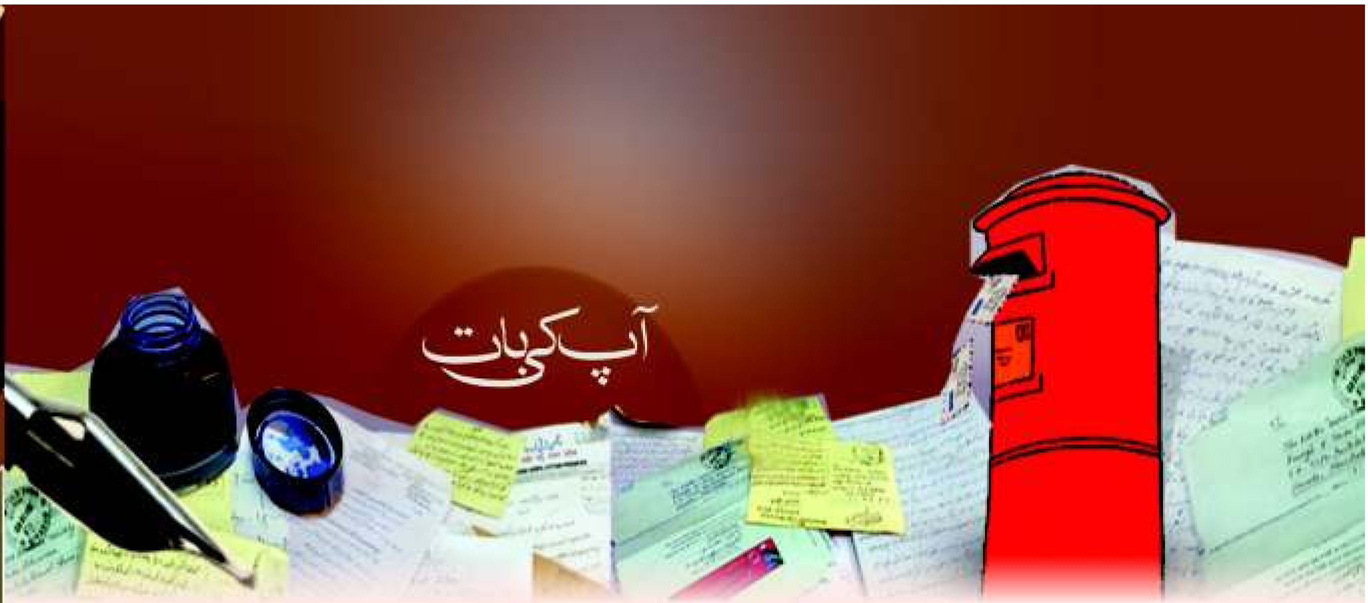

آپ کی بات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

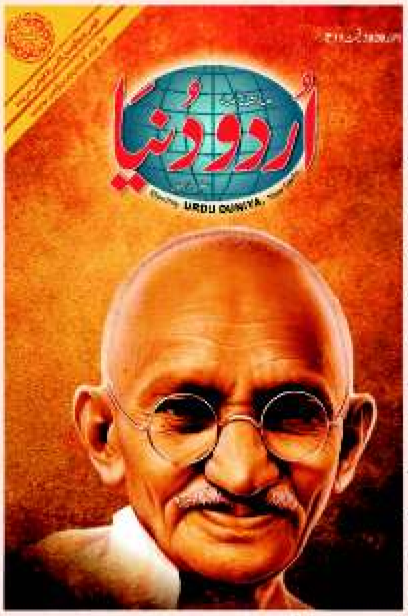

اردو دنیا اکتوبر 2020 کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ تقریباً 15 سال سے میں اردو دنیا کا قاری ہوں، مگر موجودہ شمارہ گاندھی جی کے یوم ولادت 2/ اکتوبر سے مخصوص ہے اور ایک عظیم تاریخی شخصیت کی طرف تصویری انتساب کی وجہ سے یادگار اور محفوظ رہ جانے والا شمارہ ہے۔ کیا کروں، رسالوں کا کیڑا تو نہیں، مگر اپنی عادت سے مجبور ہوں، اس لیے صرف شکریہ جزاک اللہ کے رسمی کلمات کا اظہار نہیں کرتا، بلکہ رفتہ رفتہ تمام تحریروں کا نگاہِ شوق سے مطالعہ کرتا ہوں، تقدیم وتاخیر اور ترجیح وعدم ترجیح کی بات اور ہے۔ اردو دنیا کا اداریہ بھی کافی وقیع اور غیر معمولی ہوتا ہے اور یہ یک ورقی اداریہ کسی اہم موضوع پر مبنی ہوتا ہے۔ ادارتی تحریر بھرتی کی نہیں ہوتی، اس کا رشتہ زبان وادب سے لے کر سماجیات واقتصادیات، اطلاعاتی انقلابات، تکنیکی ایجادات اور زندگی کے دیگر شعبوں تک دراز ہوتا ہے۔ اس بار کا اداریہ بھی جامع اور خوب ہے۔ یہ یک موضوعی اداریہ عدم تشدد کے پیام بر گاندھی جی اور ان کی اساسی تعلیمات وہدایات کے تذکرہ وتجزیہ پر مبنی ہے۔ ان کی قوم پرستی اور انسان دوستی کو ان کی زندگی کا ماحصل قرار دیتے ہوئے ان کی ایک اہم تعلیم انسانیت نوازی کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہم سب کے لیے عبرت آموز اور چشم کشا ہے۔

یوں تو شمارے کے سبھی مضامین لائق مشاہدہ ومطالعہ اور قابل اخذ ونقل ہیں، مراسلے میں تمام مضامین کے خوب وزشت کو زیر بحث لانے سے مراسلہ مکالمہ یعنی مضمون میں تبدیل ہوجائے گا، مگر دو تین مضامین کے مشمولات نے خاص طور پر متاثر کیا کہ ان کے بین السطور سے ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی سوندھی اور بھینی خوشبو پھوٹتی ہے۔ 'روح کے کاغذ پر کبیر کا حرف محبت' حقانی القاسمی کی ایسی تحریر ہے، جس سے ہماری مشترکہ تہذیبی روایت کے احیائے نو کا سراغ مل سکتا ہے اور فرقہ وارانہ یک جہتی کے چراغ سحری کی لو کو تیز تر کیا جاسکتا ہے۔ کبیر سے اجتناب واحتراز نے ہمارے دلوں میں غیریت واجنبیت کی ایک گہری خلیج حائل کردی ہے، اردو والوں نے کبیر کو نظر انداز کرکے حرف وشبد کی ایک حسین روایت کو بھی درگور کردیا ہے۔ حقانی القاسمی نے کبیر کی تکثیریت کو نمایاں کرتے ہوئے بجا لکھا ہے:

''کبیر تکثیری سماج میں تہذیبی وحدت کی ایک روشن علامت تھے۔ انھوں نے تشخص کی ان علامتوں (Identity Symbols) کو توڑا جو ذات، رنگ، نسل، مذہب اور بھاشا نے اپنی بالادستی اور اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے وضع کی تھیں۔ وہ ہیومنزم اور انسان دوستی کے لوک کوی تھے۔ پریم لیلا جن کی پہچان تھی اور انسانی محبت جن کی شناخت۔ کبیر نے ان مذہبی رسومات کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا جو اپنے مفاد اور منفعت کے لیے مذہبی ٹھیکیداروں نے معاشرے میں رائج کر رکھا تھا۔ کبیر موحد تھے مگر ترک رسوم پر ان کا یقین تھا اس لیے مذہب کے تخلیقی ذہن پر نہیں بلکہ مذہب پرستوں کے میکانکی ذہن

پر انھوں نے وار کیا، اور ہر اس تصور کی نفی کی جو تعصب، تفریق اور تشدد کو بڑھاوا دیتا ہے۔ انھوں نے انسان کو ذات، زبان، دھرم یا بھاشا سے نہیں بلکہ انسانیت سے پہچاننے کا درس دیا۔ کبیر کا بنیادی مقصد، آزادی، اخوت، اتحاد، مساوات اور ہر انسانی فرد کا ممکنہ ارتقا تھا۔...کبیر نے یہ بتایا کہ ہر انسان میں ایک ہی وجود کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور ہر ایک کے باطن کا روحانی آہنگ ایک ہے اور یہ بھی کہ ہریجن سے محبت کے بغیر ہری سے عشق مکمل نہیں ہوسکتا۔''

مشہور ناقد اور دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ڈاکٹر ابوبکر عباد کا مضمون 'بدھ مت، اس کا صحیفہ دھمپد اور اردو' بھی دستاویزی نوعیت کی تحریر ہے، جس کو حوالے کے طور پر محفوظ کرنا اور اس کی تشہیر کرنا ضروری ہے کہ دیگر ہندستانی مذاہب پر اردو میں ترجموں اور تذکروں کی بھرمار ہے، مگر ہندستان کے قدیم ترین مذہب بدھ مت کی صرف اسی کتاب کا اردو ترجمہ ملتا ہے۔ اردو میں دیگر ہندستانی مذاہب و صحائف کا ذکر اتنی کثرت سے ملتا ہے کہ اردو کو ایک تکثیریت پسند اور گنگا جمنی تہذیب کا جلی عنوان قرار دینے میں کسی تامل یا تعصب کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اردو کا سیکولر مزاج ہی تو ہے کہ تمام ہندستانی مذاہب کے صحیفے اور ان کی مذہبی کتابیں بشکل ترجمہ اردو میں ملتی ہیں۔ اردو میں کرشن بھکتی کے گیت لکھے گئے، گرونانک کو یاد کیا گیا، رام چندر وغیرہ کے بارے میں مدحیہ نظمیں تخلیق کی گئیں، ہندو فلسفے اور ویدانت کے نکات کو اردو میں بیان کیا گیا۔ اردو میں عید بقرعید اور محرم کے ساتھ ہولی اور دیوالی پر بھی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ابوبکر عباد کی اس بات سے کلی طور پر اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ:

''اسے اردو زبان کا امتیاز اور اس کی رواداری کہنا چاہیے کہ اس زبان نے اپنے اندر نہ صرف عالمی ادب، تاریخ و سیر، منطق و فلسفہ، سائنس و کیمیا اور ہر قسم کے موضوعات کا تعارف کرایا، مضامین اور کتابیں لکھیں اور ان کے مقدس صحیفوں کے ترجمے بھی عام لوگوں تک پہنچائے۔ دھمپد کا ترجمہ بھی اردو زبان کی علم دوستی اور مذہبی رواداری کی ایک عمدہ مثال ہے۔''

شمارہ کے دیگر مندرجات و مضامین بھی لائق مطالعہ اور مذاکرہ ہیں۔ سلیم محی الدین کا مضمون غالب، ہاکنگ، خدا اور کائنات ایک نئے زاویۂ تحقیق کا در وا کرتا ہے اور اردو میں ایک عمدہ تثلیثی اشتراک قائم کرتا ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن کا ادبی سرمایہ (مشتاق احمد وانی)، حقوق نسواں کی ایک بلند آواز: پروفیسر شمیم نکہت (پروین شجاعت)، سفرنامے کی تاریخی اور سماجی اہمیت (ارشد جمیل)، مکتوبات سرسید (سلطانہ واحدی)، اختر انصاری کا افادی ادب (عادل حیات)، خواجہ غلام السیدین (محمد احمد دانش)، رباعیات اور کلیم عاجز (یاسمین خاتون)، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد: انسان دوستی کا پیامبر (سفیان احمد انصاری)، آنند نرائن ملا (افضل خان) مولانا محمد علی جوہر: تعلیمی نقطۂ نظر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (ایم نسیم اعظمی)، ڈاکٹر ایم نسیم بہ حیثیت محقق و تنقید نگار (عتیق الرحمٰن)، شاہ تراب علی قلندر کی اصلاحی شاعری (جاوید احسن)، جن کتابوں نے متاثر کیا (محمد فاروق اعظم)، نظامیہ طبی کالج کا تعارف اور کتب خانہ (جہانگیر احساس)، اردو تحقیق اور مولانا امتیاز علی عرشی (نوشین حسن)، اردو رسم الخط (ریاض احمد)، ڈراما انارکلی اور فلم مغل اعظم (افسانہ حیات) بھی اس شمارے کی زینت ہیں، جن کے مطالعے سے تحقیق و تنقید، ادب و صحافت اور تعلیم و تاریخ کی نئی جہتیں منور و روشن ہوتی ہیں۔ تعارف و تبصرہ والا حصہ بھی خوب ہے، تمام مبصرین نے بھرتی کے تعریفی جملے سے تبصرہ کو گراں بار نہیں کیا ہے۔ خبرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ ادب گلوب پر کیا کچھ رونما ہو رہا ہے اور یہ کہ قومی کونسل ادبی منظرنامے پر کتنی فعال اور سرگرم ہے۔

رسالے میں تنوع و ندرت ہے۔ 'کتاب دریچہ' اور 'نیا آسمان نئے ستارے' سے معنون جن گوشوں کا اضافہ کیا گیا ہے، وہ بھی قابل داد ہے۔

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی: شعبۂ اردو بی ایم کالج، رہیکا، مدھوبنی، بہار

ستمبر ماہ کے شمارے میں پدم شری گلزار دہلوی کے اِمسال 12 جون کو ملکِ عدم چلے جانے پر جناب معصوم مرادآبادی نے ایک معقول و مناسب خراجِ تحسین و عقیدت مقالہ پیش کیا ہے۔ اس کے آغاز میں صفحہ 31 پر ہی اول کالم میں موصوف کی بابت 'دلی کے روڑے تھے' یہ الفاظ متنازع فیہ ہیں۔ اگلے صفحے پر ہی اس شاعر کا یہ ایک شعر

میں عجب ہوں امام اردو کا
بتکدے میں اذان دیتا ہوں

فی الاصل استعاراتی زبان کے شعری پیرائے میں ہی ایک لائقِ تفہیم اعلان ہے۔ وہ ایک مذہبی ہندو ہونے کے باوصف تا حیات اسلامی رسوم وغیرہ کی نشان دہی کرتے رہے تھے۔ بالخصوص 'سائنس اور شاعری' جیسے متضاد موضوعات کی بابت انھوں نے جو باہمی مناسبت قائم کی تھی، وہ ان کی پروازِ تخیل کی بلندی، ندرت اور جدّت کے باعث کل عالم میں ہمارے ملک کا نام سرِ فہرست رکھتی رہے گی۔

اسی شمارے میں بلند پایہ و مایہ ناز ادیب، افسانہ نگار و صحافی جناب نند کشور وکرم کے گذشتہ برس 27 اگست کو جنت نشین ہونے کے بعد جناب خورشید اکرم صاحب نے جو مقالہ شائع کروایا ہے، اس کے آغاز میں ہی نند کشور وکرم کی 'سیلفی' اور ایک دوست کی حیثیت سے ادارے نے مصنف کے بطور جو تصویر شائع کی ہے، وہ ادارے کی ذہانت و لیاقت کا بہترین نمونہ ہونے کے باعث قابلِ صد تحسین ہے۔ فقط اول صفحہ 5 پر ہی غلط لفظ 'پرواہ' درج ہو گیا ہے، جبکہ فارسی زبان میں اس اسم مؤنث لفظ کا صحیح املا ہے 'پروا'۔ ص 36 پر پہلے تو ناقد نے وکرم صاحب کی بابت یہ توصیفی جملہ رقم کیا ہے کہ ''وہ رسائل میں اپنے اوپر گوشے چھپوانے اور نمبر نکالنے میں دلچسپی نہیں رکھتے'' اور اس کے بعد ہی راولپنڈی (پاکستان) سے برسوں سے شائع ہو رہے 'چہارسُو' اور دیگر موقر جرائد میں شمیم حنفی، نیّر مسعود، شفیع جاوید وغیرہ کی سوانح عمری وغیرہ کے بارے میں مطلوبہ مواد جمع کرنے کے مقصد سے در در کی خاک چھانتے اور سَر دھڑ کی گویا بازی لگانے کی حقیقی داستان بھی بخوبی رقم کی گئی ہے۔ یہ ادیب اردو، ہندی اور انگریزی ان تین زبانوں کے اہم معیاری تراجم کے موجب عالم بھر میں ہمارے ملک کا نام سرِ فہرست رکھنے میں کاملاً کامراں رہے ہیں۔

جدید افسانہ نگاروں میں جناب بلراج مینرا کا مقام خاص ہے۔ شاعری میں 'سہلِ ممتنع' (سنسکرت اور ہندی میں 'وی انجنا' قوتِ لفظ) ان کے افسانوں میں غور و خوض کی دعوت، آرٹ کی مختلف بانگیوں کا احاطہ کرنے کو 'کمپوزیشن' کے نام سے محترمہ نور فاطمہ کا بلراج مینرا کے افسانوں پر مبنی تنقیدی مضمون قابلِ مدح ہے۔

اکتوبر ماہ کے شمارے میں تمام مشمولات معیاری ہیں، تاہم یہ خاکسار ان درج ذیل مضامین سے ازحد متاثر رہا ہے۔

حقانی القاسمی کا سنت و مہا کوی کبیر کی شخصیت، دوہوں اور پدوں پر مبنی مقالہ ازحد اعلیٰ و ارفع ہے۔ ہندی اکادمی دہلی سے شائع ہندی جریدے 'اندر پرستھ بھارتی' کے کسی پرانے شمارے میں کسی سوامی کا تحریر کردہ اور اس حیرتناک سرخی 'کون کہتا ہے کہ کبیر ان پڑھ تھے؟' والا کمال کا مضمون شامل تھا۔ اس مقالے کا لب لباب یہ تھا کہ کبیر جی اگرچہ اپنے ہی حقیقی اعتراف 'مَسی کا گد چھوؤ یونہیں، کلم گہی نہیں ہاتھ' کے بموجب ان پڑھ یعنی

بموجب ضرب المثل' کالا اکشر بھینس برابر' کے ہی مصداق تھے، تاہم وہ ہمیشہ علما وفضلا کی صحبت سے محظوظ وفیضیاب ہوا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے دوہوں و پدوں وغیرہ میں استفہامیہ انداز کے ساتھ حقیقی تجربات واحساسات کی گیرائی وگہرائی ملا کرتی ہے۔ حقانی القاسمی کے مضمون میں صفحہ 45 پر کبیر کو' شیخ تقی کے مرید' کا اعلان کیا گیا ہے، جبکہ اس کے عین برعکس وہ خود مرید شیخ صاحب کو ہی تنبیہ کرتے ہوئے ایک استاذ کی مانند نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''گھٹ گھٹ ہے اوی ناسی ،بن ہو تکی تم شیخ''۔ صفحہ 45 پر' تنوع میں وحدت' الفاظ میں 'تنوع' کی بجائے 'کثرت' لفظ کا تصرف زیادہ بہتر و موزوں ہوتا۔ دیگر لاتعداد خصوصیات کے علاوہ اس مقالے کا جمع نقطہ (پلس پوائنٹ) اس میں ہندی لفظیات کا بکثرت استعمال ہے اور یہ اس شعر کو صادق ٹھہراتا ہے۔'' جب سے ہندی سے محبت ہوگئی ہے ،میری اردو خوبصورت ہوگئی ہے۔''

جناب جی ایم پٹیل نے شہرۂ آفاق شاعر ساحر لدھیانوی کی مایۂ ناز شاعری اور شخصیت پر مضمون لکھا ہے۔ فقط ہندی فلم' بازی' کے نغمے میں یہ مصرعے بھی درکار تھے

ٹوٹے ہوئے پتوار ہیں کشتی کے تو غم کیا
ان ہاری ہوئی بانہوں کو پتوار بنا لے

ایک بار ساحر گورنمنٹ کالج، لدھیانہ کی سالانہ تقریب میں گئے ،تو انھوں نے اس مطلع والی نظم سے خاصی تالیاں بٹوری تھی۔

ہم بھی ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

جب وہ ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ لینے کے لیے دہلی گئے، تب زینوں پر چڑھتے ہوئے اپنی والدہ کو قریب جاتی ہوئی محبوبہ امرتا پریتم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے تھے۔ ''اماں یہ بھی آپ کی بہو بن سکتی تھی۔'' اس وقت والدہ نے غیر جانبداری اور بے اعتنائی سے مملو یہ مختصر جواب دیا تھا۔'' اب تو کسی کو بھی اپنی بیوی بنا لو۔'' اس کے بعد مذہبی تفریق کے موجب ساحر کا ارمان پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا تھا۔ قدیم اداکارہ نرگس نے اپنے ایک انگریزی مقالے میں ساحر کی فلم' پیاسا' کی بہت تعریف کرتے ہوئے ایک دیگر نغمے کے ان بولوں' تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم' کو اپنا پسندیدہ نغمہ قرار دیا تھا۔

محترمہ سلطانہ واحدی نے سرسید احمد خاں پر اپنے مضمون میں ان کے مکتوبات کے توسط سے ان کے' دل کی باتوں' کو مثالوں کے ساتھ رقم کیا ہے۔

ایک بار کسی ادیب نے سرسید سے پوچھا تھا۔'' سنا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے تمام دیوان ان کے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے ہی تحریر کردہ تھے۔ اس کے بارے میں اپنا خیال بتانے کی زحمت فرمائیں۔'' اس پر سید صاحب نے کہا تھا۔'' ذوق بھلا کیا کھا کر ظفر کے دیوان لکھے گا؟۔ یہ کہو کہ ان کو تو قلعے کے تعلق سے زبان (اردو) آ گئی ہوگی۔'' اس لاجواب جواب سے سرسید کی حقیقت پسندی، صاف گوئی اور دوراندیشی کا پتہ چلتا ہے۔ ویسے ذوق کو اپنا استاذ بنانے کے باوصف ظفر نے ہر ایک شاعر کو اپنے اس شعر سے ہمیشہ ریاض کرتے رہنے کا سبق دیا تھا کہ۔

''ظفر اپنی ریاضت کا نہ جب تک پھل ہو، نہ تو پل پیر کا کام آئے، نہ استاد کا پل۔''

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک** : کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

پہلی تخلیق پہلا تاثر

اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ کسی بھی قلمکار کی تخلیق جب کسی رسالے میں شائع ہوتی ہے تو اسے بے حد مسرت کے ساتھ ساتھ نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ اردو زبان کے فروغ وترقی میں اور اس کی ترویج واشاعت میں ادبی رسائل کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

ماہنامہ' اردو دنیا' نئی دہلی میں میرا پہلا مضمون فروری 2020 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان' سوشل میڈیا اور اردو افسانہ' تھا۔' اردو دنیا' میں شائع ہونا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ اور یہ اعزاز مجھے دوبار حاصل ہو چکا ہے۔

جب کوئی طالب علم کسی امتحان کی تیاری کرتا ہے، خوب پڑھائی کرتا ہے، دل و جان سے، دن رات محنت کر کے امتحان دیتا ہے اور امید کرتا ہے کہ وہ اچھے نمبرات حاصل کر کے کامیاب ہو جائے۔ اور جب نتیجہ اس کی امید کے مطابق آتا ہے۔ تب اس طالب علم کو جو خوشی محسوس ہوتی ہے، وہی خوشی مجھے رسالہ اردو دنیا میں پہلی دفعہ شائع ہونے پر ہوئی تھی کیونکہ میں نے اپنے مضمون پر کافی محنت کی تھی اور اسے تقریباً چھ سات مہینے میں مکمل کیا۔

رسائل نے مجھے شائع کر کے یقیناً میرے لکھنے لکھانے کے عمل کو زندگی بخشی ہے۔ اگر رسائل نہ ہوتے تو لکھنے لکھانے کا عمل ڈائری کی حد تک ہی محدود رہتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایک مختصر سفر طے کرنے کے بعد ڈائری میں ہی دم توڑ دیتا۔ رسائل کی خدمات کے ضمن میں این سی پی یو ایل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ نہایت ہی کم قیمت پر اتنے معیاری رسائل میں نے ابھی تک نہیں دیکھے۔

❖ **محمد علیم اسماعیل** : وارڈ نمبر 15، ایٹ پوسٹ: تعلقہ نندورا، ضلع بلدانہ (مہاراشٹر)

■

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ' اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

مقامی اور علاقائی زبانوں کا فروغ بے حد ضروری ہے

سیدہ نسیم سلطانہ

سیدہ نسیم سلطانہ

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ تدریس اور صحافت سے ان کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔ ان کی تحریریں اخبارات و رسائل میں چھپتی رہی ہیں۔ ٹیلی ویژن میں بھی بحیثیت، نیوز کاسٹر، اسکرپٹ رائٹر، پرومو رائٹر کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ مختلف اسکولوں اور کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی دو کتابیں منظر عام پرآچکی ہیں۔ 'خواتین کی احتجاجی شاعری' اور 'الیکٹرانک میڈیا میں اردو زبان و ادب کا فروغ'۔ ان دونوں کتابوں کو علمی اور ادبی حلقے میں غیرمعمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اردو کے مسائل و متعلقات پر ان کی اچھی نظر ہے اور فروغ اردو کے لیے مختلف سطحوں پر کوشاں رہتی ہیں۔

سوال: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: زبانیں بولیوں کی اعلیٰ شکل ہوتی ہیں جو آگے چل کر ادب کا سرمایہ کہلاتی ہیں۔ بولیوں کو تراش خراش کر زبان کے اصول، قواعد وضوابط مرتب کیے جاتے ہیں، سانچے میں ڈھالا جاتا ہے تب سرکاری اور درباری زبان کا درجہ دیا جاتا ہے۔ سرکاری سرپرستی میں بھی کارآمد ادب تخلیق کروایا جاتا ہے۔ ادب پارے میں نثر ہو کہ نظم زبان کی اہمیت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

پہلی اہم وجہ یہ ہے کہ ہم صرف انگریزی زبان کو فروغ دینے میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ ریاستی اور علاقائی زبانوں کو فروغ نہ دینے اور زبانوں کو روزگار سے مربوط نہ کیے جانے کے سبب زبانیں معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ بے شک دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے انگریزی زبان پر عبور ضروری ہے لیکن مقامی اور علاقائی زبانوں کا فروغ بھی بے حد ضروری ہے تاکہ ہماری شناخت باقی رہے۔ ہندستان مختلف مذاہب، رنگ و نسل اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے، یہاں کے لوگ الگ الگ مادری زبان بولتے اور پڑھتے لکھتے ہیں لیکن ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو تو روزگار کے وسائل محدود ہیں۔ سماجی اور سیاسی ارتقا کے لیے مختلف زبانوں پر عبور نہ سہی کم از کم واقفیت ضروری ہے۔ اگر مادری زبانوں کی بقا نہیں تو ہم بھی ختم ہو جائیں گے، برناڈ شاہ کا قول ہے کہ ''اگر کسی قوم کو ختم کرنا ہو تو اس کی مادری زبان کو ختم کردو قوم خود بخود ختم ہو جائے گی۔''

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار استعمال کیا جانا چاہیے؟

ج: زبانوں کی زندگی کے لیے ان کے پڑھنے، لکھنے اور بولنے کے لزوم کو عام کیا جانا چاہیے۔ مقامی، علاقائی اور ریاستی زبانوں کو روزگار سے مربوط کرتے ہوئے بہ نسبت انگریزی زبان کے اپنی زبانوں کے لیے زیادہ معاوضے مقرر کیے جائیں تاکہ لوگ زبانوں کے متعلق عدم تحفظ کا شکار نہ ہوں۔ مطالعے سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ جاپان جیسے ترقی پذیر ملک میں کمپیوٹر کا ایک بٹن بھی مادری زبان میں ہوتا ہے اور انگریزی زبان کو ثانوی درجہ حاصل ہے جب کہ ہمارے یہاں ایسا نہیں۔ آج جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو نئی نسل علاقائی، مادری و ملکی زبانیں بولتی تو ضرور ہے لیکن پڑھنے لکھنے سے قاصر ہے۔ ہر فرد کو چاہیے کہ ملک کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے بھی محبت کرے اس کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: زبانیں تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ جدید معاشرے کی تشکیل اور نشو ونما میں زبان و ادب، تہذیب و ثقافت نے اہم کردار نبھایا ہے۔ ماہرین سماجیات نے ثقافت کی تعریف مختلف انداز میں کی ہے۔ مثلاً، رسم و رواج، روایات، امن و جنگ کے زمانے میں انفرادی اور اجتماعی رویے، دوسروں سے اکتساب کیے ہوئے طریقہ کار، تاریخ، سائنس مذہب، اخلاقیات، قانون عادات، خصلتیں، صلاحیتوں اور فنون کا وہ مجموعہ ثقافت کہلاتا ہے جو نہ صرف ماضی کا ورثہ ہے بلکہ مستقبل کا تجربہ بھی ہوتا ہے۔

ثقافت اپنے وجود اور بقا کے لیے زبانوں پر انحصار کرتی ہے کیونکہ زبانیں ہی ثقافت کی زندگی اور اپنی تاریخ

کے اظہار کا واحد ذریعہ ہوتی ہیں گویا ثقافت اور زبانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ثقافت اپنی تاریخ، تہذیب اور چھاپ چھوڑ جاتی ہے جس کے بیاں کے لیے زبانیں اپنا وجود منواتی ہیں۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: بے شک جب زبانیں ہی فوت ہو جائیں گی تو انسانی وراثت کا تحفظ کیسے ممکن ہوگا گویا زبانوں کی موت کے بعد انسانی وراثت 'اندھوں کے شہر میں آئینے فروخت' کرنے کے مترادف ہوگی۔ قدیم تہذیبوں اور قوموں کو سمجھنے کے لیے ادب اور تاریخ ہی واحد ذریعہ ہے، اگر زبانوں کی موت ہو جائے یعنی کوئی زبانوں کو سمجھنے، پڑھنے اور لکھنے والا نہ ہو تو قومیں اور تہذیبیں بھی قصۂ ماضی بن کر رہ جائیں گی۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: بلا شبہ سائنسی یا سماجی مواد کی کمی کے سبب زبان پر نہ صرف منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ زبان ناخواندگی کے حصار میں مقید رہ جاتی ہے اور دوسری زبانوں میں موجود مواد سے اپنی کمی کو پورا کرتی ہے جس کے سبب خود اپنی شناخت کھو دیتی ہے۔ اسی لیے زبان میں مواد وافر مقدار میں موجود ہو اور سرمایہ الفاظ کا ذخیرہ وسیع ہو۔ خاص طور پر اردو زبان میں تو مواد کی کمی ہی نہیں قوت جاذبیت کے ساتھ ساتھ اس زبان کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ سائنسی اور تکنیکی الفاظ بھی اس زبان میں جذب ہو کر خود اپنا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: موجودہ دور میں اردو زبان سنگین صورت حال سے نبرد آزما ہے۔ اول تو اردو اپنی شناخت کھو رہی ہے۔ ہندوستان کی کثیر آبادی اردو بولتی ضرور ہے لیکن پڑھنا لکھنا نہیں جانتی، زبانیں تو وہی مستند مانی جاتی ہیں جو بولنے کے ساتھ پڑھی اور لکھی جائیں۔ فلم انڈسٹری کی جب بات کرتے ہیں تو کوئی نغمہ یا کوئی مکالمہ اردو کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، ٹیلی ویژن کا کوئی ڈرامہ یا ایڈورٹائزمنٹ اردو کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس کے باوجود بھی اسے ہندی کہا جاتا ہے جو تنگ نظری اور لسانی تعصب کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اردو والے خود اردو کے نہیں 'اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے' تقریباً 35، 40 سال سے کم عمر لوگ اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے گویا نئی نسل اردو زبان سے بے بہرہ ہے۔ نوجوان نسل میں صرف حلقۂ اردو سے تعلق رکھنے والے ہی اردو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں لیکن ان میں بھی بہت سے ایسے ہیں جو ہلکی پھلکی اردو لکھنے سے بھی قاصر ہیں۔ تعلیمی اداروں میں روز بہ روز اردو طلبا کی گھٹتی تعداد کے سبب سرکار اردو تعلیمی اداروں کو یا تو ختم کر رہی ہے یا ضم کر رہی ہے۔ حق بات تو یہی ہے کہ اردو زبان کے زوال کے ہم خود ذمے دار ہیں، آخر سرکار کے رحم و کرم پر یہ زبان کب تک زندہ رہے گی؟۔ عہد رفتہ میں ہندوستان میں راج کرنے والی اردو زبان آج سارے ملک میں ترسیلی زبان کا درجہ رکھنے کے باوجود بھی مفقود ہوتی جا رہی ہے، بول چال کی حد تک ہی محدود ہو چکی ہے، ایسے میں اگر ہم والدین اور طلبا کو سرکاری طور پر ایک زبان اردو پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں تو وہ یہ عذر کرتے ہوئے اردو پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ "اردو تو گھر میں بولی جاتی ہے اس سے کوئی فائدہ نہیں"۔ تعلیمی ادارے بھی اردو زبان کے تحفظ میں ناکام ہو چکے ہیں۔ میں 14 برس کی عمر سے تدریسی خدمات انجام دے رہی ہوں۔ شہر حیدر آباد کے تقریباً تعلیمی اداروں کا دورہ کر چکی ہوں جہاں ہر جماعت میں بلا لحاظ مذہب وملت بحیثیت سرکاری زبان اول یا دوم ہندی پڑھنے والے طلبا کی تعداد کم از کم 40 تا 50، 55 ہوتی ہے تو اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد بامشکل 5 تا 7 یا 8، 10 سے زائد نہیں ہوتی۔

تھا عرش پہ ایک روز دماغ اردو
پامال خزاں آج ہے باغ اردو
غفلت تو ذرا قوم کی دیکھو کاظم
وہ سوتی ہے بجھتا ہے چراغ اردو

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

ج: اردو زبان پر چاہے جتنے بھی کھوٹے لگائیں، چاشنی اور شیرینی اس کا خاصہ ہے، اس کی اپنی انفرادیت مسلمہ ہے۔ اردو رسم الخط پر دسترس نہ ہونے کے سبب سوشل میڈیا میں نئی نسل رومن انگریزی میں اردو تحریر کر رہی ہے جس سے ایک طرف اردو رومن انگریزی میں فروغ پا رہی ہے تو دوسری طرف اس کی شکل مسخ ہو رہی ہے۔ اردو کی شکل اس وقت بھی مسخ ہوتی نظر آتی ہے جب زبان پر بولی حاوی ہو جائے، کیونکہ یہ ریختہ کا دور نہیں، اردو کو بنتے بگڑتے، سنورتے زمانے بیت گئے لیکن اس کے شباب میں شراب کی کمی نہیں، آج بھی اردو ایک کمسن الھڑ دوشیزہ نظر آتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو پڑھنے لکھنے کا چلن عام کیا جائے، نئی نسل میں اردو سے رغبت پیدا کی جائے۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: اردو کا مستقبل روشن بھی ہے تاریک بھی۔ روشن اس لیے کہ آج اردو کسی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے نہیں نہ صرف ابلاغ عامہ کی ترقی میں نمایاں کردار نبھا رہی ہے بلکہ ترسیل و ابلاغ میں دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ہمراہ حیات جاودانی کا ثبوت دے رہی ہے۔

اردو دو طبقوں میں منقسم ہو چکی ہے ایک طرف وہ طبقہ ہے جو اردو زبان و ادب کے فروغ اور ترویج و اشاعت کے لیے جی جان سے جٹا ہے، دامے درمے قدمے سخنے اردو زبان کی بقا، ترویج و ترقی میں مصروف ہے تو دوسرا طبقہ وہ ہے جو آئے دن اردو زبان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہا ہے۔ خاص طور پر اردو پروفیسر، اساتذہ اور اردو صحافی اردو کے سب سے بڑے دشمن ہیں جو ساری زندگی اردو کے ٹکڑوں پر پلتے رہے، اردو کے صدقے اور طفیل ساری زندگی ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزاری لیکن اپنے بچوں تک کو اردو زبان نہیں سکھائی، نہ ہی سرکاری طور پر ایک زبان اردو پڑھائی اور نہ ایسے شاگرد تیار کیے جو اردو زبان کی ترویج و ترقی اور بقا کے لیے کام کریں۔ اس طبقے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اردو کے نام پر کفن بھی بیچ کھاتے ہیں۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

ج: سب سے پہلے گھروں میں اردو رسائل اور اخبار منگوائے جائیں، نئی نسل میں اردو پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا کیا جائے۔ لغات سے استفادے کی عادت ڈالی جائے تاکہ اردو پڑھنے والا صحیح تلفظ ادا کرے۔ تعلیمی اداروں میں مشاق اردو اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا جائے تاکہ تدریس کے ساتھ ساتھ طلبا کی زبان و بیان اور املا و انشا پر بھی خصوصی توجہ دیں۔ سوشل میڈیا ضرورت کی حد تک استعمال کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے اساتذہ کے مضامین، ناول، افسانے اور شاعری وغیرہ کے مطالعے پر زور دیا جائے تاکہ زبان دانی کا شعور حاصل ہو اس عمل سے ممکن ہے آگے چل کر مہارت بھی حاصل ہو جائے۔ ہم نے بھی تو یہی سب کچھ کیا ہے۔

س: کیا اردو کے ادارے زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت رک سی گئی ہے؟

ج: جہاں تک میرا تجربہ ہے زبان پر لکھنے والوں کی تعداد کم ہے۔ تحقیق اور تنقید مشکل اور روکھے سوکھے مضامین

ہونے کے سبب لکھنے والوں کی اکثریت ادب کو پسند کرتی ہے۔ ایسے ادارے بھی کم ہی ہیں جو زبان کی اہمیت کو مدّ نظر رکھ کر کتابوں کی اشاعت عمل میں لائیں لیکن ہمارے یہاں اردو کا سب سے بڑا ادارہ قومی اردو کونسل ہے جس نے مقدار کا نہیں معیار کا خیال رکھا ہے اور ضروری کتابوں کی اشاعت و امداد پر بھی خصوصی توجہ دیتا رہا۔ قومی اردو کونسل سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ آگے ادب کے علاوہ زبان پر کتابوں کی اشاعت پر زیادہ توجہ دے گا۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ شہر حیدر آباد میں 70, 60 سے زائد اردو میڈیم اسکول ہیں۔ جس وقت میں تلنگانہ ٹی وی چینل میں برسر خدمت تھی اردو کی زبوں حالی پر ایک خصوصی پروگرام تیار کیا تھا اسی ضمن میں، میں نے شہر کے مشہور اردو میڈیم اسکولوں کا دورہ کیا اور اردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا، ان میں قابل ذکر نام حسینی علم گلز ہائی اسکول، فوقانیہ ذکور گورنمٹ ہائی اسکول، چنچل گوڑہ ہائی اسکول، اشرف المدارس ہائی اسکول نورخاں بازار گلز ہائی اسکول، یاقوۃ پورہ گورنمنٹ ہائی اسکول، دبیر پورہ گورنمنٹ ہائی اسکول، پیٹلہ برج گورنمنٹ ہائی اسکول، نام پلی گلز ہائی اسکول، محبوبیہ ہائی اسکول، کرما گوڑہ گورنمنٹ اردو میڈیم ہائی اسکول وغیرہ کے ہیں۔

تمام اسکولوں میں چند کو چھوڑ کر سب میں اردو طلبا کی تعداد گھٹ رہی ہے جس کے سبب کئی اردو میڈیم اسکولوں کو ضم کیا جاچکا ہے۔ تحتانیہ، وسطانیہ اور فوقانیہ سطح پر اردو، سائنس، سماجی علم، ریاضی کے اساتذہ برسر خدمت ہیں۔ اردو میڈیم کالجوں کو بھی ضم یا ختم کیا جارہا ہے۔

میری آنکھوں کے سامنے حال ہی میں اردو اور ینٹل کالج حمایت نگر، اردو آرٹس ایوینگ کالج، اردو ماڈل اسکول جو ایڈڈ تھے برخواست کیے جا چکے ہیں اور وہاں کے اساتذہ کو کہیں اور منتقل کیا جاچکا ہے۔ 1956 کے بعد وجود میں آئی عوامی تحریک کے علم بردار پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب، کمیونسٹ لیڈر و انقلابی شاعر مخدوم محی الدین، پروفیسر حسینی شاہد، پروفیسر نظام الدین، پروفیسر عالم خوند میری، ڈاکٹر سید محمد، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر منوہر راج سکسینہ، ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ، محترمہ اندرا دھن راج گیر صاحبہ وغیرہ کی خدمات، قربانیوں اور عرق ریزیوں کو یکسر فراموش کرتے ہوئے تاریخی، تہذیبی و ثقافتی، ایثار و قربانی کے شہر گہوارۂ اردو حیدر آباد سے اردو تعلیمی اداروں کے خاتمے کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا ہے۔

اہم ذمے دار میں ان نام نہاد اردو شخصیتوں کو مانتی ہوں جنھوں نے اردو کو انا کی بھینٹ چڑھا دیا اور دوسری طرف وہ اساتذہ ہیں جنھوں نے سفارشات کی بنیاد پر اردو تعلیمی اداروں میں ملازمت حاصل کی لیکن اردو کے تئیں نہ ہی مخلص رہے اور نہ ہی وفادار انھوں نے نہ ہی حق تعلیم ادا کیا اور نہ ہی اردو طلبا کی تعداد بڑھانے میں فعال رہے۔

شہر حیدر آباد کی چار اہم یونی ورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم اردو کی باقاعدہ اولین یونی ورسٹی جامعہ عثمانیہ، سنٹرل یونی ورسٹی آف حیدر آباد، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی ہے جہاں اردو کے شعبے قائم ہیں اس کے علاوہ مکمل اردو کی یونی ورسٹی مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی بھی قائم کی گئی ہے لیکن یہاں بھی غیر اردو داں طبقے کا غلبہ اور اقربا پروری وقبیلہ پروری کا رواج ہے۔

حیدر آباد کی اردو دنیا میں ایک خوشگوار موڑ تشکیل تلنگانہ کے بعد آیا۔ حکومت تلنگانہ نے اردو زبان کی ترویج و ترقی اور بقا کے لیے منظّم اقدامات اٹھاتے ہوئے ریاست تلنگانہ میں کم و بیش 906 ریسی ڈینشیل اسکول، 12 ریسی ڈینشیل جونیر کالجس اور 53 ڈگری کالجس قائم کیے نیز 31 اضلاع میں 204 اقلیتی اقامتی اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ہر سال ان تعلیمی اداروں سے ایک لاکھ سے زائد اقلیتی طلبا فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ اقلیتی تعلیمی اداروں میں بحیثیت زبان اول اردو زبان لازمی قرار دی گئی ہے لیکن اضلاع میں بحیثیت زبان دوم ہی پڑھائی جارہی ہے، وجہ یہاں کے اساتذہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اضلاع کے طلبا کے لیے اردو مشکل ہے۔

آج پریم چند، کرشن چند، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت رام پرساد بسمل، پنڈت برج نارائن چکبست، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، بلراج منیرا، راما نند ساگر، امریتا پریتم، فراق گورکھپوری، بلراج کومل، راجندر سنگھ بیدی، عرش ملیسانی، منشی نول کشور، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جیسے اردو کے بے شمار ادیب و شاعر یاد آتے ہیں جنھوں نے اردو زبان کی خون جگر سے آبیاری کی۔ اب رہا سوال اردو اساتذہ کی تعداد کا تو حکومت نے ہر اسکول میں حسب ضرورت اردو ٹیچر کی اسامیاں پر کردی ہیں، جونیئر اور ڈگری کالجس میں بھی اردو اساتذہ کا تقرر کیا جاچکا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: یوں تو شہر حیدر آباد میں بے شمار لائبریریاں ہیں لیکن چند اہم لائبریریوں کا ذکر کرتی چلوں۔ سالار جنگ میوزیم ریسرچ لائبریری، ھادیِ دکن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، سٹی سنٹرل لائبریری، نظام ٹرسٹ لائبریری، ادارہ ادبیات اردو لائبریری، چومحلّہ پیالس لائبریری، اردو ہال لائبریری، اردو اکیڈیمی لائبریری، اردو گھر لائبریری، مسجد عالیہ گن فاؤنڈری لائبریری، اے سی گارڈ لائبریری، علامہ اقبال لائبریری کے علاوہ یونی ورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں جہاں کہیں بھی اردو شعبے قائم ہیں لائبریریوں کا لزوم ہے لیکن آج یہ بات انتہائی غمگین ہوکر کہتی ہوں کہ سرکاری ملازمین اور اردو داں طبقے کی کوتاہی، تساہلی اور غیر ذمے داری کے سبب تقریبا کتب خانوں میں نادر و نایاب اور کمیاب کتابیں، مخطوطات نیست و نابود ہوچکے ہیں ہو رہے ہیں۔

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہوتو ساتھ رکھوں نو حہ گر کو میں

حیدر آباد کے کتب خانوں میں بہت سے اخبار و رسائل منگوائے جاتے ہیں جن میں قابل ذکر نام ہیں۔

انقلاب ممبئ، دلی، ہند سماچار، روزنامہ راشٹریہ سہارا، روزگار سماچار، اردو ٹائمز، قومی آواز، اودھ نامہ، اخبار مشرق، اردو نیٹ، تاثیر، سیاسی تقدیر، سالار ہند، رابطہ ٹائمز، ملاپ، دور جدید، اورنگ آباد ٹائمز، ڈیلی ہندوستان، سیاسی افق، تیسری دنیا، نشیمن، ملت، اردو دنیا وغیرہ اور رسائل میں، اردو دنیا، خواتین دنیا، فکر و تحقیق، آج کل، اردو چینل، الحسنات، اردو معلم، افکار ملی، بچوں کی دنیا، ایوان اردو، بیسویں صدی، پیراہن، تحریر نو، تہذیب الاخلاق، خاتون مشرق، اسپین، ہماری آواز، زبان و ادب، آب وگل، اردو ادب، جہان غالب وغیرہ۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟

ج: اس سوال کا جواب میں بڑے ہی درد کے ساتھ دے رہی ہوں۔ یوں تو شہر حیدر آباد میں درجنوں تنظیمیں، انجمنیں اور ادارے ہیں لیکن چند ہی فعال ہیں جو مقصد کے تحت کام کررہے ہیں۔ تقریبا تنظیموں، انجمنوں اور اداروں کا قیام ہی اس لیے عمل میں لایا جارہا ہے کہ آمدنی کا کوئی ذریعہ ہو جائے، اردو کی خدمت کے نام پر مالی امداد جاری ہو اور منتظم ان پیسوں سے اپنی ذاتی ضروریات پوری کرلیں۔ اردو سمینار، مشاعروں اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے نام پر فنڈز حاصل کرلیں، اسٹیج پر ایک دوسرے کو پھول مالا پہنائیں، واہ واہی کریں، ہوٹل میں بریانی اڑائیں اور

اخباروں میں بڑھا چڑھا کر نیوز چھپوائی جائے۔ گویا اب تو لگتا ہے کہ اردو کے تئیں کوئی بھی دیانت دار نہیں، سستی شہرت، ایک دوسرے پر سبقت لے جانا اور ایک دوسرے سے خود کو بڑا ثابت کرنا ہی ان کا نصب العین بن چکا ہے۔ اردو کی بقا، ترویج و ترقی اور خدمات کے لیے اردو تنظیموں، انجمنوں اور اداروں سے مدد کی امید مری نظر میں خام خیالی ہے، ہماری نادانی ہے۔ میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ بجائے ان کے، اردو کے تئیں مخلص، دیانت دار لوگوں کا انتخاب عمل میں لایا جائے اور فرد واحد کو ذمے داریاں سونپی جائیں، ان سے کام لیا جائے ان شاء اللہ مثبت نتائج برآمد ہوں گے ورنہ۔

اردو کا غم مرگ سبک بھی ہے گراں بھی
ہے شامل ارباب عزا شاہ جہاں بھی
مٹنے کو ہے اسلاف کی عظمت کا نشاں بھی
یہ میت غم دہلی مرحوم سے نکلے
اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس ضمن میں، میں شیخ عقیل احمد ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کے اس اقدام کی ستائش کرتی ہوں کہ انھوں نے ایسی نام نہاد تنظیموں اور انجمنوں کے لیے مالی تعاون کی امداد نامنظور کردی۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی یا قومی سطح پر نہیں کیا گیا؟

ج: ایسی بہت سی شخصیات ہیں جو گوشۂ گمنامی میں رہ کر اردو کے لیے خدمات انجام دے رہی ہیں اور اردو کی بقا کے لیے ہر وقت دامے درمے قدمے سخنے تیار رہتی ہیں لیکن آج تک ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا کیوں کہ خدمات کا اعتراف یا ایوارڈز تو اکثر سفارشات، دست بوسی و پابوسی کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں اس معاملے میں بھی قبیلہ پروری اور اقربا پروری کا رواج ہے۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

ج: بس اتنا سمجھ لیجیے کہ اردو میری مادری زبان نہیں بلکہ ماں ہے۔ چوڑی، گجرا، کنگن، جھمکا، بندیا، گہنا اردو ہی ہے۔ ادارہ قومی اردو کونسل سے یہ امید رکھتی ہوں کہ جب کبھی میں اردو کے فروغ کے لیے پوری ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ کام کرتی ہوں تو مجھ سے مکمل تعاون کیا جائے گا۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: یہی کہ اول تو کسی بھی تنظیم کے بنا، فرد واحد سے کام لیا جائے۔ اردو پڑھی جائے، لکھی جائے اور بولی جائے۔ اردو کو اس کی شناخت واپس کی جائے۔ مجھے کسی زبان سے تعصب نہیں ہندوستان کی تمام زبانیں میری ہیں لیکن جب اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا جاتا ہے تو میں کچھ کہنے پر مجبور ہوں۔ ساری فلم انڈسٹری اردو کے کاندھوں پر ٹکی ہے، اس کے باوجود بھی وہ ہندی فلمیں ہی کہلاتی ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اس بے انصافی کو ختم کرنا ہوگا، اردو پر چڑھے مذہبی چشمے کو اتار کر عوامی رنگ دینا ہوگا۔ والدین کو چاہیے کہ سرکاری طور پر ایک مضمون اردو ضرور پڑھائیں۔ ہر گھر میں اردو رسائل، اخبار اور کتابیں منگوائی جائیں، کم از کم ایک گھنٹہ مطالعے کی عادت ڈالی جائے وغیرہ۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

ج: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ بچہ بچہ اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھ جائے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اکثر لوگ سوشل میڈیا میں اردو رسم الخط کے بجائے رومن انگریزی میں اردو لکھ رہے ہیں، ایسے لوگ یا تو اردو رسم الخط نہیں جانتے یا پھر اردو کی بورڈ کے استعمال سے واقف نہیں ایسے لوگوں کے لیے خصوصی تربیتی کلاس کا اہتمام کیا جائے۔

خاص طور پر اردو میڈیم میں پڑھنے والے طلبا یا جو طلبا بحیثیت زبان دوم یا اول اردو پڑھ رہے ہیں انھیں اردو کی جدید ٹکنالوجی سے روشناس کروایا جائے اور جدید ذرائع ابلاغ میں اردو رسم الخط کی خصوصی تربیت دی جائے۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: اردو کا جتنا بھی علمی و ادبی سرمایہ ہے اسے علاقائی زبانوں میں منتقل کیا جانا چاہیے۔ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے اگر پروفیشنل مترجموں کے معاوضے کی ادائیگی ممکن نہ ہو تو مصنفوں کو چاہیے کہ وسیع القلبی سے کام لیتے ہوئے تاریخ ادب اردو کو، ایسے اشخاص جو اردو اور دیگر علاقائی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں ان سے اس شرط پر ترجمے کا کام لیں کہ وہ اپنی تخلیقات خود ان ہی کے نام سے منسوب کرنے اور شائع کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس عمل سے دیگر علاقائی زبانوں میں اردو زبان و ادب کا بیش بہا سرمایہ محفوظ ہوجائے گا۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: الحمد للہ بلاشبہ میرا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے اور تقریبا سبھی اردو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: ان شاء اللہ غیب کا علم کوئی نہیں جانتا لیکن امید کی جاسکتی ہے کہ زندہ رہے گی کیوں کہ صدیوں سے اس زبان کے خاتمے کی کوششیں کی جارہی ہیں لیکن اردو زبان اتنی ہی نکھرتی جارہی ہے۔ اس کا حسن مزید دوبالا ہوتا جارہا ہے۔ آج بھی یہ سولہ سالہ الھڑ دوشیزہ نظر آتی ہے۔ آج کے سائنس اینڈ ٹکنالوجی کے دور میں بھی اردو نے عالم شباب کا ثبوت اس طرح دیا کہ "الکٹرانک میڈیا نے اردو کو فروغ نہیں دیا بلکہ اردو نے الکٹرانک میڈیا کو فروغ دیا ہے۔"

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: غیر اردو حلقہ بھی اردو کی شیرینی، جاذبیت، رنگینی، رعنائی اور دوشیزگی پر فریفتہ ہے ورنہ آج فراق، چکبست، گلزار، سرشار، پریم چند، کرشن چند، وغیرہ نہ ہوتے۔ غیر اردو حلقے سے اردو کے مسلمان ہونے کا لیبل ہٹایا جائے۔ خاص طور پر نئی نسل کو اردو کی طرف راغب کیا جائے۔ قومی اردو کونسل اور ریاستی اردو اکیڈمیوں کو چاہیے کہ تمام اسکولوں میں وہ طلبا جو سرکاری طور پر ہندی یا تلگو یا دیگر علاقائی زبانیں پڑھتے ہیں وہاں اپنا ایک اردو ٹیچر مقرر کریں روزانہ یا ہفتے میں کم از کم تین دن اردو سکھائی جائے، تب دیکھیے کوئی بھی شخص ایسا نہ ہوگا جو اردو کی طرف کھنچا نہ چلا آئے کیونکہ اردو واحد زبان ہے جو ہر زبان کے لفظ کو اپنے اندر بآسانی جذب کرتی ہے گویا اردو کشش ثقل کا درجہ رکھتی ہے۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: پہلے ایسی تنظیموں کی شاٹ لسٹ بنائیں جو واقعی اپنے کام کے تئیں دیانت دار ہوں۔ قومی اردو کونسل اور ریاستی اردو اکیڈمیوں کو چاہیے کہ سیمنار، لکچر وغیرہ کے بجائے فنی، تعلیمی، تکنیکی اور دیگر فلاحی اداروں میں مفت اردو سکھانے کا انتظام کیا جائے اس کام کے لیے اپنے خصوصی ٹیچرس کا تقرر عمل میں لائیں اور ہر مہینہ قومی کونسل اور اردو اکیڈمیوں کے نمائندے ان اداروں کا دورہ کریں جنھیں اردو سیکھنے کی تربیت دی گئی انھیں اردو پڑھا کر اور لکھا کر دیکھا جائے۔ قومی اردو کونسل کے تحت ششماہی اور سالانہ امتحانات منعقد کیے جائیں بہترین مظاہرہ کرنے اور امتیازی نشانات حاصل کرنے والے طلبا میں اسناد و انعامات تقسیم کیے جائیں وغیرہ۔

■

Dr. Syeda Naseem Sultana
Asst. Professor, Dept of Urdu
Usmania University
Hyderabad - 500007(Telangana)

ف س اعجاز

ڈیجیٹل لٹریسی

'ڈیجیٹل لٹریسی' ایک عام جدید اصطلاح کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ ہر ملک کے نوجوانوں کو ڈیجیٹل لٹریسی یعنی ڈیجیٹل تعلیم سے سروکار ہے لیکن اس کے زیادہ سے زیادہ اطلاقی پہلو انگریزی اور دیگر یوروپی زبانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان کی مادری زبانوں میں ڈیجیٹل لٹریسی کے بارے میں خود متعلقی علوم ابھی زیادہ نہیں ہیں۔ (اردو میں تو بہت کم ہیں)۔ دراصل ڈیجیٹل لٹریسی سماجی سائنس کے رول کی توسیع کی کوشش پر مبنی ہے۔

مجموعی طور پر ڈیجیٹل لٹریسی نے عام تعلیم کے ساتھ معاونت کے وہ اصول وضع کیے ہیں جن سے مخصوص علم یا کئی علوم کے مابین مسابقت (کمپٹیشن) کی راہیں آسان ہوں۔ قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر ڈیجیٹل لٹریسی کا پھیلاؤ بڑھتا جارہا ہے۔ ڈیجیٹل لٹریسی ایک فرد کی گرامر، ٹائپنگ، متن وتصاویر، صوتی اور ڈیزائننگ کی تکنیکی پیشکش کو اعلیٰ معیار تک پہنچاتی ہے اور یہی تعلیمات ڈیجیٹل لٹریسی کا مجموعہ ہیں جس سے نئے کلچر اور تاریخ میں کشادہ راہیں کھلتی ہیں۔

امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کی ڈیجیٹل خواندگی ٹاسک فورس نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے ''ڈیجیٹل خواندگی اس صلاحیت کا نام ہے جو اطلاع و ترسیل کی ٹکنالوجیوں کو معلوم کرنے اور ان کی قدریں متعین کرنے بلکہ انھیں تخلیق کرنے میں مدد پہنچاتی ہے اور اطلاعات کی ترسیل کو علمی و تکنیکی دونوں طور پر ممکن بناتی ہے۔''

نورتھ کیرولینا اسٹیٹ یونیورسٹی کے ایک ڈیجیٹل خواندگی وتکنولوجی کے پروفیسر ہلر اسپائرس (Hiller Spiers) نے ڈیجیٹل لٹریسی کو تین چیزوں کا علم قرار دیا ہے:

1. ڈیجیٹل مواد کی تلاش اور تصرف
2. ڈیجیٹل مواد کی تخلیق
3. مواد کی دستیابی اور اس کی ترسیل میں اشتراک

ڈیجیٹل مواد کی تلاش اور تصرف

ڈیجیٹل مواد کا تصرف یا کھپت عملاً کسی مطبوعہ یعنی چھپے ہوئے مواد کے مماثل ہوتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ چھپا ہوا مواد مثلاً کوئی ناول یا اخبار اصل صورت میں ہاتھ میں لے کر پڑھا جاتا ہے اور ڈیجیٹل مواد مثلاً ناول یا اخبار اسکرین پر دکھائی دیتا ہے۔ البتہ اسے PDF کی حالت میں صفحہ بہ صفحہ ایک کلک کے ذریعے پلٹنا پڑتا ہے۔ کلک کرکے مطلوبہ صفحے تک پہنچنا یا اسے ٹھہرا کر دیکھنا یا پڑھنا تکنیک کا عمل ہے۔ متن کے اس مطالعے کو 'آف لائن ریڈنگ' کہا جاتا ہے۔

اسی متن کا مطالعہ 'آن لائن ریڈنگ' کہلاتا ہے جب اسے انٹرنیٹ پر دیگر مہارتوں یا سہولتوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ مثلاً ویب پر ایک صفحہ نگاہ کے سامنے آئے اور اس کے مطالعے یا جائزہ کے ضمن میں اضافی اہلیت یا معاونتوں مثلاً تصویری یا متحرک ویڈیوز، کسی صوتی، گرافک جُزو، ضروری حوالوں یا تبصروں کے لیے اشتراکی بٹنوں کی مدد کی ضرورت پڑتی ہو تو یہ مطالعہ آن لائن بن جاتا ہے جس کے لیے سرچ انجن کے ذریعے کلیدی الفاظ Key words اور حوالوں کو ٹٹولنا پڑتا ہے۔

ڈیجیٹل مواد کی تخلیق

ڈیجیٹل خواندگی مواد کی تخلیق بھی کرتی ہے جو ای میل، بلاگ، ٹوئیٹ اور ویڈیو وغیرہ کے ذریعے پیش ہوتا ہے۔ اس دور میں ڈیجیٹل تصنیف بھی ایک قابلِ ذکر پیشکش ہے جو سماجی طاقت کا ایک وسیلہ بن رہی ہے۔ ڈیجیٹل رائٹنگ میں عام ادب نگاری سے کچھ بڑے خطرات بھی درپیش ہوسکتے ہیں کیونکہ اسے فوری اور ہنگامی طور پر شیئر کیا جاتا ہے اور اس میں تخلیقی اور باہمی اشتراک کے تجربے زیادہ ملاحظہ کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک بھوجپوری فلم اداکارہ کو ذہن میں لائیں جو یوٹیوب پر روز سرِ شام دکھائے جانے والے چٹپٹی زبان کے ویڈیوز جن میں طنز و مزاح کے ساتھ وہ کبھی کبھی اپنی ہندی کویتا ئیں بھی ناظرین کو سناتی ہے۔ سماجی اور الیکٹرونک پروڈکشنز کو سماجی ناہمواری کے سیاسی زاویوں سے دیکھیے کہ وہ کس طرح ایڈونچر بھرے ردِعمل کو جنم دیتی ہیں جب کہ یہ امن شکنی کے خطروں سے خالی نہیں کیے جاسکتے۔

مواد کی دستیابی اور اس کی ترسیل میں اشتراک

روایتی نگارش ظاہر ہے کہ کسی کی ذاتی کوشش ہوتی ہے جبکہ ڈیجیٹل نگارش اکثر دوسروں کے ساتھ شیئر کرنے کے مقصد سے رواج پاتی ہے اور اس مقصد کی تکمیل کو آسان بنانے کے لیے وسائل بھی فروغ پاتے ہیں۔ چنانچہ ویب آلات (Web tools) باہمی شرکت کے لائق اور برائے استعمال آسان بنائے جاتے ہیں تاکہ یہ

ہماری ضروریات کی تکمیل میں موبائل اور انٹرنیٹ اتنے ضروری اور اتنے عام ہوگئے ہیں کہ جب ہم ڈیجیٹل انڈیا کہتے ہیں تو ملک میں ٹکنولوجی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں. ڈیجیٹل عہد کی شروعات 1980 کے بعد انٹرنیٹ اور ورلڈ وائڈ ویب سائٹ کے متعارف ہونے کے نتیجے میں ہوئی.

لکھنے کا عمل اس وقت تک بار آور رہتا ہے جب تک ادیب کو قاری میسر رہتے ہیں۔ ڈیجیٹل عہد میں سماجی نیٹ ورک سائٹس لوگوں کو تادیر ملوث رکھتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ چیٹنگ اور سفر کے دوران لیپ ٹاپ یا موبائل فون کے ذریعے اپنی سہولت اور خواہش کے مطابق اپنے

سارا کام آن لائن برادری میں گردش کر سکے۔ اس سے شہری سماج میں شرکت میں اضافہ ہوتا ہے اور ایک متحرک، فعّال اور زود آگاہ ایک دوسرے میں ملوث کمیونٹی تیار کی جاتی ہے، خصوصاً طالب علم برادری میں۔ چنانچہ اس میں یہ خطرہ بھی مضمر رہتا ہے کہ بعض باتوں کے عام ہو جانے سے کسی طالب علم کے نجی تحفظات اور نیک نامی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا انٹرنیٹ کی مشق کو اخلاق کا پابند کرنا بہت ضروری ہے۔

روایتی تحریر کے برعکس ڈیجیٹل تحریر کئی سہولیات اور مواقع کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کے مواد کی ترسیل مختلف متون، ڈیزائن، تخلیق، صوتی و بصری (Audio and Visual) فن کی افزائشی تکنیک کے سہارے ممکن ہو پاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ڈیجیٹل لٹریسی کے لیے ملٹی کریسیز (Multicracies) یا اکیسویں صدی کی مشترکہ لٹریسیز کی اصطلاحیں بھی رائج ہوگئی ہیں۔ حالانکہ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ایک شخص ڈیجیٹل طور پر تعلیم یافتہ ہو تو تمام خبری وسائل، پیغام رسانی، ٹوئیٹ، انسٹاگرام اور فیس بک کے استعمال پر پورا عبور رکھتا ہو۔

لکھنے کی صلاحیتوں پر برا اثر

ہماری ضروریات کی تکمیل میں موبائل اور انٹرنیٹ اتنے ضروری اور اتنے عام ہوگئے ہیں کہ جب ہم ڈیجیٹل انڈیا کہتے ہیں تو ملک میں تکنولوجی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ڈیجیٹل عہد کی شروعات 1980 کے بعد انٹرنیٹ اور ورلڈ وائڈ ویب سائٹ کے متعارف ہونے کے نتیجے میں ہوئی۔

سوشل میڈیا کے متعارف ہونے کے ساتھ لکھنے کی صلاحیتوں پر بتدریج برا اثر پڑا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پسندیدہ، دوستانہ، رشتہ دارانہ یا تفریحی و معلوماتی نیٹ کے رابطوں پر مصروف رہنے کی عادت نے رسالوں، اخباروں اور کتابوں کی مانگ گھٹا دی ہے۔ انٹرنیٹ دنیا بھر کا علم انگلی کی ایک کلک سے آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے اور کمپیوٹر، لیپ ٹاپ یا موبائل کے اسکرین پر تازہ ترین خبریں 'زندہ و رنگین' زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ اس نے اخباروں کی تعداد اشاعت گرا دی ہے۔ روزناموں میں ایڈیٹروں کے اداریے اور پسندیدہ کالم نگاروں کی تحریریں جو کبھی پرنٹ میڈیا میں خاص کشش کا سامان ہوا کرتی تھیں انھیں پڑھنے کی بے چینی بھی کم ہوگئی ہے۔

اسی طرح مکتوب نگاری کا فن زوال آمادہ ہے۔ بلکہ قریب المرگ ہے۔ ایس ایم ایس، فیس بک پر آپ کے اچھے سے اچھے ٹیکسٹ یا مضمون یا غزل کے جواب میں بس ایک بٹن دبا کر بیشتر ناظرین ایک تاثراتی ڈیزائن یا خاکہ جسے Emoticon یا ایموجی کہا جاتا ہے ردِّعمل کے طور پر روانہ کر دیتے ہیں جس سے میرے جیسے کسی پرانے اہل قلم کی تشفی تو نہیں ہوتی۔ سب جانتے ہیں خط نگاری ایک اہم صنف ادب تھی جس نے اب دم توڑ دیا ہے اور غالب کے خطوط، مولانا آزاد کے خطوط' نہرو کے خطوط، صفیہ اختر کے خطوط اور خطوط شبلی کے پیمانے کی چیزیں اب دائرہ خیال میں بھی نہیں آئیں گی۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے زمانے میں ایسے ادب کی پیداوار پر انسانی دماغوں نے خود روک لگا دی ہے۔ ہمارے سامنے اب مواد نگار Content writer اور کاپی رائٹر ہیں جو کم لکھتے ہیں اور صرف پیسہ کمانے کے لیے لکھتے یا لکھنا چاہتے ہیں۔

پڑھنے اور لکھنے کا مستقبل ڈیجیٹل عہد میں

سیکھنے کا زمانہ ہے۔ نوجوان اب ان مسائل کی تحقیق اور شناخت کے لیے ڈیجیٹل آلات استعمال کر رہے ہیں جن کا تعلق ان کے تصرفِ وقت کے ساتھ ہے۔ اوک لینڈ کے طالب علموں نے West Side Stories نام کا ایک ایپ 'جینٹر یفکیشن' اشراف داری سے وابستہ کہانی گوئی کے فن سے متعلق تیار کیا ہے۔ شاید اپنی کچھ خوش وقتی کے لیے ان طلبا کے دماغ میں یہ خیال آیا ہو۔ پڑھنے لکھنے کے عمل کو اپنے اپنے مقاصد کے تحت نئی سمتیں دینے کے لیے دنیا میں طرح طرح کے ڈیجیٹل پروگرام تیار کیے جا رہے ہیں۔

انٹرنیٹ دنیا بھر کا علم انگلی کی ایک کلک سے آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے اور کمپیوٹر، لیپ ٹاپ یا موبائل کے اسکرین پر تازہ ترین خبریں' زندہ و رنگین' زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بناکر پیش کر دیتا ہے. اس نے اخباروں کی تعداد اشاعت گرادی ہے. روزناموں میں ایڈیٹروں کے اداریے اور پسندیدہ کالم نگاروں کی تحریریں جوکبھی پرنٹ میڈیا میں خاص کشش کا سامان ہوا کرتی تھیں انہیں پڑھنے کی بے چینی بھی کم ہوگئی ہے.

جب تک لکھنا اور پڑھنا روایتی اصولوں کے تحت رہا تعلیم کے اخلاقی اصول اور ضابطے از خود محفوظ رہے۔ خاندان کا ایک فرد بچپن سے نوجوانی اور نوجوانی سے جوانی کی دہلیز میں قدم رکھ کر گھر اور اسکول یا گھر اور کالج کی تعلیم کی جس روش کا پابند ہوتا تھا اس میں پڑھائی اور لکھائی کا اخلاقی چلن بھی فطری طور پر جاری رہتا تھا جس میں طالب علم اور گارجین یا طالب علم اور استاد کی صدیوں سے چلی آ رہی ایک اخلاقی و ذہنی روش برقرار رہنے کا تہذیبی عمل یقینی ہوا کرتا تھا۔ ڈیجیٹل دور میں طالب علم اگرچہ سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل طرز تعلیم کی فراہم کردہ سہولتوں

سے فیض یاب ہو رہا ہے لیکن اس سسٹم میں کمپیوٹر اور سافٹ ویئر پروگرام اس کے ہاتھ میں رہ کر اس کے اپنے اختیار میں آگئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی تعلیم بھی تکنیک اور سافٹ ویئر پروگراموں کی یکجائی کے بغیر آگے نہیں بڑھتی۔ لکھنے پڑھنے کا سارا عمل ایک میز اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے علم اور تکنیک کی باہمی تکمیل Co-ordination کا عمل بن گیا ہے جس میں کسی دوسرے فرد کا دخل، چاہے وہ کوئی بھی ہو، ممکن نہیں رہ جاتا۔ ڈیجیٹل تعلیم کا ماہر ایڈم بینکس Adam Banks اپنا نظریہ پیش کرتا ہے کہ لکھائی کا مستقبل یہاں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ نہ ہم صحیح لوگوں کی سنتے ہیں اور نہ صحیح لوگوں سے سیکھتے ہیں۔ بینکس لکھنے کے عمل کو ذہنی تجسس، پیشہ ورانہ کامیابی اور جمہوری زندگی کے لیے سب سے اہم قرار دیتا ہے حتیٰ کہ لٹریسی کے ان طریقوں کو بھی اہمیت دینے پر آمادہ ہے جو حاشیہ پر ہیں۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ڈیجیٹل تعلیم کے علما ایک بحث کے آخر میں ایک سوال کرتے ہیں کہ مستقبل میں پڑھنے اور لکھنے کے لیے ہم ٹیچروں کو کیسی تعلیم دیں؟۔ اسکالروں کے ایک مباحثہ میں ایک طالب علم Cherise Mc Bride کہتی ہے ''اس سوال کا ایک جواب یہ ہے کہ ہم لٹریسی کو حروف تہجی یعنی Alphabets کے شعور کے ماسوا بھی کچھ سمجھیں۔ اس میں شبیہات (امیجز) کو پڑھنے اور ڈیزائن کے عناصر کو سمجھنے کی اہلیت بھی شامل ہو اور آج کے طلبا کے ثقافتی اور لسانی اختلاف (diversity) اور تکثیر کا بھی لحاظ کرنا ہوگا۔ ٹیکنولوجی اب اس تعلیم کا ہی حصہ ہے۔ اس طرح تمام لٹریسیز کثیر یعنی ملٹی اور طاقتور اور لوچدار بن جاتی ہیں''۔

میڈیا لٹریسی کی تعلیم کا آغاز برطانیہ اور امریکہ میں 1930 کے بعد جنگی پروپگنڈے کے نتیجے میں ہوا اور 1960 کے بعد اشتہار بازی کے چلن کے ساتھ اس کا فروغ شروع ہوا۔ تعلیم دینے والوں نے لوگوں میں میڈیا لٹریسی کو عام کرنے کے لیے میڈیا سے موصولہ پیغامات کا احتساب کرنا سکھایا تاکہ وہ ڈیجیٹل اور میڈیا مواد کی جانبداری اور غیر جانبداری کے بارے میں آزادانہ فیصلہ کرسکیں۔

ڈیجیٹل تعلیم یافتہ فرد آگاہی کو عام کر کے سماج کا ایک ذمے دار رکن بنتا ہے کیونکہ اپنی آگاہی اور علم کی مدد سے وہ گھر اور کام کی جگہ سے ہی کئی مسائل کا حل پیش کرنے کا اہل ہوجاتا ہے۔ ڈیجیٹل تعلیم صرف پڑھنے اور لکھنے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ میڈیا کی دیگر قوتوں اور وسائل کا علم اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے جن میں ریکارڈنگ اور ویڈیو کو اپ لوڈ کرنا شامل ہے۔

ڈیجیٹل تعلیم یافتہ فرد آگاہی کو عام کر کے سماج کا ایک ذمے دار رکن بنتا ہے کیونکہ اپنی آگاہی اور علم کی مدد سے وہ گھر اور کام کی جگہ سے ہی کئی مسائل کا حل پیش کرنے کا اہل ہوجاتاہے۔ ڈیجیٹل تعلیم صرف پڑھنے اور لکھنے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ میڈیا کی دیگر قوتوں اور وسائل کا علم اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے جن میں ریکارڈنگ اور ویڈیو کو اپ لوڈ کرنا شامل ہے۔

ڈیجیٹل علم کی غیر مساوی تقسیم

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈیجیٹل لٹریسی سماج میں سب لوگوں اور سب جگہوں میں مساوی طور پر پہنچ پا رہی ہے۔ یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ عام طور پر خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں بڑی عمر کے لوگ نوعمر اور نوجوانوں سے بہت کم ڈیجیٹل لٹریسی کے علم اور مشق میں مصروف ہیں اور یہ فطری بات ہے۔ ڈیجیٹل لٹریسی کی نابرابر تقسیم کی ایک وجہ متمول اور غریب طبقوں میں سماج کا بٹا ہونا ہے۔ امیر طبقے کے لوگ ڈیجیٹل ٹیکنولوجی کی علمی تربیت اور ٹکنولوجی کے سسٹم کے حصول کے اخراجات برداشت کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ غریب طبقہ ان وسائل کے لیے مطلوبہ اخراجات یا سرمایہ کی استعداد نہیں رکھتا۔ اسی طرح شہروں اور دیہاتوں میں ڈیجیٹل لٹریسی مساوی طور پر نہیں پہنچ پاتی۔ طالب علموں میں بھی مالی وسائل کی نابرابر فراہمی ڈیجیٹل لٹریسی کی غیر مساوی تقسیم کی ذمے دار ٹھہرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ڈیجیٹل لٹریسی کی تکنیکی سہولیات کسی کو صرف کلاس کے اندر مل پاتی ہے اور کوئی وسائل کی فراوانی کی بدولت اسکول سے باہر بھی اچھی سہولت حاصل کرلیتا ہے۔ یہ سوال ہمارے ملک کے غیر مساوی معاشی ذرائع پر منحصر طالب علموں کو ضرور متاثر کریں گے کیونکہ اسکولوں اور اداروں میں طریقہ تعلیم ڈیجیٹل ہوتا جا رہا ہے اور کورونا کی وبا نے درسی اور ملازمتی سیکٹروں کو اچانک نئی پریشانیوں میں ڈال دیا ہے جس سے ذہنی اور اعصابی نظام تک پر ناخوش گوار اثرات متوقع ہیں۔

ڈیجیٹل نگارش کے عمل میں کمپوزر کی حاضر دماغی ارتباط (Linking) اور حذف (Omission) سے بچانے میں بہت معاون ثابت ہوگی۔ کمپوزر کا دماغ بیدار رہے تو وہ معروضیت (Objectivity) کی ذمے داری پر مصنف سے سوال کرسکتا ہے' اس کی کسی شعوری یا غیر شعوری لغزش پر اسے متوجہ کرسکتا ہے۔

دیانتدارانہ ڈیجیٹل لٹریسی لوگوں کو ای میل فراڈ سے بچانے کے لیے آن لائن سہولت اور تصویری استحصال (Visual manipulation) سے بچانے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

سوشل میڈیا کے فروغ سے ڈیجیٹل تعلیم یافتہ افراد اپنی آواز آن لائن بلند کرنے کی پوزیشن میں آگئے ہیں۔ فیس بک اور ٹویٹر کے علاوہ نجی ویب سائٹس اور بلاگز (Blogs) کے ذریعے وہ ایک نئی قسم کی صحافت کرنے لگے ہیں۔ یہ اپنے کمیونٹی قارئین کے مابین گلوبل مکالمہ قائم کرسکتے ہیں۔

میڈیا اور ذمہ داری کے امور

برقی میڈیا جس میں انٹرنیٹ، ٹویٹ، انسٹاگرام، فیس بک کے علاوہ فحش تحریریں اور تصویریں اور ویڈیو بھیجنے والے ذرائع بشمول واٹس ایپ اور مختلف پروگرام شامل ہیں کے ذریعے عریانیت اور سنسنی خیز مواد کو پھیلا کر جنس و جرائم کے ہیجان کو عام کرنے کا رجحان بہت خراب ہے۔ یہ برائی جدید خبری وسائل کی آسانیوں کی پیدا کردہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خاموش طور پر اندر اندر جدید سماجی میڈیا اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور کئی لوگوں خصوصاً نوجوانوں کو اخلاق سوز بری عادتوں میں مبتلا کر کے انھیں طرح طرح کی لذتوں کا اسیر کردیتا ہے۔ جو چیز روایتی خواندگی کے دور میں بہت محدود اور مخفی رہا کرتی تھی وہ اب ڈیجیٹل لٹریسی کے وسائل آسانی سے کسی کو بھی فراہم کردیتے ہیں۔ یہ تو ایک جانب اشارہ تھا لیکن اب صحیح معنوں میں جسے میڈیا کہا جاتا ہے اور جو سماج میں سیاسی اُتھل پتھل کا سبب بنتا ہے اس کے کردار کا جائزہ لینا چاہیے۔

وہ وقت آگیا ہے جب ہندوستانی میڈیا کو اپنا احتساب خود شروع کردینا چاہیے۔ یہ آپ گمراہ ہوتا ہے اور سماج کو گمراہ کرتا ہے۔ دستور ہند کی طرف سے تقریر و تحریر کی آزادی شہریوں کو حاصل ہے لیکن فساد پیدا کرنے والے لوگ اور ادارے اور غلط رو میڈیا اس آزادی کا بے جا استعمال کرتے ہیں۔ میڈیا کا اصل کام ہے لوگوں کو سچی اور معروضی خبریں پہنچانا جس کی بدولت وہ کسی معاملے میں عقلی رائے قائم کرسکیں جو جمہوری قدروں کی افزائش کے لیے ضروری ہے۔

■

Fe Seen Ejaz
Editor, 'Mahnama Insha'
25-B, Zakaria Street, Kolkata - 700073
Mob.: 9830483810
Email: inshapubications@yahoo.co.in

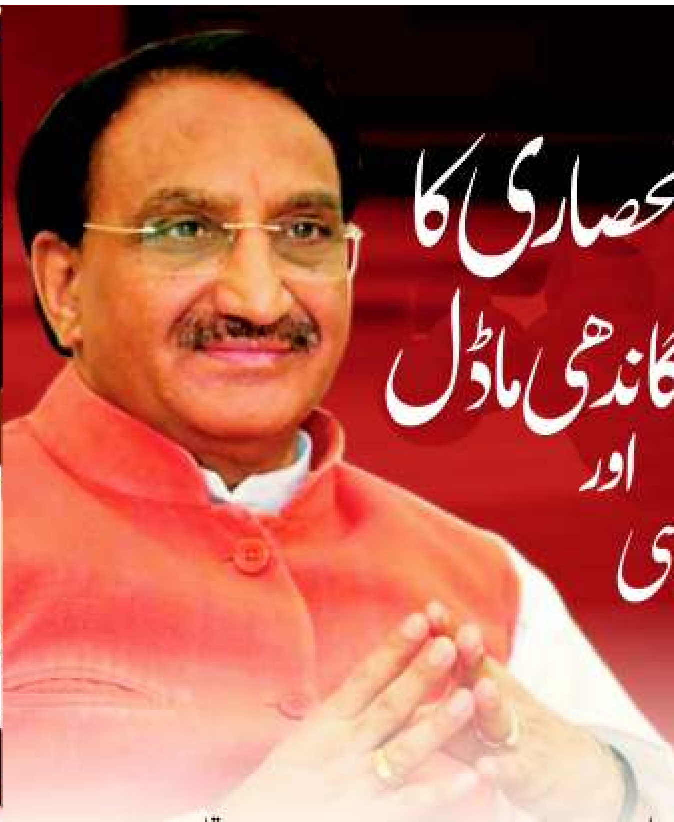

خود انحصاری کا مہاتما گاندھی ماڈل اور نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020

وجیتا پرویز

خود انحصاری کا تصور کوئی نیا منطقی نظریہ نہیں ہے جس سے ہم واقف نہ ہوں۔ ہم اپنی صلاحیتوں کو پہچان کر اس کے مطابق اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنا انتظام خود کریں، ہم کسی دوسرے کی مدد کے لیے محتاج نہ ہوں عام طور پر اسی کو خود انحصاری سمجھا جاتا ہے۔ خود انحصاری کی بات کریں اور گاندھی جی کا ذکر نہ ہو یہ ممکن نہیں ہے۔ گاندھی جی نے یہ منصوبہ آزادی سے پہلے ہی تیار کیا تھا اور اپنی کتاب "India of My Dream" میں اس کو کس طرح عملی جامہ پہنانا ہے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی۔ آزادی کے بعد لگ بھگ تمام تر حکومت نے اپنے اپنے طریقے سے ملک کو ترقی کی راہ میں گامزن کرنے کی کوششیں کیں۔ اسی سلسلے کے تحت وقتاً فوقتاً کئی تعلیمی پالیسی وجود میں آئی۔ مثلاً 1966 کی تعلیمی پالیسی کا نفاذ جو ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری کی سربراہی میں منعقد ہوا، 1986 کی نئی تعلیمی پالیسی (NEP1986) اور موجودہ دور 2020 میں بھی حکومتِ ہند خود انحصاری کو فروغ دینے کا منصوبہ تیار کرتے ہوئے اسے عمل پیرا کرنے کی کوششوں پر زور دے رہی ہے۔ لہٰذا اسی زمرے میں حکومت ہند نے خود انحصار ہندوستان یا 'آتم نربھر بھارت' کا نعرہ دیتے ہوئے قومی تعلیمی پالیسی 2020 (National Education Policy, 2020) کی تشکیل کی ہے۔ اس مضمون میں گاندھی جی کے خود انحصاری کے طریقہ کار اور قومی تعلیمی پالیسی۔2020 کے درمیان یکسانیت اور مماثل نکات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ بھی دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے سبھی نکات اور سفارشات پر عمل ہوتا ہے اور انھیں نافذ کر دیا جائے تو اس سے گاندھی جی کے تصور کو عملی جامہ پہنانے میں کتنی آسانی ہوگی۔

مساوات اور شمولیت:

"سوراج سے میرا مفہوم ہے ہندوستان کی حکومت، لوگوں کی رضامندی سے اس بات کا پتہ لگائے کہ بالغ آبادی کی سب سے بڑی تعداد، مرد ہوں یا خواتین آبائی پیدا ہونے والے یا رہائش، جنھوں نے دستی مزدوری کے ذریعے ریاست کی خدمت میں حصہ لیا ہے اور جنھوں نے اپنا نام رائے دہندگان کے طور پر اندراج کروانے میں پریشانی اٹھائی ہے۔ اصلی سوراج چند لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت رہنے سے نہیں بلکہ تمام لوگوں کو اس طرح کی حکومت کے مخالف رہنے سے آئے گی، دوسرے لفظوں میں، سوراج حاصل کرنے کے لیے عوام کو اس بابت تعلیم دینا ضروری ہے کہ جس سے وہ حکومت کو باقاعدگی سے اقتدار کرنا سیکھ جائیں۔"

(بحوالہ انڈیا آف مائی ڈریم، از ایم کے گاندھی، ص 7)

پورنا سوراج یا مکمل خود اختیاری کے تصور کو حقیقی قالب میں ڈھالنے کے لیے گاندھی جی نے خود انحصار اور دیہی علاقوں کے لوگوں کو خود کفیل ہونے کے لیے ایک مقصد ان کے سامنے رکھا۔ سماج کی سب سے چھوٹی اکائی فرد سے اپنی بات شروع کرتے ہیں کہ ایک فرد، ایک گاؤں اور ایک ملک اس وقت تک سوراج حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ خود کفیل یا خود انحصار نہ ہو جائے۔ انھوں نے اسی سلسلے کے تحت ایسے تعلیمی نظام کی سفارش کی جس میں تمام مذاہب، ذات، غریب امیر، ہر طبقے کے لوگوں کو تعلیم کا حق حاصل ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تعلیم کے ذریعے انھیں بااختیار بنانا بھی چاہتے تھے۔ وہ ملک کی اصل دولت خزانوں کے بجائے پرائمری اسکول کے چھوٹے بچّوں کو بتاتے تھے اور ان کی تعلیم کو ضروری قرار دیتے تھے۔

اس اعتبار سے نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 (NEP-2020) نے بھی اس بات پر دستاویز کے شروعات میں ہی توجہ دی ہے کہ تعلیم گاہوں سے ترک تعلیم (Dropout) کی شرح کو کم کیا جائے گا اور ہمہ گیر رسائی (Universal Access to Education For All) سے تمام لوگوں کی تعلیم کو ہر سطح پر یقینی بنایا جائے گا۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ تعلیمی درجے کے اضافے میں طلبا کا اندراج کم ہوتا جاتا ہے اور یہ اعداد و شمار اور بھی اہم ہو جاتے ہیں اگر ہم صرف طالبہ اور ایس سی/ایس ٹی (SC/ST) طبقے سے تعلق رکھنے والے طلبا کے اندراج کی شرح کو دیکھیں۔ مثلاً، NSSO کا سروے جو 2017-2018 کے اعداد و شمار کو پیش کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ 6-17 سال کے لگ بھگ 3 کروڑ 22 لاکھ بچے ابھی بھی اسکولی تعلیم سے محروم ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی میں 2030 تک سو فیصد مجموعی اندراج شرح (Gross Enrolment Ratio) یقینی بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ گاندھی جی نے اپنی زندگی کے چالیس سالہ تعلیمی میدان کے تجرباتی اور عملی کوششوں کے بعد نئے ہندوستان

نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے دو خاص پہل کی ہے جس میں ڈراپ آؤٹ یا ترک تعلیم کے مسئلے کو حل کرنے کی سفارش اور دوسری اسکول کے بنیادی ڈھانچے جو بوسیدہ اور خستہ حال ہیں ان کی درستگی اور ان میں معقول بندوبست میں شامل ہے۔ اسکولی نظام کی بہتری کے لیے اور بھی کئی نکات پالیسی کے دستاویز میں شامل ہیں۔ چونکہ اسکول سے ہی آگے بڑھ کر بچے اعلیٰ تعلیم کے لیے خود کو تیار کریں گے اس لیے اسکولی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ پالیسی میں دی گئی ہے۔

کی ضرورت کو ذہن میں رکھتے ہوئے تعلیمی منصوبہ تیار کیا تھا، جسے 'وردھا شکچھا یوجنا' یا 'بیسک راشٹریا شکچھا یوجنا' کے نام سے جانا جاتا ہے جس کی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں گاندھی جی نے مفت اور ضروری تعلیم دینے کی سفارش کی ہے۔ اس منصوبے کے مطابق سات سال سے چودہ برس تک کے تمام بچوں کو مفت اور ضروری تعلیم فراہم کی جائے گی۔ گاندھی جی کے مطابق ضروری تعلیم کا خواب تب تک حقیقت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا جب تک مفت تعلیم اور اس سے جڑے تمام لوازمات کا خیال نہ رکھا جائے بقول گاندھی جی:

"یہ خیال کرنا معقول نہیں ہے کہ والدین کی اکثریت یا تو احمق ہے یا بے دل کہ وہ اپنے بچے کی تعلیم کو نظر انداز کرتے ہیں جبکہ یہ انھیں بلا قیمت ان کے دروازے پر دستیاب ہے"

(بحوالہ ینگ انڈیا، از ایم کے گاندھی، 14-8-1924)

یقیناً تعلیم کی مفت فراہمی سے ترک تعلیم کرنے والوں کی تعداد میں کمی ہو سکتی ہے، پوری طرح سے نہیں تو ذیلی طور پر اس کا فرق پڑنے کے امکان ہیں۔ ایسے کئی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے طلبا اسکولی تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں یا ثانوی درجات تک آتے آتے اپنی تعلیم کو ترک کر دیتے ہیں۔ ان میں بچہ مزدوری، گھریلو کام کے لیے اسکولی طالبہ کا رکھنا، گھر میں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال خاص طور پر جب ماں باپ دونوں مزدوری کے لیے گئے ہوں، کچھ احتیاطی حفاظتی انتظامات میں کمی جو بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے والدین کی نفی، غلیظ اور غیر صحتمند بیت الخلا کی موجودگی یا محرومی بھی ایک وجہ بن سکتی ہے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے دستاویز نے پہلے سے موجود تمام پالیسیاں مثلاً نئی تعلیمی پالیسی 1986- اور پلان آف ایکشن (POA-1992) اور رائٹ ٹو ایجوکیشن ایکٹ۔ 2009 (RTE-2009) کے بقایا کاموں کو پورا کرتے ہوئے ان کے حلقے کو وسیع کرنے کی منشا رکھتی ہے اور یونیورسل ایلیمنٹری ایجوکیشن (UEE) کے حصول کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس منشا کے دائرے کو پورا کرنے کے اعتبار سے اسکولی تعلیمی نظام میں تبدیلی کی گئی ہے۔ اب تین سال سے لے کر اٹھارہ سال (3-18) تک کے بچوں کو اسکولی تعلیم کا حصہ بنایا گیا ہے جو پہلے چھ سال سے اٹھارہ سال (6-18) تک کے بچوں کو ہی شامل کرتا تھا۔ لہٰذا اب تین سے چھ سال کے بچوں کو آنگن باڑی اور بال باٹیکا وغیرہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا جائے گا۔ اب ابتدائی بچپن کی دیکھ بھال اور تعلیم (Early Chilldhood Care & Education) بھی اسکولی ڈھانچے میں شمار کیا جائے گا۔ جس کو نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے اس طرح سے تقسیم کیا ہے۔ (5+3+3+4) اس ڈھانچے کے تحت شروعات کے پانچ سال جس میں تین سے آٹھ سال تک کے بچے تعمیری سطح پر (Foundational Level) تعلیم حاصل کریں گے۔ اس کے بعد تین سال کا پیریڈ جسے ابتدائی سطح کہا گیا ہے اس میں آٹھ سال سے گیارہ سال کے بچوں کو تعلیم فراہم کی جائے گی۔ اگلی سطح جو تین سال کی ہوگی ثانوی درجات کی ہوگی جس میں گیارہ سے چودہ سال کے طلبا شامل رہیں گے۔ اسکولی ڈھانچے کی آخری سطح چار سال کی اعلیٰ ثانوی درجات کی ہوگی جس میں درجہ نو سے بارہ کے طلبا تعلیم حاصل کر پائیں گے۔

نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے دو خاص پہل کی ہے، جس میں ڈراپ آؤٹ یا ترک تعلیم کے مسئلے کو حل کرنے کی سفارش اور دوسری اسکول کے بنیادی ڈھانچے جو بوسیدہ اور خستہ حال ہیں ان کی درستگی اور ان میں معقول بندوبست میں شامل ہے۔ اسکولی نظام کی بہتری کے لیے اور بھی کئی نکات پالیسی کے دستاویز میں شامل ہیں۔ چونکہ اسکول سے ہی آگے بڑھ کر بچے اعلیٰ تعلیم کے لیے خود کو تیار کریں گے اس لیے اسکولی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ پالیسی میں دی گئی ہے۔ چند خاص نکات جو نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اٹھائے گئے ہیں، وہ نیچے درج ہیں۔

* سرگرمیوں (Activities) کے مختلف شعبوں میں طلبا کی بہتر شمولیت کے لیے اساتذہ کا تربیت یافتہ ہونا۔
* بچوں میں خاص طور پر دیہی علاقوں کی طالبات کے لیے اسکول کی آمد رفت میں سہولیات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ہاسٹل کی سہولیات کو مہیا کرانا۔
* کونسلرس اور سماجی کارکنان، سول سوسائٹی کے رضا کار اس بات کو یقینی بنانے میں اہم رول ادا کریں گے کہ بچے اسکول میں داخلہ بھی لیں گے اور روزانہ اسکول بھی آئیں گے۔
* اگر کسی طالب علم کی کسی وجہ سے اسکول کی تعلیم چھوٹ گئی ہو یا اس کا اندراج منسوخ کر دیا گیا ہو تو اسے دوبارہ آسانی سے داخل ہونے دیا جائے گا۔
* معاشرتی اور معاشی طور پر پسماندہ گروپ (Socially & Economically Disadvantaged Group) ایسے گروہ ہیں جو تاریخی طور پر نظر انداز کیے گئے طبقات میں شامل ہیں، ان کی ترقی کے اعتبار سے کچھ خاص اسکیمیں چلائی جائیں گی۔

اوپر درج اسکیموں کے فوائد جن طبقات کو حاصل ہوں گے ان میں سب سے اہم اس طرح ہیں۔ جیسے

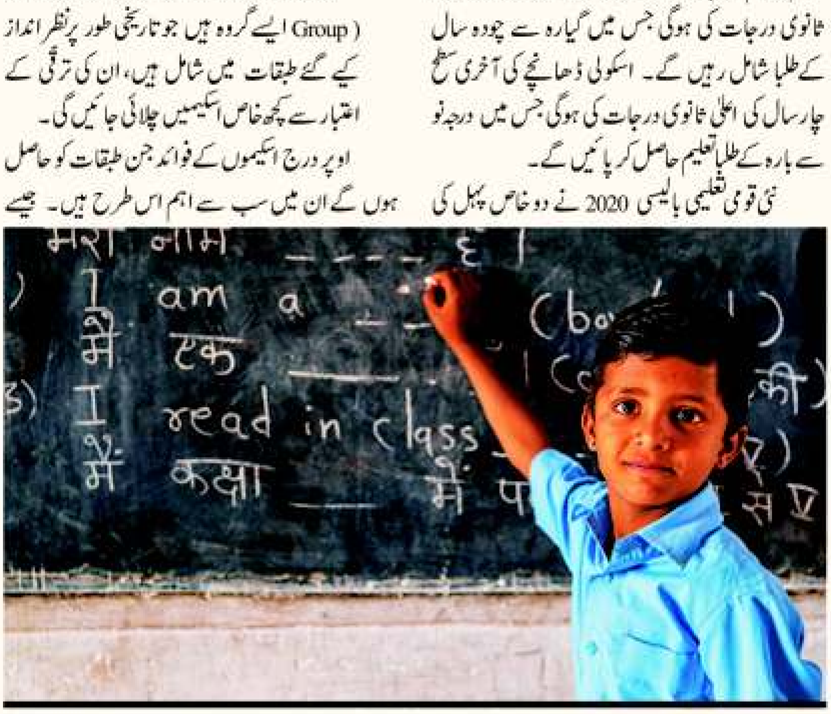

خواتین اور ہیجڑے، ایس سی، ایس ٹی، او بی سی اور اقلیتوں کے گروپ، دیہی بچے، معذور بچے اور ایسے پسماندگی کے شکار بچے جو تنازعہ اور جنگی علاقے میں اپنی زندگی بسر کرتے ہوں۔ ایسے سبھی بچوں کو تعلیم کا حق فراہم کرانا اور بامعنی تعلیم (Quality & Meaningful Education) جس کی بات نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں کی گئی ہے اس مقصد کے حصول کے اعتبار سے مختلف خصوصی تعلیمی خطے (Special Education Zones) کا انتخاب کیا جائے گا۔ جو ایسے علاقے ہوں گے جہاں معاشی اور معاشرتی طور پر پسماندہ گروہ کی زیادہ آبادی ہوگی اور انھیں علاقوں میں مختلف اسکیمیں اور پالیسیوں کو نافذ کرنے کی سرکاری کوشش بھی شامل رہے گی۔ مثال کے طور پر وہ امداد جو صنفی شمولیت (Gender-Inclusion Fund) کے مابین آتے ہیں جسے مرکزی حکومت کے ذریعے ریاستی حکومت کو حاصل ہوگا اور یہ فنڈ طالبات اور ایسے متعلم کو دیا جائے گا جو ٹرانس جینڈر صنف سے تعلق رکھتا ہو جس سے اس کو تعلیمی حصول میں مدد ملے گی۔ جیسے کہ صفائی ستھرائی اور بیت الخلاء کی فراہمی، ان کے لیے سائکل، شرائط کے ساتھ نقد کی منتقلی وغیرہ۔ خصوصی تعلیمی خطے (SEZs) کے مدِنظر وافر مقدار میں جواہر نو ودیے ودیالیہ اور کیندریہ ودیالیہ (JNV & KV) کھولے جائیں گے۔ شمولیت کے تصور کو پورا کرنے کے اعتبار سے معذور طبقے کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے ہیں۔ اسکولی تعلیم کی متبادل شکلوں میں جس میں مدرسہ وغیرہ آتے ہیں انھیں بھی تمام مضمون پڑھانے اور بہتر بنانے کی بات کی گئی ہے۔ وہاں بھی اب سائنس، سوشل سائنس، ریاضی، انگریزی اور ہندی جیسے مضامین اور زبانیں پڑھانے کے لیے مالی امداد دینے کی بات کہی گئی ہے۔

پیشہ ورانہ تعلیم پر نقطہ نظر:

پیشہ ورانہ تعلیم کے متعلق گاندھی جی کا نقطہ نظر بہت واضح تھا۔ وہ بیسک تعلیم کے مقام کو بہت اونچا مانتے تھے۔ ان کے مطابق کامیابی اور کامرانی کا دارومدار انسان کے ہاتھوں سے کیے گئے عمل پر منحصر ہے۔ ان کے مطابق سوچنے والا ہاتھ (Thinking Hand) ہی وہ اہم آلہ ہے جو زندگی کو ایک منزل کی طرف آگے بڑھنے کے لیے متحرک کرتا ہے۔ بیسک تعلیم گاندھی جی کے نزدیک صرف کتابی تعلیم نہیں بلکہ ہاتھ سے بنائی ہوئی اشیا یا کرافٹ ہے۔ گاندھی جی کا تجربہ سوچنے والے ہاتھوں سے یا ہاتھوں کی تعلیم پر انحصار کرتا ہے جو انسان کو خود انحصار بنانے میں مدد کرتا ہے۔ اس زمرے میں Handicraft کے کاروبار کو کافی فروغ حاصل ہے جس میں ان کا سودیسی تصور بھی شامل ہے۔ وہ مشینوں کے خلاف ہرگز نہیں تھے بلکہ اس کا تعلق وہ انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کو کم ہونا بتاتے ہیں، ان کے مطابق انسان مزدوری بچانے کی حرص اور زیادہ منافع کمانے کی وجہ سے مشین کا استعمال کرتا ہے۔ وہ چھوٹی صنعتوں کے فروغ اور خود انحصار کرنے والی معیشت پر زور دیتے تھے۔ ان کے نزدیک کھادی معاشی آزادی اور ملکی مساوات میں مدد کرتا ہے۔ اسی طرح دوسری صنعتوں اور اس سے متعلق دست کاری جیسے ہاتھوں سے تیل کی پیڑائی، صابن بنانا، جلد سازی، چمڑے کا کام، کپڑے کتائی، چھپائی، مٹی اور دیگر دست کاری کے کام سے روزگار کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ انھیں مزدوروں کے قدر اور ان کے اعزاز کا بہت خیال تھا۔ وہ ملک کی ترقی کا دارومدار انھیں کے دم سے سمجھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

''محنت کش کی مہارت اس کا سرمایہ ہے، جس طرح سرمایہ دار مزدوروں کے تعاون کے بغیر اپنے سرمائے کو نتیجہ خیز نہیں بنا سکتا، اسی طرح محنت کش بھی سرمایہ کے تعاون کے بغیر اپنی مزدوری کو نتیجہ خیز نہیں بنا سکتا اور، اگر مزدور اور سرمائے دار دونوں کے پاس ذہانت کا تحفہ یکساں طور پر موجود ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے ہاتھوں، ایک مناسب معاہدے کو محفوظ بنانے کی ان کی صلاحیت پر اعتماد ہوتا ہے تو، وہ ایک دوسرے میں برابر کے شریک کی حیثیت سے ایک عام کاروباری اقدام میں ایک دوسرے کا احترام اور تعریف کرتے ہیں۔''

(بحوالہ انڈیا آف مائی ڈریم، از ایم کے گاندھی، ص 51)

نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں مہارت کی ترقی کے پروگرام کو نصاب میں شامل رکھا گیا ہے۔ درجہ چھ سے درجہ آٹھ تک کے بچوں کو ایک ایسا کورس مکمل کرنا ہوگا جو مختلف انواع واقسام کی ہنرمندی اور دوسرے فنون سے منسلک ہوگا جس کی میعاد دس دنوں کی ہوگی۔ ان دس دنوں کے زمانے میں وہ لوگ اپنے اسکول بیگ کے بغیر (Bagless) کسی مقامی پیشہ ور ماہرین کے ساتھ انٹرنشپ کریں گے اور مقامی ضرورت کے اعتبار سے مختلف قسم کے مہارتی کاموں میں حصہ لیں گے۔ جیسے لکڑی کے کام، بجلی سے جڑے آلات اور اس کی مرمت

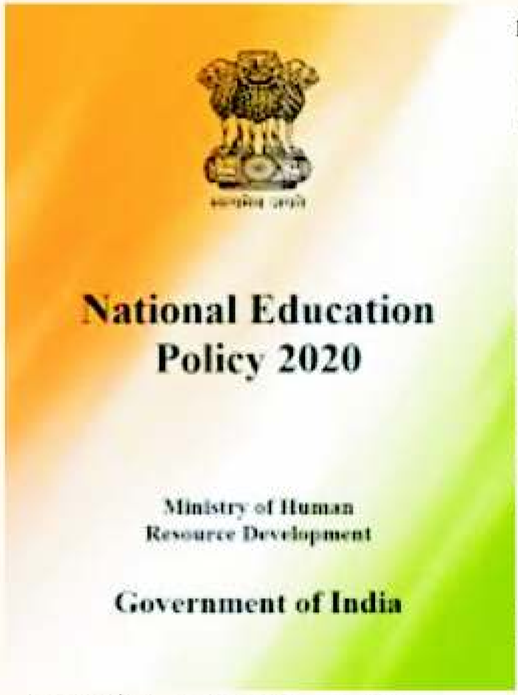

کا کام، مٹی سے مختلف اشیا کا بنانا، باغبانی، کاغذ کے کام، نقاشی اور بھی دیگر کئی ایسے فنون اور عمل ہیں جن کی بچے تربیت حاصل کریں گے۔ پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت کی اہمیت کو تمام پالیسیوں میں شامل کیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں اعلیٰ تعلیمی سطح پر بھی اسی طرح کی پیشہ ورانہ تعلیم کو ترجیح دی جا رہی ہے اور اس سے متعلق ڈگری، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ کورسیز چلائے جا رہے ہیں، جس کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم کی فراغت کے ساتھ ہی طلبا روزی روٹی سے جڑ سکیں اور انھیں روزگار فراہم ہو۔ پیشہ ورانہ تعلیم معاشرے کو جلد بااختیار بناتی ہے اور ان کی فلاح و بہبود کو یقینی بناتی ہے۔ غریب اور کمزور طبقے کے خواتین و حضرات جو اپنے بچوں کو بہت لمبے عرصے تک تعلیم کی فراہمی نہیں کرا سکتے ان کے لیے اس طرح کی چھوٹے مدت کے پیشہ ورانہ کورس جو بنیادی تعلیم کے بعد ان میں داخلہ دلا کر جلد اپنی اولادوں کو مستحکم بنا کر انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد کر سکتے ہیں اور یہ خود انحصاری کا بہترین نمونہ ہے۔

مادری زبان کی اہمیت اور اپنی ثقافت کا علم:

گاندھی جی نے ہمیشہ اس بات کی مخالفت کی کہ تعلیم کی زبان کوئی غیر ملکی زبان ہو، انھوں نے ہمیشہ اس کی سفارش کی کہ طلبا کو ہمیشہ مادری زبان میں ہی تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ ہندوستان مختلف زبانوں کا گہوارہ ہے اور لوگ کئی طرح کی بولیاں بھی بولتے ہیں۔ مہاتما گاندھی

یہاں کی مشترکہ زبان کو ترقی کی راہیں ہموار کرنے والی زبان مانتے تھے۔ مادری زبان سے انسان سماجی طور سے بہتر جڑتا ہے اور زیادہ بہتر سیکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''غیر ملکی زبان ذریعۂ تعلیم دماغی دھند کا باعث بنا ہوا ہے، اس کی وجہ سے ہمارے بچوں کے ذہن پر بیجا تناؤ ڈالا ہوا ہے۔ انھیں گھماؤدار اور نقال بنایا ہوا ہے، اصل کام اور فکر کے لیے ان کو نا اہل کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی تعلیمی لیاقت کے لیے کنبہ یا عوام میں معذور کر دیا گیا ہے۔''

(بحوالہ ٹوواڈس نیو ایجوکیشن، از ایم کے گاندھی، ص 54)

گاندھی جی نے اس بات کو مانا کہ ایسی تعلیم جو غیر ملکی زبان کی مدد سے فراہم کی جائے طلبا میں تنقیدی سوچ کو پیدا ہونے سے روکتی ہے، اور طلبا اپنے گرد و پیش کے عام لوگوں سے نہیں جڑ پاتے ہیں۔ ان کے مطابق بچے مشکل تصورات کو با آسانی عام بول چال کی زبان کے ذریعے سیکھ پاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے خیالات اور علم سے عام لوگوں کی زندگیوں میں ترقی لا سکیں گے۔ گاندھی جی غیر ملکی زبانوں میں انگریزی یا کوئی بھی دوسری غیر ملکی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کو ہندوستانی ثقافت، تہذیب اور ہندوستانی زبان کی موت سمجھتے تھے۔ انھوں نے دنیا کی دوسری زبانوں کے سیکھنے کا ذریعہ بھی اپنی مادری زبان کو بنانے کی سفارش کی ہے۔ ترجمے کے عمل کو انھوں نے بہتر بتایا ہے جس سے دنیا بھر کی چیزوں کے سیکھنے میں مدد ملتی ہے اور یہ بہتر معیشت کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ ایک اچھا کاروبار ہوگا کہ طلبا کی ایک ایسی جماعت کو تیار کیا جائے، جن کا کام دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود سب سے اعلیٰ علم کا انتخاب کرنا ہو اور اس کا مقامی زبان میں ترجمہ کرنا ہو۔''

(بحوالہ ٹوواڈس نیو ایجوکیشن، از ایم کے گاندھی، ص 58)

مہاتما گاندھی نے مقامی زبان کے فروغ کے لیے اس بات کی سفارش کی کہ کچہری کی قانونی بھاشا بھی علاقائی زبان میں ہو، خصوصاً جس علاقے میں وہ کچہری واقع ہو۔ اس کے علاوہ سرکاری دفاتر میں بھی جس علاقے یا خطے میں وہ قائم ہو وہاں اسی علاقے کی بولی جانے والی زبان رائج ہو۔ ان کے مطابق ایک آزاد ملک میں سبھی کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ نہ کہ مادری زبان بلکہ اپنی دلچسپی اور پسند کے مطابق مضامین کو اپنی مادری زبان میں پڑھنے کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے زبان کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے گھریلو زبان یا مادری زبان کو وسیلہ تعلیم کے لیے بہترین ذریعہ بتایا ہے کیوں کہ اس میں طلبا تعلیمی تصورات کو با آسانی اور جلد سمجھ پاتے ہیں لہٰذا درجہ پانچ تک طلبا کو ذریعہ ہدایت مادری زبان رکھنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے سائنس، حساب اور سوشل سائنس اور دیگر نصابی مضامین کی درسی کتابیں مقامی زبان میں تیار کرنے کی کاوشیں شروع کرنے کا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے بلکہ کچھ ریاستیں پہل کرتے ہوئے کام شروع کر چکی ہیں۔ اساتذہ کی بھی اسی منصوبے کے مطابق ان کی تربیت کی جائے گی اور اسکول کی زبان اور گھر کی زبان کے درمیان ان کو ایک پل تعمیر کرنا ہوگا جو دونوں کو جوڑ کر رکھے گا۔

نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے کثیر لسانی (Multi Lingualism) کو بڑھاوا دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس دستاویز میں تحقیق کے حوالے سے اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ دو سے آٹھ سال تک کے بچے ایک سے زیادہ زبانیں ایک ساتھ سیکھ سکتے ہیں اور اس سے ان کی وقوفی مہارتوں (Cognitive skills) میں اضافہ ہوتا ہے، لہٰذا اس پالیسی کے تحت بنیادی سطح سے ہی طلبا کو دیگر زبانیں بھی سکھائی جائیں گی حالانکہ خاص توجہ مادری زبان پر ہی رہے گی۔ ملک کی ترقی طلبا کی ذہنی نشو و نما اور مقامی زبانوں کی بقا کے مدنظر سہ لسانی فارمولہ (Three Language Formula) کی پیروی کرتے رہنے کی بات نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں کہی گئی ہے۔ سہ لسانی فارمولے کا ذکر کوٹھاری کمیشن (Kothari Commission 1964-1966) میں کیا گیا تھا اور اس میں مادری زبان کے ساتھ ایک مقبول ہندوستانی زبان اور ایک مقبول غیر ملکی زبان کو پڑھنا لازمی تھا۔

> **نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے ہندوستانی زبانوں کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ ہندوستانی زبانیں بہت اہمیت رکھتی ہیں اور اس کی مقبولیت اور اس کی ثقافتی اہمیت بیش قیمتی ہے اور یہ قومی اتفاق و اتحاد میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ لہٰذا نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں قومی اتحاد کو ایک مہم کے تحت۔ ''ایک بھارت شریسٹھ بھارت'' میں درجہ چھ سے درجہ آٹھ تک (6-8) کے بچوں کو ایک مقابلے میں حصہ لینے کی بات کہی گئی ہے۔ اس مقابلے کے تحت طلبا ہندوستان کی خاص زبانوں میں یکسانیت اور تفریق کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔**

نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے ہندوستانی زبانوں کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ ہندوستانی زبانیں بہت اہمیت رکھتی ہیں اور اس کی مقبولیت اور اس کی ثقافتی اہمیت بیش قیمتی ہے اور یہ قومی اتفاق و اتحاد میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ لہٰذا نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں قومی اتحاد کو ایک مہم کے تحت ''ایک بھارت شریسٹھ بھارت'' میں درجہ چھ سے درجہ آٹھ تک (6-8) کے بچوں کو ایک مقابلے میں حصہ لینے کی بات کہی گئی ہے، اس مقابلے کے تحت طلبا ہندوستان کی خاص زبانوں میں یکسانیت اور تفریق کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی سبھی زبانوں کے لسانی اور قواعد کے ڈھانچے کو سمجھتے ہوئے اس کی بنیادی اور ابتدائی شکلوں کے بارے میں جانیں گے۔ وہ سنسکرت اور دوسری کلاسیکل زبانوں کے بارے میں جانیں گے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے سنسکرت زبان کو علم کا خزانہ تسلیم کیا ہے، کیوں کہ اس زبان میں قدیم ہندوستانی زبانوں کی تاریخ اور ثقافت کا سرچشمہ موجود ہے۔ فلسفہ، ریاضی، سیاست، طب اور دیگر تمام ایسے علم کے خزانے اس میں موجود ہیں جو قدیم ہندوستانی تعلیم کی وراثت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ لہٰذا سنسکرت زبان کے ذریعے ہندوستان کی موجودہ بھرپور ثقافتی تاریخ کو گلے لگانے کی بات کی گئی ہے اور اسی کے ذریعے ملک کو قابل بقا ترقی اور خود اختیاری اور خود انحصاری کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کی سفارش اس دستاویز میں کی گئی ہے۔ یہ پالیسی ایک انتہائی بلند پایہ اور بلند نظر دستاویز ہے اور اس کو نافذ کرنے کے لیے مستحکم مزاجی اور صاف دلی کی ضرورت درپیش ہے۔ گاندھی جی کے خواب کو مکمل کرنے کے لیے اور خود انحصار ہندوستان کے جذبے کو برقرار رکھنے کے لیے پختہ ارادے اور ایمان داری کو یقینی بنانا از حد ضروری ہے۔

حواشی

1. 'قومی تعلیمی پالیسی 2020'، منسٹری آف ایجوکیشن، گورنمنٹ آف انڈیا۔
2. گاندھی ایم کے (1947) 'انڈیا آف مائی ڈریمس'، نوجیون ٹرسٹ، احمد آباد، انڈیا۔
3. کمارپا بی (1953) 'ٹوواڈس نیو ایجوکیشن'، نوجیون پبلشنگ ہاؤس، احمد آباد، انڈیا۔

■

Vijayata Perwez
Assistant Professor
Maulana Azad National Urdu University
College of Teaching Education,
Sambhal- 244302 Uttar Pradesh
Mob.: 8979240096

محمد کلیم ضیا

ادب میں اخلاقی اقدار کا تقاضا

اخلاقیات دراصل انسانی معاملات کا دوسرا نام ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان سے کس طرح پیش آتا ہے، اسی کا نام اخلاق ہے۔ اخلاق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ جن میں سچائی، ہمدردی، رواداری، محبت، ایمانداری، صفائی اور قدردانی وغیرہ شامل ہیں بلکہ دنیا میں جو بھی معروف (اچھائی) ہے، جو بھی انسانی بھلائی اور نیکی کا کام ہے وہ سب اچھے اخلاق کی فہرست میں آتے ہیں۔ غصہ، تادیب وغیرہ کو بھی بُرائی کے خلاف استعمال میں اچھے اخلاق میں شامل کیا جاتا ہے۔ اور دوّم یہ کہ جھوٹ، لالچ، حسد، بغض، چغلی، غیبت، بے ایمانی، گندگی، ناپاکی، کسی کی ہنسی اڑانا، کسی کی عیب جوئی کرنا، بُرے الفاظ یا نام سے پکارنا، کسی کی ٹوہ میں رہنا وغیرہ اور غصہ اور اذیت رسانی وغیرہ برے اخلاق کی فہرست میں آتے ہیں۔ یعنی ہر وہ کام جو انسانی معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے وہ منکرات میں یعنی برے اخلاق میں شامل ہوتے ہیں۔

اسی طرح اخلاق کے تعلق سے یہ بات بھی ہے کہ یہ ہر زمانے میں غیر متبدل رہے ہیں۔ جس طرح ہر زمانے میں زہر زہر ہی رہا ہے تریاق نہیں ہوا اسی طرح ہر اخلاقی صفت اپنی اصلی ہیئت میں رہی ہے۔ اس میں کبھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ سچ کے فائدے پہلے بھی وہی تھے، جو آج ہیں۔ اچھائیاں اب سے ہزار سال پہلے جو تھیں، آج بھی وہی ہیں۔ جھوٹ کے نقصانات آج بھی وہی ہیں جو اب سے ہزاروں برس پہلے تھے۔ ہاں تبدیلی واقع ہوتی ہے تو وہ انسان کے اپنے نقطۂ نظر میں۔ ایک سماج نے اگر برائیوں کو اچھائی سمجھ کر اختیار کر ہی لیا ہے تو وہ ہرگز اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔ برائی کا نقصان جلد یا دیر سے اسے اٹھانا ہی ہوگا۔ آج کے دور کا ایک مقولہ ہے کہ ''جھوٹ اتنی بار بولو کہ سچ لگنے لگے'' بہت سے لوگوں نے اور جماعتوں نے اس کو اپنایا، سچائی پر جھوٹ کی ملمع کاری کی، بار بار جھوٹ بولا گیا اور بے انتہا بولا گیا مگر جب

جھوٹ کے نقصانات آج بھی وھی ھیں جو اب سے ھزاروں برس پھلے تھے۔ھاں تبدیلی واقع ھوتی ھے تو وہ انسان کے اپنے نقطۂ نظر میں۔ایک سماج نے اگر برائیوں کو اچھائی سمجھ کر اختیار کرھی لیا ھے تو وہ ھر گز اس سے فائدہ نھیں اٹھاسکے گا۔برائی کا نقصان جلد یا دیر سے اسے اٹھانا ھی ھوگا۔آج کے دور کا ایک مقولہ ھے کہ ''جھوٹ اتنی بار بولو کہ سچ لگنے لگے'' بھت سے لوگوں نے اورجماعتوں نے اس کو اپنایا۔سچائی پر جھوٹ کی ملمع کاری کی۔بار بار جھوٹ بولا گیا اور بے انتھا بولا گیا مگر جب اس کے نقصانات ظاھر ھونے لگے تو جھوٹ سے باز کیا آتے بلکہ مزید جھوٹ بول کر اپنے کھے کو درست کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔مگر کیا جھوٹ سچ بن گیا؟

اس کے نقصانات ظاہر ہونے لگے تو جھوٹ سے باز کیا آتے بلکہ مزید جھوٹ بول کر اپنے کہے کو درست کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔مگر کیا جھوٹ سچ بن گیا؟

بہر حال اخلاقیات کا معاملہ انسان سے ہے اور انسانی زندگی سے وابستہ ہے اور جب تک دنیا میں انسان موجود ہے اخلاقیات پر باتیں ہوتی رہیں گی۔انسان چونکہ کمزور اور بھلکڑ واقع ہوا ہے،(یادرکھیے کہ بھولنا بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔اگر انسان بھولنے کے عمل سے نہ گزرے تو اس کا زندہ رہنا محال ہو جائے بلکہ نوبت یہاں تک آسکتی ہے کہ سب کچھ یاد رکھنے کی وجہ سے وہ خودکشی کرنے پر بھی مجبور ہو سکتا ہے)۔خیر انسان اخلاق کی اچھی قدروں سے بار بار منحرف ہوتا رہتا ہے اور برائی کی طرف اس کی رغبت بڑھتی رہتی ہے،اسی لیے زمانہ قدیم میں انبیا اور مہاپرش آتے رہے تاکہ لوگوں کو اخلاق کی اعلا تعلیم دیں اور اچھے اخلاق کو پروان چڑھائیں۔انبیا کے علاوہ علم وحکمت رکھنے والے دانشوروں اور صالح افراد نے بھی اس کام کو انجام دیا۔ادب کا کام چوں کہ انسان کو سنوارنا بھی ہے اس لیے شعبۂ ادب میں بھی اخلاقیات پر بھرپور توجہ دی گئی اور نقد وجرح اور حالات کا تجزیہ کرکے اچھے اخلاق کی طرف راغب کرنے اور اصلاح عمل پر اکسانے کی کوششیں کی گئیں۔ادب کی ایک شاخ شعر وشاعری بھی ہے،جس کی مختلف اصناف میں اخلاقی تعلیمات کی کثرت نظر آتی ہے۔عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صنف غزل صرف عاشق ومعشوق کی گفتگو سے ہی عبارت ہے مگر ایسا کہنا ہرگز درست نہیں ہوسکتا بلکہ غزلوں میں بھی اخلاقی اقدار کی بھرپور تعلیم موجود ہے۔غزلیات میں اگرچہ عام طور پر مخاطب معشوق ہی ہوتا ہے مگر معشوق بھی انسان ہے اور اسے بھی اچھے اخلاق کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس کے ذریعے بھی پند ونصائح کرکے، واعظ ومحبوب بن کر بھی سیدھے سادے الفاظ میں بھی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے اور صلائے عام کے بطور بھی اصلاح کی کوشش موجود ہے۔اگر قدیم وجدید شعرا کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس ضمن میں بھرپور مواد اصلاح موجود ہے۔ ذوق کی نصیحت، حرص وہوس کے مقابلے میں قناعت پسندی اپنانے کی ہے جس کے وہ فوائد بھی بتاتے ہیں۔قناعت پسندی اخلاقی اقدار میں اعلا مقام رکھتی ہے۔وہ کہتے ہیں۔

اگر انسان قانع ہو تو ہے اکسیر سے بہتر
ہوا وحرص لیکن اس کی مٹی خوار کرتے ہیں

(محمد ابراہیم ذوق)

ادب کی ایک شاخ شعر وشاعری بھی ہے ۔جس کی مختلف اصناف میں اخلاقی تعلیمات کی کثرت نظر آتی ہے ۔عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صنف غزل صرف عاشق و معشوق کی گفتگو سے ہی عبارت ہے مگر ایسا کہنا ہر گز درست نہیں ہوسکتا بلکہ غزلوں میں بھی اخلاقی اقدار کی بھرپور تعلیم موجود ہے ۔غزلیات میں اگرچہ عام طور پر مخاطب معشوق ہی ہوتا ہے مگر معشوق بھی انسان ہے اور اسے بھی اچھے اخلاق کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس کے ذریعے بھی پندونصائح کرکے ۔ واعظ ومحبوب بن کر بھی سیدھے سادے الفاظ میں بھی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے اور صلائے عام کے بطوربھی اصلاح کی کوشش موجود ہے۔

اور راز ایٹوی کہتے ہیں:

آدمی دشمنِ قناعت ہے
ذہنیت ہے ابھی حریصانہ

(راز ایٹاوی)

ہر اچھا کام اگر حدِ اعتدال میں ہو تو اخلاق حسنہ کہلاتا ہے مگر وہی کام اگر اعتدال سے ہٹ جائے اور بے راہ روی اختیار کرلے تو اخلاق رذیلہ بھی بن سکتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کہتے ہیں۔

اچھی نہیں ہے شئے کوئی الفت سے زیادہ
وہ بھی ہے بُری ہو جو ضرورت سے زیادہ

پہلے لوگوں کے اندر خلوص ومحبت پائی جاتی تھی۔لوگوں کے پاس ایک دوسرے سے ملنے، سکھ دکھ کی باتیں کرنے اور ایک دوسرے سے ہمدردی وغمگساری کرنے کے لیے وقت ہوتا تھا مگر آج اخلاق کا یہ تقاضا ختم ہو چکا ہے۔ شاعر اس بات پر رنجیدہ ہے کہ اب ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اکبر ہی کا شعر ہے۔

اب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز
مل گئے صاحب سلامت ہوگئی

حق بات کہنا بھی جرأت کا کام ہے اور حق بات وہی کہہ سکتا ہے جو اپنے قلب کو پاک رکھتا ہے۔یہ اخلاق کی اعلا ترین صنف ہے۔شاد کا شعر ہے۔

امرِ حق کہنے میں جو بے باک ہیں
کچھ ان ہی ایسوں کے دل بھی پاک ہیں

مولانا محمد علی جوہر کا خیال ملاحظہ فرمایئے۔

بے خوف غیر،دل کی اگر ترجماں نہ ہو
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

(محمد علی جوہر)

انسان کی اپنی خودی یا غیرتِ نفس انسانی اخلاق کی بہترین صفت ہے۔جس نے خودی کھودی، وہ دنیا کے آگے دست دراز کیے ملے گا۔ذرا ذرا سی بات پر سوالی نظر آئے گا لہٰذا ہر جگہ وہ کمزور ہی رہے گا۔دراصل ایسے شخص کی اخلاقی موت واقع ہوجاتی ہے۔بے نظیر شاہ کا شعر اس طرز زندگی پر زبردست چوٹ کرتا ہے۔

اہلِ غیرت کا ہے یہ قول،مسیحا سے بھی
موت سے کم نہیں،منت کشِ درماں ہونا

علامہ اقبال کا یہ شعر اگرچہ کہ نظم کا شعر ہے مگر اسی کی ترجمانی کرتا ہے۔

اے طائرِ لاہوتی، اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

انسان کا انسان سے اور قوموں کا قوم سے کبھی کبھی مزاج نہ ملنے کے باعث ٹکراؤ ہو جاتا ہے،مگر اس ٹکراؤ کو وظیفۂ زندگی بنا لینا عقل ودانش کی بات نہیں ہے، بلکہ کسی نہ کسی موڑ پر آکر رک جانا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ یہ طریقہ انسان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا یا نقصان دہ؟ نفرت لے جینا ہے یا اسے چھوڑ کر پیار محبت کے رستے پر آنا ہے۔شاعر بڑے پیارے انداز میں نصیحت کرتا ہے۔

اب تو ملیے، بس لڑائی ہوچکی
اب تو چلیے، پیار کی باتیں کریں

(اختر شیرانی)

شیفتہ فرماتے ہیں۔

تذکرہ صلح کا کرو نہ کرو
بات اچھی نہیں لڑائی کی

(شیفتہ)

تعصبات اور طبقاتی کشمکش نے انسان کو ایسا بنا دیا ہے کہ اسے اپنے اور اپنی قوم وقبیلے کے سوا کسی کا کوئی کارنامہ بھی پسند نہیں آتا کہ وہ اس کی تعریف کرے اور قدر کرے۔ اب سے پہلے انسانی اقدار میں یہ بات شامل تھی کہ انسان کھلے دل سے اہلِ ہنر کے ہنر کا اعتراف کرتا تھا۔حفیظ میرٹھی کہتے ہیں۔

اہلِ ہنر کی قدر بھی ان میں سے ایک ہے
ناپید ہوگئیں جو روایات ان دنوں

بلکہ اس کے برعکس لوگوں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ خوبی کی

اخلاقیات کا بھر پور درس ہماری شاعری، بالخصوص غزلیات میں موجود ھے۔ حرص وھوس کی لڑائی دین و مذھب کی آڑ میں،وفا جفا کے قصے، بدگمانی جس سے نہ اچھا محفوظ رھے نہ برا،اسی طرح ثابت قدمی،بے اعتمادی اور جرات وغیرہ مضامین اخلاقیات جابجاپائے جاتے ھیں۔

تعریف نہ کر کے خوبی کی آڑ میں تحقیر کا موقع تلاش کیا جاتا ہے اور اس طرح سے اذیت پہنچائی جاتی ہے۔حفیظ میرٹھی کہتے ہیں۔

الفاظ کے پھولوں نے نشتر کی چبھن دی ہے
لہجے میں ذرا بھی جب تحقیر نظر آئی

انسانوں کا آپس میں اتحاد اور اجتماع اخلاقی معراج کی علامت ہے۔ابوالمجاہد زاہد اس طرف دعوت دیتے ہیں۔

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشیدِ مبین
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا کام بنے

انسان کا صاحبِ کردار ہونا بھی بڑا اخلاقی کام ہے۔ ابوالمجاہد زاہد ہی کا شعر ہے۔

اس کا کردار ہی خود وجہ کشش ہوتا ہے
اور خوبی نہ سہی صاحبِ کردار کے پاس

حفیظ میرٹھی کے اشعار بھی اسی فکر کے غماز ہیں۔

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

اور۔

تو جوہری ہے تو زیبا نہیں تجھے یہ گریز
مجھے پرکھ، مری شہرت کا انتظار نہ کر

عزم وحوصلہ انسانی زندگی کی علامت ہے۔ابوالمجاہد زاہد کہتے ہیں۔

اس زندگی پہ موت کو ترجیح دیجیے
جس زندگی میں عزم نہ ہو حوصلہ نہ ہو

شمیم جے پوری اس کے متعلق کیا کہتے ہیں،سماعت فرمائیے۔

اہلِ ہمت کے لیے دور نہیں ہے منزل
کوئی اٹھے بھی تو منزل کا ارادہ لے کر

منافقت بھی آج کے دور کی بڑی خوبی تصور کی جاتی ہے۔ آج اکثریت دوہرا معیار اور دوہری زندگی جی رہی ہے۔ شمیم جے پوری کہتے ہیں۔

اس دور کا تعلقِ خاطر نہ پوچھیے
دل میں خلوص ہو کہ نہ ہو دوستی تو ہے

غرض اخلاقیات کا بھر پور درس ہماری شاعری، بالخصوص غزلیات میں موجود ہے۔ حرص وہوس کی لڑائی دین و مذہب کی آڑ میں،وفا جفا کے قصے،بدگمانی جس سے نہ اچھا محفوظ رہے نہ برا،اسی طرح ثابت قدمی،بے اعتمادی اور جرات وغیرہ مضامینِ اخلاقیات جابجاپائے جاتے ہیں۔مثلاً۔

جس شخص میں بھی جراتِ اظہار نہیں ہے
وہ سب ہے مگر صاحبِ کردار نہیں ہے

(تابش مہدی)

جو اعتماد کو ایک بار ٹھیس پہنچا دے
اس آدمی کا دوبارا نہ اعتماد کر

(دوا کرراہی)

جب کسی سے کوئی پیمانِ وفا کرتا ہے
کانپ اٹھتا ہوں کہ میرا ہی سا انجام نہ ہو

(عندلیب شادانی)

جو بھی حق ہے اسے بے خوف وخطر کہتا ہوں
مصلحت کہتی ہے خاموش،مگر کہتا ہوں

(دوا کرراہی)

پہلے آپ اپنا دل آئینہ کیجیے
پھر کسی سے امیدِ وفا کیجیے

(تابش مہدی)

پرانے عہد میں بھی دشمنی تھی
مگر ماحول زہریلا نہیں تھا

(جوش)

بات حق ہے تو پھر قبول کرو
یہ نہ دیکھو کہ کون کہتا ہے

(دوا کرراہی)

بدگمانوں کی مہربانی سے
پاک دامن بچے نہ دامن چاک

(یگانہ چنگیزی)

اوپر چند اشعار تھے جن میں مختلف قسم کی اخلاقی باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔مگر اس شعر میں بڑا وسیع مضمون اخلاقیات کے ضمن میں پیش کیا گیا ہے۔دراصل نفسِ انسانی ہی ساری اخلاقی خرابیوں کی آماجگاہ ہے۔ اگر اس کی اصلاح کر دی جائے تو باقی اوامر کی اصلاح خود بخود ہو جاتی ہے اور یہی بہت مشکل کام ہے۔اسی لیے شاعر کہتا ہے۔

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ واژدھا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

(ذوق)

ایسی اخلاقی شاعری، پند ونصائح سے بھر پور مضامین دراصل اردو شاعری کا وطیرۂ امتیاز رہے ہیں۔ اسی وجہ سے شاعری بھی اصلاحِ قوم کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔چند اشعار مزید ملاحظہ فرمایے۔

حسن ہے بے وفا بھی،فانی بھی
کاش سمجھے اسے جوانی بھی

(اکبرالہ آبادی)

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

(امیر مینائی)

خواہشیں کھودیتی ہیں صبر و شکیب
خواہشوں میں ہوتے ہیں اکثر فریب

(اکبر)

خیالِ سود وزیاں کی اکھاڑ دی بنیاد
بڑے پہاڑ کو رستے سے میں نے ٹال دیا

(شاد)

خطا اک شخص کی اور ساری دنیا سے کھنچے رہنا
میاں اچھا نہیں لگتا ہے یوں گھر میں پڑے رہنا

(شجاع خاور)

درگزر نہیں کرتا جو گنہ گاروں سے
تو ترا اور کوئی ہوگا خدا اے زاہد

(حالی)

دردِ دل،پاسِ وفا،جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

(چکبست)

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(غالب)

اردو کا یقیناً ایسا کوئی شاعر نہیں ہے جس کے اشعار میں اخلاقی مضامین نہ ہوں۔لہٰذا اس موضوع پر لکھنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔

■

Dr. Mohammed Kaleem Zia
Former Associate Professor, Head of The Dept. of Urdu, & Professor In-Charge, Research Center of Urdu, M.E.S.Class-I, Gazetted Officer (Collegiate Branch),Government of Maharshtra's Ismail Yusuf College, Jogeshwari (East),
Mumbai – 400 060 (MS)

بابا ناگارجن

جدید میتھلی اور ہندی کا قطب نما

مشتاق احمد

جدید ہندی اور میتھلی ادب کی تاریخ میں جن تخلیق کاروں کو قد آوری حاصل ہے ان میں بابا ناگارجن کی امتیازی حیثیت ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، صحافی اور مضمون نگار تھے۔ وہ خود کو بنیادی طور پر میتھلی زبان کا شاعر اور ادیب کہتے تھے۔ یہ ان کی مادری زبان سے والہانہ محبت کا ثبوت ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا ادبی ذخیرہ میتھلی زبان سے کہیں زیادہ ہندی میں موجود ہے اور ان کا شمار ہندی کی جدید شاعری کے جنم داتاؤں میں ہوتا ہے۔

ناگارجن کا اصل نام بیدناتھ مشر تھا۔ ان کی پیدائش صوبہ بہار کے دربھنگہ ضلع کے ایک گاؤں ترونی میں 1911 میں ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک سنسکرت پاٹھشالہ میں ہوئی۔ ابھی وہ صرف ساڑھے تین سال کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا اس لیے اپنے گاؤں میں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے۔ ان کے والد ایک پیشہ ور پنڈت تھے۔ ہمیشہ گھر سے باہر رہا کرتے تھے اس لیے ان کو گنگولی سنسکرت پاٹھشالہ میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں سے وہ بنارس چلے گئے اور پھر وہاں سے کلکتہ۔ اس طرح وہ سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ آخر میں انھوں نے مدراس جا کر اپنی تعلیم مکمل کی اور وہاں سے انھوں نے 'اچاریہ' کی ڈگری حاصل کی۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1930 میں ہوا۔ جب ان کی پہلی نظم 'متھلا' (لہریاسرائے) میں شائع ہوئی۔ انھوں نے پہلے اپنا قلمی نام بدیہہ (बिदेह) رکھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد قلمی نام بدل کر 'یاتری' کے نام سے لکھنے لگے۔ 1930 تک ہندی اور میتھلی دونوں زبان میں 'یاتری' کے نام سے ہی لکھتے رہے۔ جب وہ سری لنکا گئے اور بدھ ازم کی طرف مائل ہو گئے تو اپنا نام بدلا اور 'ناگارجن' کے نام سے ہندی میں لکھنے لگے مگر میتھلی میں وہ اپنا قلمی نام یاتری ہی لکھتے رہے اور بعد کے دنوں میں ان کی پہچان 'ناگارجن' سے ہی مستحکم ہوئی۔

ہندی ادب کی تاریخ میں ناگارجن کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا شمار ہندی ادب کو نئی سمت دینے والوں میں ہوتا ہے۔ جہاں تک میتھلی زبان و ادب کا سوال ہے تو ودیاپتی، پنڈت ہرش ناتھ، پنڈت سیتا رام

جھا اور

چندا جھا کے بعد ان کا نام لیا جاتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف میتھلی شاعری کو نئے افکار و نظریات سے آشنا کیا بلکہ میتھلی ناول نگاری کو اعتبار کا درجہ عطا کیا۔ افسوس صد افسوس کہ آسمانِ ادب کا یہ درخشاں ستارہ 5/نومبر 1998 کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ لیکن ان کی تخلیقات کا ذخیرہ ان کی ابدی شہرت کا ضامن ہے۔ ان کے بغیر جدید میتھلی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی اور نہ ہندی کی جدید شاعری کا ذکر ہی ناگارجن کے بغیر مکمل ہو سکتا ہے۔

میتھلی ان کی مادری زبان تھی۔ اس زبان میں وہ اپنی بات کہنے میں زیادہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ میتھلی زبان میں ان کے دو شعری مجموعے 'چترا' (चित्रा) اور پتر ہین نگن گاچھ (पत्रहीन नग्न गाछ) ہیں۔ 'پتر ہین نگن گاچھ' پر انھیں 1967 میں شاعری کا میتھلی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا۔ 'پارو' (पारो) 'نوتوریا' (नवतुरिया) اور 'بلچنما' (बलचनमा) ان کے مشہور ناول ہیں۔ راقم الحروف نے ان کے ناول 'بلچنما' کا اردو ترجمہ 2005 میں کیا تھا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ ہندی میں نئی پود، رتی ناتھ کی چاچی، برون کے بیٹے، اُگرتارا، امرتیا کوکھی پاک، بابا بٹیشور ناتھ، پارو، دکھ موچن، غریب داس، جمنیا کا بابا اور 'ہیرک جینتی' ان کے مشہور ناول ہیں۔ تالاب کی مچھلیاں، یگ دھارا، تم نے کہا تھا، پرانی جوتیوں کا کورس اور 'ہزار ہزار باہنوں والی' قابلِ ذکر شعری مجموعے ہیں۔

ادب ہی ان کا ذریعہ معاش تھا اس لیے وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں قلم لیے ہوتے تھے۔ ان کی نگاہ بہت بلند تھی، مشاہدہ بہت گہرا تھا، کوئی بھی موضوع ان کے لیے مشکل نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کافی لکھا ہے۔ ویر و کرم، ترکو کا کھیل، ندی بول اٹھی، بانزکماری بچوں کے لیے لکھی گئی قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔ 'پریم چند کی جیونی' اور 'ایک ویکتی ایک یگ' ہندی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ناگارجن نے سنسکرت زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ ان کی تیس نظموں کا مجموعہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ انھوں نے بنگلہ میں بھی شاعری کی ہے۔ وہ میتھلی، ہندی اور بنگلہ کے علاوہ گجراتی، مراٹھی، پنجابی، ملیالم اور تیلگو زبان بھی جانتے تھے۔

ناگارجن خاموشی کے ساتھ کام کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کو کبھی اس بات کا خیال نہیں رہا کہ دنیائے ادب میں انھیں کون کیا کہہ رہا ہے۔ بس وہ لکھتے رہے۔ اپنے آس پاس کی زندگی کو اپنے فن میں ڈھالتے رہے۔ وہ اپنے عہد کے ایک سچے عکاس تھے۔ آخر کار دنیائے ادب کو ان کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا اور 1967 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، مدھیہ پردیش کا اچاریہ میتھلی شرن گپت ایوارڈ، یوپی حکومت کا 'بھارت بھارتی' انعام اور بہار سرکار کا 'راجندر شکھر سمان' ملا۔

ناگارجن کے لیے مذہب کوئی دیوار نہیں تھی۔ وہ ایک ہندو برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ بدھ ازم کو اپنایا، جین ازم کی طرف مائل ہوئے اور پھر ناستک ہو گئے۔ درحقیقت ان کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ اگر ان کا کوئی مذہب تھا تو وہ مذہب انسانیت کا تھا۔ وہ انسانیت کے پجاری تھے۔ ان کی تمام شاعری انسان کے دکھ درد کی کہانی ہے۔ ان کے ناول انسان کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی انسان کے لیے تھی، وہ خود بھی ایک اعلیٰ انسان تھے۔ راقم الحروف کو ان سے ملنے کا بارہا موقع نصیب ہوا ہے۔ وہ میرے گاؤں کے پڑوسی یعنی بس دو کلومیٹر دور کے رہنے والے تھے۔ اس لیے انھیں ذاتی طور پر بھی خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کبھی کسی کے سامنے جھکے نہیں۔ اپنی بات کہتے رہے، وہ اپنے طنزیہ لہجے کی وجہ سے بھی ہندی ادب میں جانے پہچانے جاتے تھے۔

ناول 'بلچنما' بابا ناگارجن کا ایک شاہکار ہے۔ اس ناول میں آزادی سے قبل کے متھلانچل بالخصوص دربھنگہ، مدھوبنی اور سمستی پور کے زمینداروں کے ذریعے گاؤں کے مزدوروں، کسانوں اور پسماندہ طبقے کے لوگوں پر جو ظلم وستم ڈھائے جارہے تھے، ان کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کا ہیرو بلچنما دراصل ایک علامت ہے ظلم کے خلاف بغاوت اور طبقاتی کشمکش کی، جو زمینداروں کے ظلم اور غیرانسانی فعل کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ بلچنما اسی زمیندار کے یہاں مجبوراً بھینس چرانے کی نوکری کرتا ہے جس زمیندار نے اس کے باپ کو محض ایک آم توڑنے کے جرم میں ایک کھمبے سے باندھ کر اس قدر مارا پیٹا کہ موقع پر ہی اس کی موت ہوگئی تھی۔ لیکن ایک دن بلچنما ان بے رحم اور قصائی صفت زمینداروں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور نہ صرف خود زمینداروں کے شکنجے سے آزاد ہوتا ہے بلکہ گاؤں کے سیکڑوں کسانوں کو آزادانہ زندگی گزارنے کے لیے اپنی تحریک کا حصہ بناتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دن غلامانہ زندگی گذارنے والے کسان اور مزدور زمینداروں کے چنگل سے نجات پاتے ہیں۔

بابا ناگارجن نے ہمیشہ ان طاقتوں کے خلاف آواز بغاوت بلند کی جو ہندوستانی عوام کی آزادی کی راہ میں حائل تھے۔ انھوں نے ہندوستانی گاؤں میں رہنے والے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں ہندوستانی معاشرت ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں طبقاتی کشمکش کے ساتھ ساتھ آزادی کی تحریک کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ ان کے کرداروں کا فطری ارتقا ہی ان کی ایک بڑی انفرادیت ہے۔ 'بلچنما' میں تمام کردار فعال ومتحرک نظر آتے ہیں۔ بابا ناگارجن کی مثالیت پسندی کی ایسی مثال کسی دوسرے ناول میں نہیں ملتی۔ بلچنما، چنی، رادھا بابو، سوامی جی، پھول بابو، برج بہاری عرف بچو اور اور جانکی سب مثالی کردار ہیں۔ ان کرداروں کو چوتھی دہائی کے ہندوستان اور اس کے خاص سیاسی اور معاشی پس منظر میں دیکھیے تو ہر ایک کردار کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

جہاں تک شاعری کا سوال ہے تو ان کی شاعری کا موضوع بھی جبر واستبداد رہا ہے۔ وہ ہر طرح کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود مارکسی نظریے کے تھے لیکن مارکسی حکومت کے خلاف بھی آواز بغاوت بلند کرتے رہے اور ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کی نگاہ میں وہ ایک باغی ادیب وشاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس فنکار کی فکر ونظر کا محور انسانی معاشرے کی بدحالی اور استحصال ہوگا اسے کوئی بھی حکمراں جماعت قبول نہیں کرسکتی۔

ان کی نظم 'ان کو پرنام' تو میتھلی اور ہندی دونوں میں ایک شاہکار نظم تسلیم کی گئی ہے۔

جو نہیں ہوسکے پورن کام/ میں ان کو کرتا ہوں پرنام
کچھ کنٹھت او لکچھ بھرشٹ
جن کے ابھیمنترت تیر ہوئے
رن کی سماپتی کے پہلے ہی
جو ویر رکت تو نیر ہوئے
ان کو پرنام!
جو چھوٹی سی نیا لے کر
اترے کرنے کو اُودھی پار
من کی من میں ہی رہی سوینگ
ہوگئے اسی میں نراکار
ان کو پرنام!
جو اونچ شکھر کی اور بڑھے
رہ رہ نو نو اُتساہ بھرے
پر کچھ نے لے لی ہیم سمادھی
ان کو پرنام!
ایکا کی اور اکنچن ہو
جو بھو پریکرما کو نکلے
ہوگئے پنگو پرتی پد جن کے
اتنے اور شٹ کے داؤ چلے
ان کو پرنام!
کرت کرت نہیں جو ہو پائے
پرتیوت پھانسی پر گئے جھول
کچھ ہی دن بیتے ہیں پھر بھی
یہ دنیا جن کو گئی بھول
ان کو پرنام!
تھی عمر سادھنا پر جن کا
جیون ناٹک دکھانت ہوا
یا جنم کال میں ہی سنگھ لگن
پر کوسے ہی دیہانت ہوا
ان کو پرنام!
دریڑھ برت اور دودرم ساہس کے
جو اُداہرن تھے مورتی منتر
پر نربدھی بندی جیون میں
جن کی ڈھن کا کردیا انت
ان کو پرنام!
جن کی سیوائیں اتولنیہ
پر وگیاپن سے رہے دور
پرتی کول پرستھتی نے جن کے
کردیے منورتھ چور چور
ان کو پرنام!

یہ مذکورہ نظم پانچ دہائی پہلے کی لکھی ہوئی ہے لیکن عصری تناظر میں بھی اس نظم کی قرأت ذہن کے دریچوں کو وا کرتی ہے اور ایک عظیم فنکار کی تخلیق اپنی عصری معنویت برقرار رکھتی ہے اس کا بھی خلاصہ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی سی نظم 'میری بھی آبھا ہے اس میں' ملاحظہ کیجیے۔

نئے گگن میں نیا سورج جو چمک رہا ہے
یہ وشال بھوکھنڈ جو دمک رہا ہے
میری بھی آبھا ہے اس میں
بھینی بھینی خوشبو والے
رنگ برنگے
یہ جو اتنے پھول کھلے ہیں
کل ان کو میرے پرانوں میں نہلایا تھا
کل ان کو میرے سپنوں نے سہلایا تھا
پکی سنہری فصلوں سے جو
اب کی یہ کھلیان بھر گیا
میری رگ رگ کی سونت کی بوندیں
اس میں مسکراتی ہے
نئے گگن میں نیا سورج جو چمک رہا ہے
یہ وشال بھوکھنڈ جو دمک رہا ہے

اس نظم میں بھی جدید ہندوستان کی تعمیر میں مزدور طبقے کی قربانیوں کو شعری پیکر میں ڈھالا گیا ہے اور کس طرح حاشیائی طبقے کو نظر انداز کیا گیا ہے اس کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ ناگارجن نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں صرف ہماری سماجی زندگی کی ہی عکاسی نہیں کی ہے بلکہ سماجی زندگی کے ایسے تاریک گوشے کو موضوع بنایا ہے جس سے ان کے بنیادی نقطۂ نظر کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ ان کی مقبولیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے ہی آس پاس کی زندگی کی ترجمانی کی ہے، اپنے ہی ماحول کی عکاسی کی ہے۔ دوسرے شعراء کی طرح ان کا رنگ مصنوعی نہیں اور نہ ان کے موضوع مانگے کا اجالا ہیں۔ غرض کہ ناگارجن ادب برائے زندگی کے علمبردار ہیں اور اپنے قلم کی جنبش سے فرسودہ سماج کے تمام ہوائی قلعوں کو منہدم کرکے ہمیں اس دنیا سے روشناس کراتے ہیں جس میں ہم بستے ہیں اور اپنی آنکھوں سے انسانی زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں۔

■

Dr. Mushtaque Ahmad
Registrar L.N.M. University
Darbhanga- 846004 (Bihar)
Mob.:9431414586
Email.: rm.meezan@gmail.com

شہاب ظفر اعظمی

مظہر امام کی نظمیں

حقیقت اور رومان کا آمیزہ

ملک گیر سطح پر اردو کے بڑے اور مقبول شاعروں میں مظہر امام کا نام آتا ہے۔ وہ ہر مذاق کے قاری کو اپنے شاعر لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مظہر امام رومان پسند شاعر ہیں اور ترقی پسند شاعر بھی۔ جدید شاعری میں ان کی کاوشیں ملتی ہیں اور نئی تجرباتی شاعری میں بھی انہوں نے شہرت و قبولیت حاصل کی ہے۔ حالانکہ ان کا شعری سرمایہ بہت ضخیم نہیں ہے۔ ان کی مدت حیات، شاعری اور شہرت کو دیکھتے ہوئے نہیں لگتا کہ غزلوں کا انتخاب محض ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ ان کے صرف تین شعری مجموعے آئے۔ زخم تمنا، رشتہ گونگے سفر کا اور پچھلے موسم کا پھول۔ بند ہوتا ہوا بازار ان کے دو مجموعوں (زخم تمنا اور رشتہ گونگے سفر کا) سے لی گئی نظموں کی کلیات ہے اور 'پالکی کہکشاں کی' میں تینوں مجموعوں کی غزلوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر ان کی نثری کتابوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ دراصل مظہر امام غزلوں پر غزلیں یا نظموں پر نظمیں لکھنے کے عادی نہیں تھے۔ انھوں نے کمیت کے بجائے کیفیت پر توجہ دی اور اردو کو مختصر مگر غیر معمولی شعری سرمایہ عطا کیا۔ اسی لیے ان کی شاعری کا کوئی حصہ ایسا نہیں ملتا جسے غیر ضروری یا بھرتی کا قرار دے دیا جائے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے 'پچھلے موسم کا پھول' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ہر شعر انتخاب کی کیفیت رکھتا ہے۔ یعنی کوئی شعر ایسا نہیں ہے جسے یکسر رد کرنے کا جی چاہے۔'' میرا خیال ہے یہ جملہ ان کے تمام شعری سرمایے کو سامنے رکھ کر بھی کہا جا سکتا ہے۔

مظہر امام جدید غزل کے معماروں میں شمار کیے جاتے ہیں مگر ان کی نظمیں بھی کم اہم نہیں ہیں۔ ان کی نظمیں تعداد میں قلیل ہیں مگر کیف و معنی کے اعتبار سے زبردست ہیں اور جدید نظموں کی فہرست میں نمایاں مقام کی حامل سمجھی جاتی رہی ہیں۔ ان کے پہلے مجموعہ 'زخم تمنا' میں 42 نظمیں ہیں جو زیادہ تر نیم رومانی احساسات و جذبات کی غمازی کرتی ہیں۔ ان پر اختر شیرانی، جمیل مظہری وغیرہ کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ بعد میں آگے چل کر مظہر امام کی شاعری میں فنی پختگی آئی اور 'رشتہ گونگے سفر کا' کی نظمیں ایک مثال قائم کرتی ہیں۔ ان کی ابتدائی نظموں میں قنوطی رنگ نمایاں ہے۔ پژمردگی، دنیا بیزاری اور خواہش مرگ اس دور کے حاوی موضوعات ہیں۔ مثلاً ان کی نظم 'حیات آوارہ' کا یہ بند دیکھیے۔

جیسے کوئی شاعر ناکام تڑپے داد و تحسیں کے لیے
آرزو میں جس طرح دل کی خلاؤں میں ہوں محو پیچ و تاب
دشت میں کرتا ہو کوئی تشنہ لب جس طرح پانی کی تلاش
ڈھونڈتا ہے سایہ جیسے گرمیوں کی دوپہر میں آفتاب
زندگی یوں ہی بھٹکتی پھر رہی ہے جستجوئے موت میں

(زخم تمنا، ص 172، ناشر ازیسا اردو پبلشرز، دیوان بازار، کٹک، اشاعت 1962)

ایسا کیوں ہے؟ شاعر موت کا خواہش مند کیوں ہے؟ ان کی ابتدائی نظمیں مایوسی و محرومی سے بھری ہوئی کیوں ہیں؟ ایسے سوالوں کا جواب مظہر امام خود 'دیباچہ' میں دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''مجھے احساس ہے کہ ہر وقت آنسو بہاتے رہنا کوئی مہذب فعل نہیں ہے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ خود تہذیب کی حسین قدروں کا حسن مشتبہ ہو گیا ہے۔ انسان اپنی عظمت کھوتا جا رہا ہے اور تباہی و بربادی کی طاقتیں سرافراز ہو رہی ہیں۔ نیکی، حق پسندی اور انسان دوستی کے نعروں میں پہلی سی حرارت نہیں رہی۔ میرے غم کی نوعیت انفرادی نہیں اجتماعی بھی ہے'' (ایضاً، ص 14)

اس اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مظہر امام جس زمانے کی بات کر رہے ہیں وہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی ہے جو جنگ عظیم، سیاسی کش مکش اور سماجی اتھل پتھل کا زمانہ ہے۔ تہذیبی قدریں زوال آمادہ ہیں اور انسانی عظمت دم توڑ رہی ہے۔ معاشرے میں عدم تحفظ نے انسان کے سامنے ایسے مسائل کھڑے کر دیے ہیں جو اس کے مذہبی، تہذیبی اور اقداری تصورات کو منہدم کرنے پر تلے ہیں۔ یہ ایسے حالات ہیں جو شاعر کو تنہائی، رنج و غم اور قنوطیت جیسے احساسات سے دوچار کرتے ہیں اور لاشعوری طور پر اس کی تخلیقات حزن و یاس ہی نہیں انسان کی مجبوری و بے بسی کا بھی اظہاریہ بن جاتی ہیں۔ نظم 'برف میں آگ' کا اختتام انتہائی مایوس کن انداز میں ہوتا ہے۔

میں سوچتا ہوں نئے حوصلوں کی بات کروں
جنون شوق کی پرواز کی ادائیں دوں
مگر یہ کیا کہ مرے بازوؤں میں تاب نہیں
فغاں! کہ برف کی سِل ہے دل فسردہ بھی
لگاؤں آگ اگر برف میں تو کیا حاصل
کہ آگ اپنی حرارت کو بھی گنوا دے گی

(ایضاً، ص 83)

نظم 'غروب شام' میں بھی وہی مایوسی اور اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔

شام کے ڈوبتے سورج کی سسکتی کرنیں
میرے افکار کو کیا دیں گی تب و تاب حیات
میرے ٹھٹھرے ہوئے جذبات کے ویرانے میں
اور اُمڈا ہی چلا آتا ہے سیل ظلمات

(ایضاً، ص 84)

'زخم تمنا' کی نظمیں مایوسی اور قنوطیت کے باوجود بنیادی طور پر رومانی ہیں۔ اس لیے ترقی پسندوں میں شامل ہو کر بھی مظہر امام اپنی نظموں کو نعرہ یا پروپگنڈہ کی شکل نہیں دے سکے ہیں۔ ان میں ترقی پسند نظم نگاروں کے برعکس وضاحت بیان کے بجائے رمز و ایما سے کام لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں فیض احمد فیض اور مظہر امام میں بڑی مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فیض نے اپنی شاعری کا آغاز براہ راست ترقی پسندی سے نہیں کیا بلکہ بنیادی طور پر ایک رومان پسند شاعر ہیں۔ قریب قریب یہی صورت حال مظہر امام کی بھی ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری پر

رومان کی خوبصورت فضا سایہ فگن ہے مگر وہ فضا تصوراتی اور خیالی نہیں ہے۔ان کے احساسات و جذبات میں بلا کی سچائی ہے اور یہی سچائی انھیں فیض کے قریب کر دیتی ہے۔

مظہر امام اپنی رومانی دنیا اور حسن و عشق کی خواب آور فضاؤں میں رہ کر شاعری کر رہے تھے کہ زندگی کی مٹھاس کڑواہٹ میں بدل گئی۔وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہوئے تو ان کی شاعری میں ایک نیا موڑ آ گیا۔اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں:

"زندگی کے شکست اور تلخ تجربوں نے جن کی نوعیت ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھی، میری روح میں یاس و تلخی کا زہر گھول دیا۔غالباً یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا، یوں کہ اس کے بغیر شاید میں اپنے عہد کے مزاج سے نا آشنا اور ہم عصروں کے لیے اجنبی رہتا۔" (ایضاً،ص 13)

لیکن ایسے میں بھی مظہر امام کے قدم ڈگمگاتے نہیں اور نہ ہی وہ راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔زندگی کی اُن تمام نئی قدروں سے وہ نبرد آزما ہوتے ہیں اور زندگی کی ایک ایک چبھن کو پھولوں کی تازہ اور نازک پنکھڑیوں میں اس طرح ملفوف کر کے زمانے کو پیش کرتے ہیں کہ بیک وقت چبھن کے ساتھ ساتھ نازکی،تازگی اور من موہ لینے والی خوشبو سے ہماری مکدر طبیعت فرحت و بشاشت کا احساس کرتی ہے۔یعنی بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں مظہر امام بہ حیثیت شاعر جیسے جیسے پختہ،سینئر اور بڑے ہوتے جاتے ہیں ان کی نظموں میں ایک مثبت اور پختہ نقطۂ نظر نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔یہ فرق اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اُس دور میں ترقی پسندی کی ادعائیت کو چھوڑ کر جدیدیت کو اپنا لیتے ہیں۔یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بتاتا چلوں کہ مظہر امام کی ترقی پسندی سے علاحدگی اور جدیدیت کی طرف جھکاؤ کو کچھ دانشوروں نے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔

مظہر امام شہرتوں کے پیچھے دوڑنے والے شاعر نہیں تھے۔لہٰذا محض شہرت کی خاطر وہ جدیدیت سے منسلک نہیں ہوئے۔دراصل ہر بڑا فنکار اپنے زمانے،اپنے آس پاس کے ماحول اور اہم شخصیتوں کے فکر و خیال کو کسی حد تک قبول بھی کرتا ہے اور رد بھی۔اسی رد و قبول کے درمیان اس کے اپنے شخصی اور فنکارانہ نقوش ابھرتے ہیں۔مظہر امام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔وہ ترقی پسندی سے متاثر ہوتے ہیں،مگر جب وہ پرچار اور پروپیگنڈہ بننے لگتی ہے جس میں فنکار کے انفرادی احساسات گم ہونے لگتے ہیں تو جدیدیت کے رجحان سے قریب آ جاتے ہیں۔پھر جدیدیت میں مریضانہ انفرادیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں سے بھی الگ ہونے میں انھیں دیر نہیں لگتی اور آخر میں مابعد جدیدیت کے نظریات سے متاثر ہوتے ہیں۔ادبی تحریکوں،رجحانوں اور نظریوں کا اثر لینا قلم کار کے عصری شعور کا مظہر ہے۔مظہر امام کا ذہن و فکر بھی جامد و ساکت نہیں ارتقا پذیر تھا۔فنکارانہ سطح پر وہ سفر،مدام سفر پر یقین رکھتے تھے۔انھوں نے جہاں جدیدیت کو قبول کیا وہیں ترقی پسند نظریات کے مثبت پہلوؤں سے بھی صرف نظر نہیں کیا۔ان کی بعد کی نظمیں فکری سطح پر جدید ہوتے ہوئے کہیں نہ کہیں ترقی پسند افکار کی بھی آئینہ داری کرتی ہیں۔

'زخم تمنا' سے 'رشتہ گونگے سفر کا' تک کی نظمیں رومانیت اور ترقی پسندی سے جدیدیت تک سفر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ان مجموعوں میں شامل نظمیں اپنے انداز اور اسلوب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔فکری طور پر دوسرے مجموعے کی نظمیں بھی اقدار کے بحران اور انسانی رشتوں کے بکھراؤ کی طرف ہی اشارہ کرتی ہیں۔ان میں بھی تنہائی،بے گانگی،بے یقینی،درد و کرب اور غیر محفوظیت کا اظہار کیا گیا ہے جو اس دور کا عام ادبی رجحان ہے مگر ان نظموں میں داخلیت اور دروں بینی کا میلان نمایاں ہے۔'زخم تمنا' کی نظمیں اجتماعی احساسات اور عام انسانی احوال و کوائف کو پیش کرتی تھیں اور انداز بیان بھی نسبتاً واضح اور Loud تھا۔جبکہ 'رشتہ گونگے سفر کا' کی نظموں کا اسلوب بالواسطہ اور علامتی ہے اور جدیدیت کے فلسفے کے زیر اثر ان میں نئی لفظیات کو برتتے ہوئے انفرادی ذات اور شخصیت کا اظہار کیا گیا ہے۔'زخم تمنا' سے ہی ستمبر 1960 میں لکھی گئی ایک مختصر نظم 'اشتراک' دیکھیے جہاں سے تبدیلی کا نمایاں اشارہ ملتا ہے۔

"خیر اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
اس قبیلے میں کوئی کسی کا نہیں/ ایک غم کے سوا
چہرہ اترا ہوا/ بال بکھرے ہوئے/ نیند اچٹی ہوئی
خیر اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
آؤ ہم لوگ جینے کی کوشش کریں" (ایضاً،ص 146)

اور پھر 'رشتہ گونگے سفر کا' کی نظم 'اکھڑتے خیموں کا درد' میں یہاں پہنچتا ہے کہ۔

مہیب طوفاں مہیب تر ہے
پہاڑ تک ریت کی طرح اڑ رہے ہیں
بس ایک آواز گونجتی ہے/ مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ
مگر کہیں بھی اماں نہیں ہے/ جو اپنی کشتی پہ بچ رہے گا
وہی علیہ السلام ہوگا

(رشتہ گونگے سفر کا،ص 17،شب خون کتاب گھر،الہ آباد،اشاعت 1974)

یہ نظمیں مظہر امام کے مثبت طرز فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔شاعر مایوس،پژمردہ اور غمگین چہرہ والے نئے فرد کا استقبال کرتا ہے اور اسے خواہش مرگ کے بجائے مژدۂ حیات کا پیغام دیتا ہے۔طوفان حیات میں وہی سلامت رہے گا جس کے پاس طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ ہوگا۔انسانیت اور زندگی کی معنویت تبھی ہے جب حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے موت کو شکست اور حیات کو فتح حاصل ہو۔مظہر امام نے اس نظم میں ابتدائی نظموں کے قنوطی رویے کے برخلاف رجائی اور حوصلہ افزا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔یہی نقطۂ نظر 'زخم تمنا' کے آخری حصے اور 'رشتہ گونگے سفر کا' کی زیادہ تر نظموں میں واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

'رشتہ گونگے سفر کا' کی کئی نظموں میں ازدواجی زندگی کی بے معنویت،زندگی کے جبر اور آزاد بے نام رشتوں کی اہمیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔(بقول شاعر اس نوع کے موضوعات کی جانب اردو میں شاذ ہی توجہ دی گئی ہے) اس میں پہلی نظم جو آپ کو متاثر کرے گی،اُس کا عنوان ہے 'تمھارے لیے ایک نظم'۔یہ ایک سحر انگیز نظم ہے جس کی لفظیات عام سی مگر انداز بیان مختلف ہے۔سیدھے سادے عام لفظوں میں نظم کا ارتقا ہمیں نئے احساسات اور نئی کیفیات سے روشناس کراتا ہے۔نظم کا یہ حصہ دیکھیے:

میں/ اُن ساعتوں کی گذرگاہ پر آبلہ پا رواں ہوں
جو دفتر کی/ بیوی کی/ بچوں کی
احباب کی ملکیت ہیں/ میں اب وہ نہیں ہوں
جو میں تھا
اب اک مردہ انسان کا کوٹ میرے بدن کی کثافت
چھپائے ہوئے ہے
میں برسوں کی رسوائیاں
اس کی بوسیدہ جیبوں میں مدفون کرنے میں
مصروف ہوں"

(رشتہ گونگے سفر کا،ص 8،شب خون کتاب گھر،الہ آباد،اشاعت 1974)

شاعر نے ایسی راہ اختیار کی ہے جو اس کے خوابوں سے الگ ہے۔وہ بالکل بدل چکا ہے۔اچانک ایک شب وہ اپنے دیرینہ معشوق کو تصور میں لا کر ہم کلام ہوتا ہے اور اسے اپنی مجبوریاں بتاتا ہے۔یہ مجبوریاں گھریلو اور سماجی ضرورتوں سے بندھی ہوئی ہیں۔جب وہ معشوق کو یہ سب بتاتا ہے تو اُسے راحت محسوس ہوتی ہے۔مگر پوری نظم ایسی سادہ نہیں ہے۔دوسرے اور تیسرے حصے میں یہ رومانی نظم فلسفہ،استعارہ اور علامت کے سہارے نئی معنویتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔چنانچہ نظم کے اختتام پر کئی نئے موضوعات جنم لیتے ہیں اور نظم جو رومانی تصور لیے ہوئے معشوق کے ساتھ ہم کلامی سے شروع ہوئی تھی فلسفیانہ رنگ لے کر زندگی اور جبر کے تصور تک پہنچ جاتی ہے۔

یہ دنیا اک ایسا مکاں ہے/ جہاں کوئی کھڑکی نہیں
صرف دروازہ ہے ایک/ اندر سے جو بند ہے
اگر کھول پائیں تو کھولیں/ کہ اندر ہمیں ہیں!

(ایضاً،ص 11)

تکنیک، ہیئت اور اسلوب کا تجربہ Patches میں منقسم اس نظم کو جدید ہی نہیں کامیاب اور خاص بھی بنا دیتا ہے۔

مظہر امام کی کئی نظموں میں ایک شادی شدہ مرد کا کردار نا آسودہ فرد کے طور پر ابھرتا ہے، جو لذت گناہ سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے مگر خود پر کنٹرول کرتا ہے اور بالآخر اپنی نا آسودہ زندگی میں لوٹ آتا ہے۔ زندگی سے اس کی توقعات زیادہ ہی ہیں۔ وہ ہرا بھرا گھر اور خاندان رکھتے ہوئے اپنے محبوب کی یاد میں کھویا رہتا ہے، گویا زندگی کے جبر کا شکار ہے۔ نظم 'گوشت کا نغمہ' میں دیکھیے۔

تجھ سے بچھڑے ہوئے/ چھ سال ہوئے
وقت کی کوکھ میں کتنے لمحے/ جل گئے/ راکھ بنے
زندگی ایک نئے رنگ میں آتی ہے/ کہ اب
گھر بھی ہے، بیوی بھی، بچے بھی ہیں
شب کی تپتی ہوئی خاموشی میں
پھر بھی جب یاد تری نغمہ فشاں نوحہ بہ لب آتی ہے
اپنی شہ رگ کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے کانوں میں مرے
میری آواز میں آواز تری گونجتی ہے
میرے خوابوں میں ترے خواب چمک اٹھتے ہیں
کاش اک رات بھی/ خلوت میں کبھی تو جو میسر آتی
پھر میں یہ فیصلہ کرتا/ کہ محبت میں تری
روح کا نغمہ بھی شامل ہے
فقط گوشت کی فریاد نہیں' (ایضاً، ص 35)

مظہر امام کے یہاں محبت تمام پابندیوں اور رشتوں سے بے نیاز ایک روحانی رشتہ ہے جس میں فرد کی آزادی کہیں سے مجروح نہیں ہوتی۔ گھر آنگن کی مجبوریاں اور گھٹن زندگی کے جبر کو نمایاں کرتی ہیں۔ مظہر امام اس جبر کو پسند نہیں کرتے اور بغاوت کے خواہاں رہتے ہیں۔ اپنی نظم 'کنگال آدرش' میں انھوں نے زندگی کے جبر اور ازدواجی زندگی کی بے معنویت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ بیوی شاعر کی شخصی آزادی پر روک لگاتی ہے اور روایتی مثالیت پرستی کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن شاعر باورچی خانے کے ایندھن سے بستر کی شکن تک رسمی سماجی رشتے کو محبت نہیں مانتا بلکہ ناگوار قسم کا سمجھوتہ مانتا ہے۔ بیوی پابندیاں لگاتی ہے کہ وہ دوستوں کے ساتھ ساحل سمندر تک نہ جائے، مئے ناب سے زندگی کو حرارت نہ بخشے اور کسی سادہ رو حسینہ کی اس کے سامنے تعریف نہ کرے وغیرہ وغیرہ۔ شاعر کو یہ پابندیاں پسند نہیں۔ وہ کہتا ہے۔

یہ محبت کی بنجر زمیں/ جہاں پھول کھلتے نہیں
جہاں چاندنی اپنا جلوہ دکھاتی نہیں/ یہ محبت
جو چولھے سے بستر کی بھدی شکن تک ہی محدود ہے
یہ محبت نہیں/ جبر ہے (ایضاً، ص 34)

دراصل شاعر زندگی کی یکسانیت سے نجات پانا چاہتا ہے اور ایک فنکار کی طرح رومانیت، حسن، رنگینی اور مسکراہٹ کا خواہاں ہے۔ اور یہ سب چیزیں نہیں مل پاتیں تو وہ ماضی اور محبوب کو یاد کرتا ہے۔ 'رشتہ گونگے سفر کا' نگاہ میں رکھیے تو نظم گم شدہ قدروں پر نوحہ اور فلسفیانہ رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ زندگی کے جبر اور باغی تیوروں کا اظہار بھی کرتی ہے۔ اس نظم میں مظہر امام کا گمشدہ محبوب زندگی کے طویل سفر میں دوبارہ ملتا ہے۔ وہ بھی کسی کارواں سے الگ ہو کر بھٹکتا ہوا ایسے دوراہے پر آن کھڑا ہے جہاں اس کی ملاقات اپنے پرانے ساتھی سے ہو جاتی ہے۔ اگر دونوں باغی ہیں اور روایات کے بندھن سے آزادی چاہتے ہیں تو دونوں کو ایک ساتھ زندگی کا سفر طے کرنا چاہیے تھا۔ مگر ایسا بالکل نہیں ہو پاتا۔ دونوں روایات کی شکستہ مگر اونچی دیواریں توڑ نہیں سکتے کیوں کہ اخلاق اور سماجی قدروں کا جبر ان کے ہاتھ باندھے رکھتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے فون پر بات کرتا ہے مگر نا آسودہ ہے۔ وہ جسم اور لمس کا فاصلہ ختم کرنا چاہتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ روایت کی زنجیر، بیوی بچوں کی صورت میں شاعر کے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہے۔ صوت و آواز کا رشتہ ہی ایک سہارا ہے جو اگرچہ گونگے سفر کا رشتہ ہے مگر اسے تقویت بخشتا ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ یہ رشتہ دائمی طور پر قائم رہے۔

تمھاری رگوں میں/ میری رگوں کی طرح
کتنی صدیوں کا خوں/ کتنی نسلوں کا خوں
موجزن ہے/ اور یہ ساری نسلیں
شکستہ مگر اونچی دیوار کی طرح استادہ ہیں
یوں ہی کب تلک فون پر بات کرتے رہیں گے
یوں ہی فاصلہ جسم کا لمس کا
ایک رشتہ فقط صوت و آواز کا
یہ رشتہ بھی حصہ ہے گونگے سفر کا
جانے کب ٹوٹ جائے، کسے یہ پتہ ہے!
کاش یہ رشتہ صوت و آواز ہی دائمی ہو
کہ گونگے سفر کے سبھی سلسلے عارضی ہیں
(ایضاً، ص 13)

یہ نظم بظاہر ایک فرد کے محسوسات کی آئینہ داری کرتی ہے مگر دراصل یہ اس عہد کے برگشتہ انسان کی آواز اور اس کے کرب کا فنکارانہ اظہار ہے۔ اس میں محض سماج کی بالائی سطح پر تیرنے والی حقیقتوں کا ادراک نہیں بلکہ پوری زندگی پر چھائی ہوئی تاریکی کو جذب کرنے کی کوشش ہے جس سے آج کا انسان خارجی اور داخلی طور پر دوچار ہے۔

مظہر امام کی نظمیں انداز پیش کش کے اعتبار سے بھی انفرادو امتیاز کی حامل ہیں۔ ان کی اکثر نظموں میں وحدت تاثر کے ساتھ ساتھ خود کلامی کی کیفیت پائی جاتی ہے جس کے سہارے وہ فرد کے باطن تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دوران وہ علامتوں اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں لیکن ایسی علامتیں اور استعارے جو قابل فہم ہوتے ہیں اور نظم کی ترسیل میں کسی قسم کا خلل پیدا نہیں کرتے۔

ہیئت کے اعتبار سے مظہر امام کی نظمیں متنوع اقسام کی ہیں۔ انھوں نے پابند، آزاد نظمیں لکھیں اور سانیٹ، ترائلے کے تجربے بھی کیے۔ مسدس بھی لکھے اور غزل کے فارم میں بھی نظمیں کہیں۔ مروجہ بحروں میں ارکان کی کمی و بیشی کے ذریعے بھی نظموں میں جدت پیدا کی۔ گویا نظم کے بندوں، بحروں یا مصرعوں کی ترتیب وغیرہ میں انہوں نے سکہ بند طریقوں پر انحصار نہیں کیا۔

مظہر امام نے طویل نظمیں بھی لکھیں اور مختصر بھی۔ مگر ہر قسم کی نظم میں ایجاز، اختصار، تہہ داری اور جامعیت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ ان کی ایک مختصر نظم دیکھیے۔

بکھرا بکھرا/ الجھا الجھا/ ٹوٹا ٹوٹا/ کھویا کھویا
ٹیلی ویژن پر ایک چہرہ/ اپنا چہرہ مانگ رہا تھا
(آئینے سے ٹپکتا لہو: رشتہ گونگے سفر کا، ص 34، شب خون کتاب گھر، الہ آباد)

یہ چھوٹی سی نظم چند الفاظ پر مشتمل ہے مگر تاثیر اور جامعیت کے ساتھ معنوی تہہ داری کے لحاظ سے بڑی نظم کہلانے کی مستحق ہے۔ اس کی ظاہری ساخت سادگی کی حامل ہے مگر باطنی یعنی معنوی ساخت ایسی ہے جو نظم کے اختتام کے بعد بھی قاری کے ذہن میں سفر کرتی رہتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت آپ ان کی دیگر مختصر نظموں مثلاً اشتراک، بے ادب ستاروں سے، شعاع فردا کے رازدانو، وہ ایک بات، پوسٹ نہ ہونے والا خط اور کھلے آسمان کے نیچے وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مظہر امام نے اپنی نظموں کے لیے ایک دلکش، تازہ اور جاذب نظر اسلوب اختراع کیا ہے، ایک ایسا اسلوب جو ان کے ہم عصروں میں کسی کے پاس نہیں۔ یہ اسلوب رومانیت، روایت، ترقی پسندی، جدیدیت اور نئی شاعری کے خوبصورت آمیزے سے تیار ہوا ہے۔ اور یہی آمیزہ انھیں تاریخ نظم گوئی میں ایک مستحکم اور پائیدار فنکارانہ مقام عطا کرتا ہے۔

■

Dr.Shahab Zafar Azmi
Department of Urdu
Patna University,Patna 800005
shahabzafar.azmi@gmail.com
Mob.8863968168

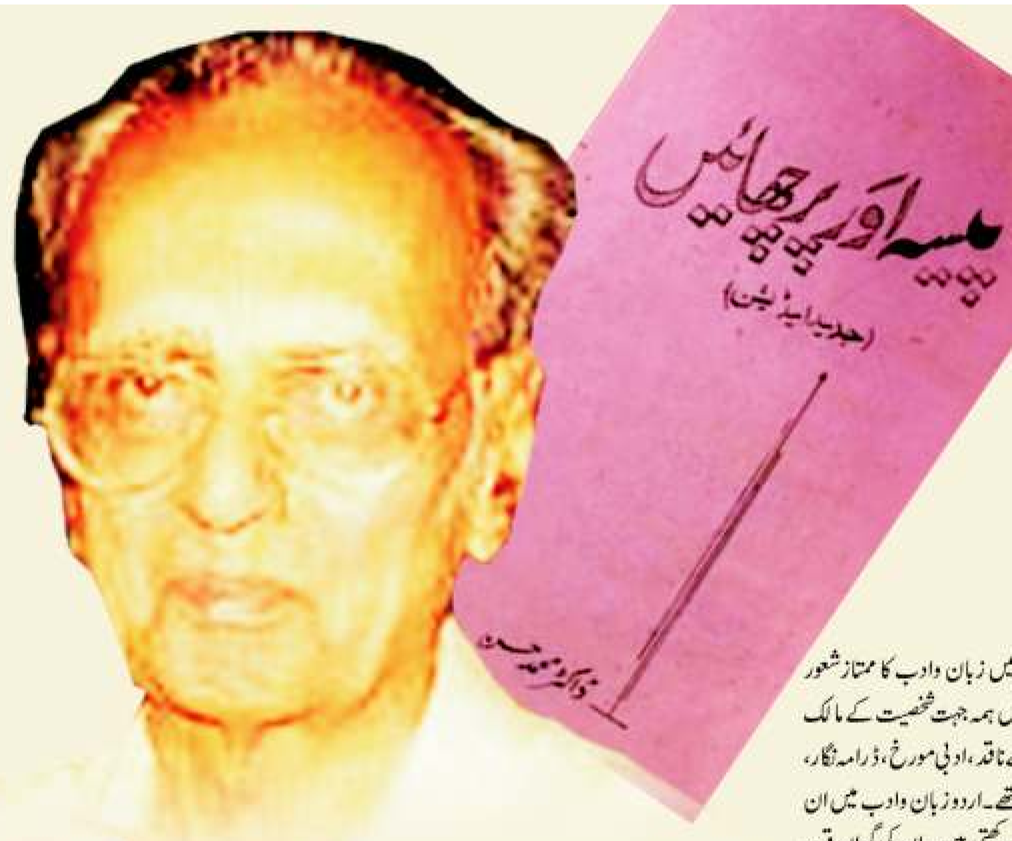

’پیسہ اور پرچھائیں‘ کے ڈراموں میں المناک تصویر

سرفراز جاوید

محمد حسن معاصرین میں زبان وادب کا ممتاز شعور رکھتے تھے۔ وہ اردو ادب میں ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک دانشور، بڑے ناقد، ادبی مورخ، ڈرامہ نگار، ناول نگار، شاعر اور صحافی تھے۔ اردو زبان وادب میں ان کی نگارشات استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی گراں قدر علمی وادبی خدمات توجہ طلب ہیں۔ ان کی اعلیٰ تخلیقات اور تنقیدی آرا کی معنویت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ ان کے یہاں بے جا لفاظی اور ادعائیت نہیں ہے۔ وہ ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ انھوں نے اپنے انتقادی مضامین میں معتدل طرز فکر سے کام لیا ہے۔ وہ ایک تخلیق کار بھی ہیں۔ انھیں اردو ڈرامہ نگاری میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ اردو ڈرامہ نگاری کو ان کے ڈراموں نے اعتبار و وقار عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کے ڈرامے اپنی اہمیت و معنویت کی رو سے اردو نصاب کا حصہ بھی بنے ہیں۔ ان کے بیشتر ڈرامے فکر وفن کی معراج ہیں۔ ان میں انسانی جذبہ واحساس اور معاشرے کی بڑی خوب صورت ترجمانی پائی جاتی ہے۔

پروفیسر محمدحسن کی ڈرامائی تخلیقات کا آغاز ترقی پسند افکار و خیالات کے ماحول میں ہوا. یہی وجہ ہے ان کی تخلیقات میں ترقی پسند تحریک کی اجتماعی فکر کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں. زیرقلم مضمون میں خاص طور سے ان کے ریڈیائی ڈراموں میں ابھری المناک اور تشویشناک تصویر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے.

پروفیسر محمد حسن کی ڈرامائی تخلیقات کا آغاز ترقی پسند افکار و خیالات کے ماحول میں ہوا۔ یہی وجہ ہے ان کی تخلیقات میں ترقی پسند تحریک کی اجتماعی فکر کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ زیر قلم مضمون میں خاص طور سے ان کے ریڈیائی ڈراموں میں ابھری المناک اور تشویشناک تصویر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ انھوں نے ریڈیائی ڈراموں کی تخلیقات سے قبل روزی روٹی کے لیے معروف انگریزی اخبار پائنیر میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ اسی دوران ریڈیو لکھنؤ سے وابستہ ہونے کا بھی موقع میسر آیا۔ تو ان کا طبعی میلان ڈرامے اور ریڈیو فیچر لکھنے پر متوجہ ہو گیا۔ ان کے ڈرامے اور فیچر لکھنؤ ریڈیو سے نشر ہونے لگے۔ تو ان کا تخلیقی جوہر پروان چڑھنے لگا۔ جس سے ان کو ڈرامہ نگاری کے میدان میں وقار اور استحکام حاصل ہو گیا۔

محمد حسن نے نوجوانی کے دوران ڈرامہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ لیکن اس عمر میں بیدار مغزی کا یہ عالم کہ ان کی تخلیقات فکر وفن کے ساتھ بہتر معاشرے کی تشکیل کا خواب سجوئے ہوئے تھیں۔ یہی سبب ہے ان کے عہد جوانی کی تخلیقی نگارشات بھی اپنے دور کی ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی صورت حال کی بھرپور تصویر کشی کرتی ہیں۔ کیونکہ ان میں بنی نوع انسان کی معاشرتی زندگی کے عصری مسائل کا عکس پایا جاتا ہے۔ ان کے ڈراموں کے مطالعے سے قارئین کی فکر کو تقویت ملتی ہے۔ مزید غور وفکر کے ذہنی در بھی وا ہوتے ہیں۔ اور قاری کی معاشرتی مسائل پر توجہ مرکوز ہو جاتی ہے۔ محمد حسن نے بیشتر اپنی تخلیقات میں خاص طور سے اظہار ذات پر سماجی

مسائل و معاملات کی ترجمانی کو مقدم رکھا ہے۔ ڈرامہ نگاری میں ان کی پہچان 1955 میں ریڈیائی ڈراموں کے مجموعہ 'پیسہ اور پرچھائیں' کے منظر عام پر آنے سے ہوئی۔ اس مجموعے میں 9 ڈرامے ہیں۔ یہ تمام ڈرامے اپنے موضوعات اور فکر کے اعتبار سے امتیاز کے حامل ہیں۔ جن میں سماجی زندگی کے مسائل کے ساتھ تاریخی، تہذیبی، ثقافتی امور بھی پائے جاتے ہیں۔

دراصل بنی نوع انسان کی حیات وزیست میں المیہ کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ بیشتر حادثات وسانحات انسان کو المناک وافسوسناک انجام سے دوچار کرتے ہیں اور یہ خاکی بشر منھ تکتے ہوئے قدرے حیرت وافسوس کی کیفیت کا مجسمہ بن کررہ جاتا ہے۔ 'پیسہ اور پرچھائیں' مجموعے کے تمام ڈرامے فکر وفن اور معنویت کے اعتبار سے بڑے اہم ہیں۔ اس کے بیشتر ڈرامے المناک و افسوسناک واقعات پر انجام کو پہنچے ہیں۔ 'پیسہ اور پرچھائیں' ڈرامہ موضوع کے اعتبار سے پیسے کی اہمیت کو پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں مادی عیش وآسائش کے وسائل انسان پیسے کی بدولت حاصل کرتا ہے۔ مگر انسانی زندگی کی خوشی کے لیے بہت سے وسائل پیسے سے بھی فراہم نہیں کیے جاسکتے۔

اس ریڈیائی ڈرامہ میں رامو، رگھو، بیدار بخت اور ریحانہ اہم کردار ہیں۔ بیدار بخت اپنی ہم جماعت دوست ریحانہ کے عشق میں گرفتار ہے۔ وہ اسے اپنی رفیق حیات بنانے کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ اسے خالی محبت کے سہارے پانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ریحانہ کے یک طرفہ عشق میں گرفتار ہے۔ وہ اپنے خیالی منصوبہ کے تحت اس سے ملاقات کی خاطر بمبئی کے ایک ہوٹل میں وقتی قیام کرتا ہے۔ اس کے پاس ہوٹل کا بل ادا کرنے کے لیے پیسے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ منیجر کو منی آرڈر کے آنے کا فریب دے کر، ہوٹل میں مزید کافی وقت قیام پذیر رہتا ہے۔ ریحانہ رئیس باپ کی بیٹی ہے جو مادی عیش وآرائش کی دلدادہ ہے۔ دنیاداری کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ وہ بیدار بخت سے دوران تعلیم کالج میں گہری دوستی رکھتی تھی۔ کیونکہ بیدار بخت سول امتحان کی تیاری کرتا تھا۔ ریحانہ کو یہ امید بھی تھی کہ وہ سول کے مسابقتی امتحان میں کامیاب ہو کر اچھے عہدے پر فائز ہو جائے گا۔ اسی کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے اس نے دوران تعلیم بیدار بخت سے ازدواجی زندگی میں منسلک ہونے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ بیدار بخت عشق اور وعدہ کے باعث اس کا پیچھا کرتا ہے۔ مگر دونوں کے لیے یہ وعدہ خواب بن کر رہ گیا۔ ریحانہ ہوٹل میں اس سے ملنے کے لیے ضرور تشریف لاتی ہے۔ مگر وہ اب اس کی رفیقۂ حیات بننے سے انکار کر دیتی ہے۔ کیوں کہ ریحانہ کو عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کے لیے وافر دولت تو کجا روزی روٹی کا معقول ذریعہ بھی نظر نہیں آتا۔ بیدار بخت داستانی کردار کی طرح محنت مزدوری سے اسے شہزادی بنانے کا بھروسہ دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ریحانہ آدمی کی عام معاشرتی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے۔ کیونکہ دنیا میں دولت و پیسہ سے عیش وعشرت کے بہت سے وسائل آسانی سے میسر آجاتے ہیں۔ بیدار بخت کی حیثیت ایک کنگال شخص کی سی ہے۔ ایسے میں ریحانہ کا رویہ اور دوٹوک جواب بیدار بخت کو بڑی المناک صورت حال سے دوچار کرتا ہے۔

ریحانہ کے جوابی مکالموں پر توجہ دیجیے:

'ریحانہ: وہم نرا وہم۔ تم خوابوں کی وادی میں چل رہے ہو اور سوتے میں چلنا خطرناک ہوتا ہے.........

ریحانہ: اب تم بے کار ہو۔ نوکر ہو بھی جاؤ تو دو تین سو روپے کے۔ میں اپنے سارے شوق، آرٹ، حسن مطالعہ اور سیر وتفریح سب کو دفن کر کے صرف تمہاری محبت کا وظیفہ پڑھوں کیا۔ تم اسے پسند کرو گے؟

(کلیات محمد حسن کے ڈرامے، مرتب، انور پاشا، ص 52)

ڈرامہ نویس نے تخیل کے ذریعے بیدار بخت عاشق سے ریحانہ کے باطن کی ایسی تصویر کشی کرائی ہے کہ اس کا جوخواب دولت کی بدولت اتار چڑھاؤ یعنی رنگ بدلتا ہے۔ وہ اپنے خوابوں کو بروئے کار دیکھ رہی ہوتی ہے۔ لیکن عاشق اس کے روبرو اس کی باطنی حقیقت بیان کرتا ہے۔ توریحانہ اپنے خوابوں کو براہ راست ٹوٹتا ہوا دیکھتی ہے۔یہ واقعہ اس کے لیے المیہ ثابت ہوتا ہے۔

عاشق کو معشوق کی ایسی باتیں کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ وہ دولت کی کمی کے باعث محبوب کو پانے میں مجبور محض ہے۔ عاشق کی کنگالی محبوب کے روکھے پن اور بے وفائی سے سامنا کراتی ہے۔ جو عاشق کے دل ودماغ میں المناک صورت حال پیدا کرتی ہے۔ مزید جس میں محبوب کی صرف خودغرضی اور مادہ پرستی شامل ہو۔ تو ایسی باتیں سن کر عاشق کو کتنا افسوس ہوگا۔ نوجوان بیدار بخت کو ریحانہ کی طرز فکر سے گہرا صدمہ پہنچتا ہے۔ وہ پیسے کی خاطر مجبور محض جیب کتروں کے گروہوں کی معاونت کرتا ہے۔ جس سے ایک روز اس کے پاس بہت ساری رقم آجاتی ہے۔ وہ پھر ریحانہ کو ہوٹل میں ملاقات کے لیے مدعو کرتا ہے۔ وہ ملنے آتی ہے تو بیدار بخت کے پاس کافی رقم دیکھ کر پگھل جاتی ہے۔ اور بیدار بخت کے تعلق سے اپنی رائے بھی تبدیل کر لیتی ہے۔ ریحانہ میں یہ تبدیلی دولت اور عیش ونشاط کے خواب کی خاطر آتی ہے۔ مگر ریحانہ کی طرز فکر کی بدولت بیدار بخت کا باطن قطعی تبدیل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خودغرض، لالچی اور مادہ پرست دوشیزہ ہے۔ جو محبت پہ دولت و پیسے کو فوقیت دیتی ہے۔ بیدار بخت کے ذہن میں ریحانہ کے مادہ پرست اور خودغرضانہ رویے سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ریحانہ سے مخاطب ہو کر دوٹوک انداز میں اس کی ذہنیت کی تصویر پیش کرتے ہوئے اپنا عندیہ ظاہر کرتا ہے:

'نوجوان: پہلا راز، کہ روپیہ کا یہ انبار تمہاری ان مسکراہٹوں اور عنایتوں کو خرید سکتا ہے، جن کا میں نے تمام عمر کی عبادت سے سودا کرنا چاہا تھا اور ناکام رہا اور آج جب تمہارا حسن میرے سامنے ایک بکنے والا مال تجارت ہو گیا ہے اور ایک بھکاری کی طرح سجدہ ریز ہے، مجھے تم

دراصل بنی نوع انسان کی حیات و زیست میں المیہ کا بڑاگہرا تعلق ہے۔کیونکہ بیشتر حادثات وسانحات انسان کو المناک و افسوسناک انجام سے دوچار کرتے ہیں اور یہ خاکی بشر منہ تکتے ہوئے قدرے حیرت وافسوس کی کیفیت کا مجسمہ بن کررہ جاتا ہے۔ 'پیسہ اور پرچھائیں' مجموعے کے تمام ڈرامے فکر وفن اور معنویت کے اعتبار سے بڑے اہم ہیں۔ اس کے بیشتر ڈرامے المناک و افسوسناک واقعات پر انجام کو پہنچے ہیں۔ 'پیسہ اور پرچھائیں' ڈرامہ موضوع کے اعتبار سے پیسے کی اہمیت کو پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں مادی عیش و آسائش کے وسائل انسان پیسے کی بدولت حاصل کرتا ہے۔ مگر انسانی زندگی کی خوشی کے لیے بہت سے وسائل پیسے سے بھی فراہم نہیں کیے جاسکتے۔

سے نفرت ہے۔ وہ پاک جذبہ مرچکا ہے، جو ہمارے لیے پھولوں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔ وہ ریحانہ جو میرا خواب تھی، آج مرگئی۔' (ایضاً،ص 63)

ڈرامہ نویس نے تخیل کے ذریعے بیدار بخت عاشق سے ریحانہ کے باطن کی ایسی تصویر کشی کرائی ہے کہ اس کا جوخواب دولت کی بدولت اتار چڑھاؤ یعنی رنگ بدلتا ہے۔ وہ اپنے خوابوں کو بروئے کار دیکھ رہی ہوتی ہے۔ لیکن عاشق اس کے روبرو اس کی باطنی حقیقت بیان کرتا ہے۔ تو ریحانہ اپنے خوابوں کو براہ راست ٹوٹتا ہوا دیکھتی ہے۔ یہ واقعہ اس کے لیے المیہ ثابت ہوتا ہے۔

اس ریڈیائی ڈرامہ میں رامو کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے بمبئی شہر جاتا ہے۔ وہ وہاں محنت ومشقت سے روزی روٹی کماتا ہے۔ مگر سوئے اتفاق کارخانے میں ملازمین کی چھٹنی کے باعث اسے باہر کا راستہ دیکھنا پڑتا ہے۔ رامو کے لیے نوکری کا چھوٹنا بڑی پریشانی کا سبب بن جاتا ہے۔ کیونکہ اسے روزی روٹی کی فراہمی کے ساتھ ماں کی دوادارو بھی کرانی ہوتی ہے۔ وہ نوکری چھوٹنے کی وجہ سے مقروض ہوجاتا ہے۔ اسے ماں کے علاج میں بھی انتہائی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ وقت پر ماں کی دوادارو بھی نہیں کراپاتا۔ وہ پریشانی کے عالم میں مجبور محض ہوتا ہے۔ تو اسی دوران اس کی ملاقات رگھو سے ہوجاتی ہے۔ وہ اس کی چال کے آس پاس ہی رہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے شناسا بھی ہیں۔ مگر رامو کو رگھو کے پیشے سے قطعی واقفیت نہیں ہے۔ رگھو رامو سے ملاقات کے بعد اس کی ابتر حالت سے واقف ہوجاتا ہے۔ تو وہ نہ صرف اسے کام دلانے کی بات کرتا ہے بلکہ انسانی اور اخلاقی بنیاد پر اسے کھانا کھلاتا ہے۔ مزید خرچہ کے لیے کچھ روپے بھی دے دیتا ہے۔ رامو اس کے حسن معاملات سے بہت خوش ہوتا ہے مگر جب اسے کام کے تعلق سے معلوم ہوتا ہے تو وہ غیر اخلاقی اور برے پیشے کے باعث نہ صرف رگھو سے منع کرتا ہے بلکہ اس کی رقم بھی لوٹا دیتا ہے۔ مگر رامو دوچار دن میں ہی کام نہ ملنے، ماں کا علاج نہ ہونے اور قرض خواہوں کے تقاضوں سے تنگ آکر پھر رگھو کے پاس جاتا ہے۔ جس کی رگھو کو بھی امید تھی۔ رامو جیب تراشی کا پیشہ کرنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے۔ وہ اس دھندے میں ملوث ہوجاتا ہے۔ تو وہ اس پیشے کے سبب دیر سویر گھر پہنچنے لگتا ہے۔ تو ماں اس سے ایک دن معلوم کرتی ہے کہ بیٹا آج دیر سے کیوں آیا ہے؟ وہ بیمار ماں سے ادھر ادھر کے بہانے بنا دیتا ہے۔ مگر ایک ماں بیماری کی حالت میں بھی بیٹے کے چال چلن پر توجہ دیتی ہے۔ اور بیٹے کو کسی غلط پیشے میں ملوث نہ ہونے کی نصیحت بھی کرتی ہے۔ لیکن رامو اپنی ضروریات زندگی اور ماں کی دوا دارو کے لیے مجبوراً یہ پیشہ اختیار کرلیتا ہے۔ جب وہ ایک روز موٹی رقم مارنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ تو وہ ماں کی دوا دارو اچھے ڈھنگ سے کرانے کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے اور بہت خوش ہوتا ہے۔ اس کے دماغ میں بہتر خیالات ابھرتے ہیں۔ وہ اب اس پیشے سے تائب ہوکر کوئی اپنا کام کر کے اچھی زندگی گزر بسر کرے گا۔ مگر جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اس کی ماں دوا نہ ملنے کے باعث مرجاتی ہے تو اسے انتہائی صدمہ ہوتا ہے۔ رامو کو ماں کی موت ایک المیہ کی صورت سے دوچار کرتی ہے۔ رامو جس فعل کو برا سمجھتا تھا مگر مجبوری میں اسے اختیار کرنا پڑا۔ ماں کی موت پر اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ تو وہ اپنے جرم کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

'رامو: ماں جی مرگئی۔ اپن نے اسے مار ڈالا۔ انسپکٹر صاحب اپن نے اسے مار ڈالا۔ ہمیں پھانسی دے دو۔ ہم جیب کاٹ نہیں ہے۔ خونی ہے۔ بھگوان قسم ہم خونی ہے۔ اپن تم سے بھیک مانگتا ہے۔ انسپکٹر صاحب ہمیں پھانسی دے دو بھگوان کے لیے پھانسی دے دو۔' (ایضاً،ص 64)

ڈرامہ 'سرخ پردے' میں ریحانہ، نصیبن، جاوید، وقار، نواب اور بیگم کے کردار ہیں۔ ڈرامے کا موضوع اشرافیہ طبقے کے زمیندار گھرانے کا جھوٹا وقار وعظمت ہے۔ وہ سماج میں خاص مقام کے غرور میں بہن بیٹیوں اور اولاد کے رشتے تنگ دستی کی حالت میں بھی معاشرتی معیار کے اعتبار سے کمتر ذات والے، مرفہ الحال اشخاص کے یہاں کرنا بھی گوارا نہیں کرتے، لڑکیاں دوشیزگی میں ہی عمر گزار دیتی ہیں اور جوانی کی آسودگی سے محروم رہ جاتی ہیں۔ وہ بھی خاندانی شرافت وعزت کے فریب میں چہار دیواری کی گھٹن میں مرجاتی ہیں۔ ریحانہ کی بہن دولت مند بوڑھے شخص کی زوجیت پر خودکشی کو ترجیح دیتی ہے۔ یعنی وہ خاندان کے جھوٹے وقار کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ جس کی روح آسیب بن کر حویلی کے ایک کمرہ میں اثر رکھتی ہے۔ عموماً اس کمرے میں جانے والے پر بھی اثر ہوجاتا ہے۔ آواز کے ذریعے ریحانہ کی بہن کا المیہ سنیے:

'آواز: تو میری جوانی بیت چکی تھی اور میں نے اس بوڑھے دولت مند کے ہاتھوں بکنا پسند نہیں کیا اور خودکشی کرلی (ہنستی ہے) مگر یہ سب باتیں تو معلوم ہیں اور اب (طنزیہ ہنسی) اور اب تمہاری جوانی بیت رہی ہے۔ تمہارا راستہ بھی شاید وہی ہے جو میرا تھا۔ نصیبن بوا سچ کہتی ہیں۔ اس گھر میں شہنائیاں نہیں بجیں گی۔ یہاں کسی کا سہاگ نہیں سجے گا۔ آؤ میرے راستے پر آؤ (قہقہہ) آؤ، برات میرا انتظار کررہی ہے۔' (ایضاً،ص 67)

ریحانہ اپنے خوابوں کے مسیحا جاوید کی خاطر نصیبن بوا کی بات کو نظر انداز کردیتی ہے اور کمرے کو درست کرنے چلی جاتی ہے جو کافی عرصے سے بند ہے۔ ریحانہ اس کمرے میں جانے کے بعد آسیبی اثر کے باعث بے ہوش ہوکر گر جاتی ہے۔ تو اس کے پاس نصیبن، بیگم، وقار اور گھر کے بہت سے افراد جمع ہوجاتے ہیں۔ وہ سب اس کے لیے دعا کرتے کراتے ہیں۔ ریحانہ ہوش میں آجاتی ہے۔ تاہم جاوید کے رہنے سونے کا انتظام اسی کمرے میں کردیا جاتا ہے۔ نصیبن بوا اپنی عادت وفکر سے مجبور جاوید کو کمرے میں اثر ہونے کے تعلق سے سب باتیں گوش گزار کرتی ہیں۔ جاوید ان کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن جب وہ کمرے میں محو استراحت ہوتا ہے تو اسے وہی آواز سنائی دیتی ہے۔ جو ریحانہ کی مرحوم بہن رضوانہ کی ہوتی ہے۔ وہ جاوید سے مخاطب ہوکر گھر کے ماحول یعنی ریحانہ کی جوانی کی گھٹن اور وقار کی عیاشی سے باخبر کردیتی ہے۔ جیسے ہی جاوید خواب و نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ تو اس کے خوابوں کی رانی ریحانہ چائے لے کر حاضر ہوجاتی ہے۔ دونوں میں مختصراً رسمی گفتگو ہوتی ہے۔ وہ جلد ہی اصل مدعے پر آجاتے ہیں۔ یوں تو ریحانہ کمرے کے اثر وآسیب سے متعلق باتیں پردۂ خفا میں رکھنا چاہتی ہے۔ مگر جاوید کے اصرار پر کمرے سے وابستہ رضوانہ بہن کے المیے کی کہانی اشارے وکنایے میں بیان کردیتی ہے:

'ریحانہ: یہ سرخ پردے، یہ باسی پھول، یہ مسہری
(آہستہ آہستہ کہتی ہے)
یہ سارا کمرہ مجھے رضوانہ بہن کی یاد دلاتا ہے اور جب پچھلی بار یہاں آئی تو۔

جاوید: تو کیا ہوا؟

ریحانہ: تو مجھے یکا یک ان کی شادی یاد آئی، وہ ان کے دکھ اور ان کی خوف ناک موت یاد آئی۔' (ایضاً،ص 77)

جاوید گفتگو کے دوران ریحانہ سے بڑے مبہم انداز میں باہم شادی کے لیے پیش کش کرتا ہے مگر وہ اس کی بات سمجھ نہیں پاتی۔ اسی اثنا میں ریحانہ کا بھائی وقار فاتحہ کی رسم میں شرکت کے لیے انھیں بلانے آجاتا ہے۔ جاوید وقار کو کچھ دیر بیٹھنے کے لیے بولتا ہے اور اپنے دل کی بات یعنی ریحانہ سے اپنی شادی کے متعلق عرض کرتا ہے۔ وقار خاندانی عزیز داری کی نسبت کی نزاکت سے یہ سن کر ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ وہ والد نواب صاحب سے دونوں کے باہمی انس ومحبت کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ نواب

صاحب یہ سن کرآگ بگولہ ہوجاتے ہیں۔اسی دوران جاوید بھی تشریف لے آتے ہیں۔تو نواب صاحب اور جاوید کے مابین بہت سی تلخ باتیں ہوتی ہیں۔نواب صاحب ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے جاوید سے چلے جانے کو کہہ دیتے ہیں۔تو جدید تعلیم یافتہ نوجوان جاوید نواب صاحب کوان کی جھوٹی اخلاقیات کے لیے آئینہ دکھاتا ہے:

'نواب: چلے جاؤ جاوید۔

جاوید: تمھارے قانون؟ تمھارے اخلاق یہ سب فریب ہیں،تم انسان کو جکڑنے کے لیے زنجیریں بناتے ہواور انھیں خوبصورت نام دیتے ہو۔اخلاق،مذہب،رسم ورواج،بس یہی تو ہے تمہارا سماج۔ مجھے بدبودار لاشوں سے ڈرنہیں لگتا۔میں صرف ان سے نفرت کرسکتا ہوں۔۔ آؤ ریحانہ چلیں۔' (ایضاً،ص82)

ڈرامہ نویس نے اپنے ترقی پسند نقطۂ نظر کے باعث نوجوان نسل کی فرسودہ رسم ورواج سے بغاوت کو پیش کیا ہے۔انھوں نے اس قضیے کو بڑے فن کارانہ انداز میں ایسا موڑ دیا ہے کہ نواب صاحب کی بیگم ان کو بہت سے واسطے دے کر منانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔مگر نواب صاحب اپنے جلال و جمال میں رام ہونے کے لیے تیارنہیں ہیں۔بیگم صاحبہ کا منت سماجت کرتے ہوئے ہی انتقال ہوجاتا ہے۔ان کی موت کا غیر متوقع المناک واقعہ نواب صاحب کی قلب ماہیت کردیتا ہے۔مگرنواب صاحب کی باطنی تبدیلی کے عملی اظہار سے قبل ایک شریف بیٹی جو کبھی باپ کے سامنے اف تک نہیں کرتی تھی۔وہ والدہ کی موت پر والد کے دوبدو تلخ لہجے میں گویا ہوتی ہے:

'ریحانہ: (سسکیاں بھرکر روتے ہوئے) تم نے انھیں مارڈالا۔نواب صاحب،تم نے میری ماں کی جان لے لی۔خاندان کی عزت کے رکھوالے،تم انھیں زندگی بھرخوش نہ کرسکے۔ان کو عمر بھرجلاتے رہے۔ان کو اپاہج کرکے بھی تمھیں چین نہیں آیا تھا۔

ڈرامہ نویس نے اپنے ترقی پسند نقطۂ نظر کے باعث نوجوان نسل کی فرسودہ رسم ورواج سے بغاوت کو پیش کیا ہے۔انہوں نے اس قضیے کو بڑے فن کارانہ انداز میں ایسا موڑ دیاہے کہ نواب صاحب کی بیگم ان کو بہت سے واسطے دے کر منانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔مگر نواب صاحب اپنے جلال و جمال میں رام ہونے کے لیے تیارنہیں ہیں۔

لواب تو چین آگیا... میری امی... میری امی... میری امی!!' (ایضاً،ص84)

جاوید موقع کی نزاکت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چچی بیگم کے سانحہ ارتحال پر ان کو بڑے سنجیدہ اور پراثر الفاظ کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرتا ہے:

'جاوید: چچی،محترم خاتون! تمھاری روح کو لاکھ لاکھ سلام،تمہارا جسم عمر بھر پتھر کی دیواروں میں قید رہا،لیکن تمہارے پہلو میں ایک مغل کا دل تھا،جسے کوئی فتح نہ کرسکتا تھا۔' (ایضاً،ص84)

نواب صاحب بیگم کی حادثاتی موت پر ایک حقیقی احساس سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ قلبی طور پر حسرت وافسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ مزید احساس جرم انھیں شرمندہ بھی کرتا ہے۔وہ بیگم کی خواہش کے مطابق اسی وقت ریحانہ کا ہاتھ جاوید کے ہاتھ میں بطور رفیقہ حیات تھما دیتے ہیں۔نواب صاحب یہ نیک کام بیگم کے خاکی جسم کو مخاطب کرتے ہوئے انجام دیتے ہیں:

'نواب: بیگم بیگم،تم نے آج ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور ہم تمھاری آخری خواہش بھی پوری نہ کرسکے۔ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے تاکہ تمہاری روح کو سکون مل سکے۔

جاوید اپنا ہاتھ لاؤ،ریحانہ بیٹی!

ریحانہ: جی!

نواب: اپنا ہاتھ دو۔لو بیگم ہم تمہارے سامنے ان دونوں کے ہاتھ ملاتے ہیں۔

تم انھیں دعا دو۔' (ایضاً،ص84)

'سونے کی زنجیریں' یہ ڈرامہ موضوع کے اعتبار سے آصف الدولہ کے اودھ کے پرآشوب دور کی المناک وافسوسناک صورت حال کو پیش کرتا ہے کیوں کہ اس عہد میں ایسا قحط پڑا،جس میں روزی روٹی کے لیے اشراف واجلاف کا بُرا حال تھا۔لکھنؤ کے بہت سے اشرافیہ اشخاص بھی رات میں چھپ کر محنت ومزدوری کرنے پر مجبور تھے۔

نظیر اکبرآبادی اور نقش فریادی ڈرامے اردوادب کی تاریخ کے دوبڑے شاعروں کی حیات وشخصیت کی مختصر عکاسی کرتے ہیں مگران میں المیے کی کوئی صورت حال پیش نہیں آتی۔اکبر اعظم بھی اکبر کی رواداری اورانسانیت دوستی کا مظہر ہے۔اس میں بھی کوئی المناک واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔'انسپکٹر جنرل' ڈرامہ میں بھی کوئی المناک واقعہ نہیں ہے۔ ہاں شہر کا میئر اورسرکار کے کارکنان ایک شخص کو انسپکٹر جنرل سمجھ کرنفسیاتی دباؤ میں فریب کھا کرضرور ٹھگے جاتے ہیں۔

'حکم کی بیگم' المیے کی تصویر پیش کرتا ہے۔جس میں تاش کے پتوں کے کھیل کی بازی کے ذریعے روپیہ داؤ پر لگایا جاتا ہے۔ڈرامہ میں ایک بوڑھی عورت کاؤنٹس کا اہم کردار ہے۔وہ ایک روز بڑی رقم تاش کے کھیل میں ہار جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے اس کی ادائیگی کے لیے کہتی ہے مگر وہ اس بڑی رقم کی ادائیگی سے صاف انکار کردیتا ہے۔کاؤنٹس اپنے ایک دوست کے یہاں بطور ادھار رقم کے لیے جاتی ہے۔وہ اس کو رقم دینے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔مگر وہ شخص کاؤنٹس کی ہمدردی میں رقم دینے کے بجائے اس کو تاش کے پتوں کا ایک ایسا راز بتاتا ہے۔جس کے ذریعے کاؤنٹس تمام ہاری ہوئی رقم دوبارہ جیت لیتی ہے۔

ڈرامہ میں ہرمان نام کا ایک کردار تاش کھیلنے والوں کے پاس بیٹھ کر ان کا کھیل دیکھتا ہے مگر عملی طور پر تاش نہیں کھیلتا اورنہ ہی کسی بازی میں داؤ پر کوئی رقم لگاتا ہے۔ جب ایک روز اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھی کاؤنٹس کے پاس تاش کے پتوں کا ایساراز ہے کہ کھیلنے والا کبھی بازی نہیں ہارتا۔ وہ اس راز کو جاننے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔وہ کاؤنٹس کے محل تک رسائی کے لیے تدبیر کرتا ہے۔وہ بوڑھی کاؤنٹس کی خادمہ سے عشق لڑاتا ہے۔وہ اپنی محبت میں کسی نوجوان کو پہلی بار دیکھتی ہے۔تو اندرونی طور پر اچھا محسوس کرتی ہے۔وہ فریب عشق میں ہرمان سے ملاقات کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔وہ ملاقات کی خاطر ہرمان کو محل میں رسائی کی تدبیر اور وقت بتاتی ہے۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق بڑا رسک لیتا ہے۔مگر محل کے اندر کاؤنٹس کے کمرہ میں پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔جب دیر رات کاؤنٹس ایک پروگرام سے واپس آتی ہے۔ وہ کمرے میں جیسے ہی بستر پر لیٹتی ہے تو ہرمان کاؤنٹس کے پاس پہنچ کر راز معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ شروع میں بہت منت سماجت کرتا ہے۔مگر وہ بتانے کے لیے راضی نہیں ہوتی،تو وہ آخر میں پستول سے ڈرا کر راز اگلوانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔بوڑھی کاؤنٹس خوف کھا کر بغیر راز بتائے مرجاتی ہے۔ہرمان کاؤنٹس کی حادثاتی موت سے بے حد دکھی ہوتا ہے۔وہ حسرت وافسوس کے عالم میں ذہنی اضطراب کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ اسی ذہنی کیفیت کے عالم میں کاؤنٹس کی تجہیز وتکفین کے موقع پر آخری دیدار کے لیے پہنچتا ہے۔تو وہ وہاں پر ذہنی کرب کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہوکر گر جاتا ہے۔یہ حادثہ اس کے دل ودماغ پر اس قدر اثر کر جاتا ہے۔کہ وہ ہر وقت حسرت وافسوس کی حالت سے دوچار رہتا ہے۔ ہرمان کے اس قدر پچھتاوے اور توبہ کے باعث ایک روز بوڑھی کاؤنٹس اس کے خواب میں حاضر ہوتی ہے۔تو وہ اسے نہ صرف معاف کرتی ہے بلکہ تاش کے پتوں کا راز بھی بتا دیتی ہے۔ وہ اس روز سے کسی قدر معمول کی زندگی

گزارنے لگتا ہے۔مگراپنے لائحہ عمل کے تحت دیرینہ عیش وعشرت کی خواہش کو بروئے کارلانے کے لیے تاش کے کھیل میں بازی لگانے کا موقع تلاش کرتا ہے۔ جوا سے مل بھی جاتا ہے۔ وہ دودن میں ستا اور اکا کے داؤ پر موٹی رقم کی بازی جیت لیتا ہے۔ جس کا شہرہ پورے شہر میں پھیل جاتا ہے۔ تیسرے روز پھر ہرمان اپنے راز کے مطابق ایک بڑی رقم کو داؤ پر لگاتا ہے اور غیر متوقع طور پر چشم زدن میں بازی ہار جاتا ہے۔وہ اس ناکامی کے باعث حسرت وافسوس کا مجسمہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ڈرامہ نویس نے ہرمان کی کیفیت کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

'ہرمان: حکم کی بیگم، حکم کی بیگم، اکا نہیں آیا، اکا نہیں آیا تیرے پاس، حکم کی بیگم اوہو، دیکھو کیسی آنکھیں چڑھاتی ہے حکم کی بیگم۔ ڈائن چڑیل، بڑھیا، حکم کی بیگم، کاؤنٹس (قہقہہ) بڑھیانے مجھے دھوکا دیا ہے۔ (قہقہہ) تریا۔ ستا، اکا، تریا۔ ستا، اکا، بیگم (قہقہہ) کاؤنٹس، کاؤنٹس (بہت زیادہ چیخ کر) تریا، ستا، اکا، تریا، ستا، حکم کی بیگم۔' (ایضاً،ص 186)

ڈرامہ نویس نے انسانی نفسیات کے ایک ایسے پہلو کی تصویر کشی کی ہے۔ جس کو وہ عیش وعیاشی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے۔ وہ دولت کے حصول کے لیے بہت ہی سہل طریقہ بروئے کارلانے کا خواہش مند رہتا ہے۔ ہرمان تاش کے کھیل یعنی اس جوئے کے ذریعے بڑی دولت کمانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے لائحہ عمل کے مطابق تاش کے پتوں کا راز پا بھی لیتا ہے۔مگر وہ سوءِ قسمت ایسے انجام کو پہنچتا ہے جو نہ صرف اس کے خوابوں کو چکنا چور کرتا ہے۔ بلکہ اس کی زندگی تباہی و بربادی کے المیے کی تصویر بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اب جس کی بھرپائی نہیں کرسکتا۔

'معمارِ اعظم' ڈرامہ اپنے انجام کے اعتبار سے المیہ کی صورت حال پیش کرتا ہے۔ جس میں سول نس معمار اعظم کا کردار ہوتا ہے۔ وہ اپنے مالک کی بدقسمتی سے اس کے کاروبار کا مالک بن جاتا ہے۔ سول نس کی قسمت کا کرشمہ کہیے کہ اس کا سابق مالک برودک اور اس کا بیٹا راگ نر بھی اس کے یہاں کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت دونوں باپ بیٹے ہی اس کے کاروبار کی ریڑھ کی ہڈی بھی ہوتے ہیں۔ وہ برودک کے بیٹے راگ نر کو اپنے کاروبار سے کسی بھی طرح مستعفی نہیں کرنا چاہتا۔ جب کہ برودک نے متعدد بار اس سے یہ التجا بھی کی ہے۔ کہ وہ بیٹے راگ نر کے بارے میں چند تعریفی کلمات لکھ دیں، تو وہ اپنا الگ کام کرلے۔ سول نس اس بات پر اپنے سابقہ مالک برودک سے خفگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا یہ رویہ برودک کے لیے ایک المیہ ہی کی مانند ہوتا ہے۔ جو شخص اس کے

پروفیسر محمد حسن کواردو ڈرامہ نگاری میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ان کے ڈرامے فکرو فن اورپیش کش کے ساتھ تاریخ، تہذیب، ثقافت اورسماجی مسائل کے عکاس ہیں۔ جن پر بھرپور تنقیدی و تجزیاتی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر ان کی ڈرامائی تخلیق پر ہنوز کماحقہٗ تو کجاخاطر خواہ بھی کام نہیں ہوا ہے۔

یہاں کبھی نوکری کرتا تھا۔ وہ آج ایک بڑا معمار بن کر اپنے سابقہ مالک کو غصہ دکھاتے ہوئے، راگ نر کی صلاحیت کے برعکس عیارانہ طور پر کس طرح باتیں بناتا ہے:

'سول نس! (غصے میں) تو کیا تم سمجھتے ہو، وہ الگ کام چلانے کے قابل ہو گیا ہے۔ اسے ابھی کچھ بھی تو نہیں آتا۔ میرے پاس رہ کر اسے تھوڑا بہت نقشہ کشی تو آگئی ہے مگر اسی سے تو کام نہیں چل سکتا۔' (ایضاً،ص 189)

سول نس یہ رویہ برودک کے ساتھ اپنے کاروبار کی بقا کے لیے روا رکھتا ہے۔ برودک اس کے اس رویے سے دکھی ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر سول نس کے اس سلوک کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ اس کو اس کا ماضی یاد دلاتے ہوئے آئینہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے:

'برودک: مسٹر سول نس، جب آپ میرے دفتر میں کام کرتے تھے تو آپ بھی کاروبار کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے مگر اس کے باوجود اپنا کاروبار چلانے میں کامیاب ہوئے (مشکل سے سانس لے کر) اور آپ نے آگے بڑھنا چاہا، میرے کاروبار کو تہس نہس کر کے میرے اور میرے ایسے بہت سوں کو پاؤوں تلے کچل کر تو آپ آگے بڑھے تھے۔' (ایضاً،ص 189)

سول نس نے تعمیراتی کام میں بہت شہرت پائی۔ اس نے بہت سے گرجوں کے بلند مینار بھی تعمیر کیے۔ ان پر چڑھ کر ہار بھی پہنائے، ایک گرجا کے ہار پہنانے کے دوران ہلڈا نام کی چھوٹی سی لڑکی اس کی انتہائی عقیدت مند ہو جاتی ہے۔ جب ہلڈا نے ہار پہنانے کی رسم کے دوران سول نس سے ملاقات کی تھی۔ وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ سول نس نے اسے اپنی شہزادی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ مزید اسے شہزادی بننے کی خاطر دس سال انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے حسن عقیدت دس سال انتظار کیا۔ اس کے بعد وہ ایک روز اچانک سول نس کے دفتر پہنچ جاتی ہے۔ وہ سول نس کو ماضی کی کچھ باتیں یاد دلاتی ہے۔ سول نس اثبات میں ہامی بھرتا ہے۔ وہ اپنی کمزور سرشت اور لڑکی کی فریفتگی کے باعث خود اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ یوں تو وہ بوڑھے برودک کی درخواست پر راگ نر کے بارے میں تعریفی کلمات لکھنے سے گریز کرتا ہے۔ مگر ہلڈا کے کہنے سے لکھ دیتا ہے۔ ہلڈا اپنے معمار اعظم کو حسن عقیدت، گرجے کے مینار کی بلندی پر پھر دیکھنے کی خواہشمند ہے۔ سول نس ازراہ عشق ہلڈا کی بات کو لبیک کہتا ہے۔ اس تعلق سے ہلڈا کی راگ نر سے گفتگو ہوتی ہے۔ تو راگ نر وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ بلندی پر چڑھ نہیں سکتے اور نہ ہی کوئی طاقت انھیں بلندی پر چڑھا سکتی ہے۔ ہلڈا بھی یقین کے ساتھ کہتی ہے کہ میرا معمار اعظم بلندی پر چڑھے گا اور کلس کو ہار پہنائے گا۔ آخر کار ہلڈا کے حسن و جمال کے عشق میں سول نس مینار کی بلندی پر چڑھنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ آخر وہ وقت آ جاتا ہے۔ جب سول نس باجے گاجے اور جم غفیر کی موجودگی میں مینار کی بلندی پر چڑھ جاتا ہے۔ مگر اس کا جسم ایسا لرزا کھاتا ہے کہ وہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور خاکی جسم بھی پاش پاش ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا المناک حادثہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ عوام کی آواز میں درد اور افسوس ہوتا ہے مگر راگ نر اور ہلڈا اپنی اپنی بات پر تفوق جتلا رہے تھے۔ ڈرامہ نگار نے اس منظر کو کچھ اس طرح قلم بند کیا ہے:

'ایک آواز: بیچارے کا جسم پاش پاش ہو گیا۔ ٹھیک پتھروں کے اوپر گرے تھے۔

ہلڈا: اب وہ مجھے اس بلند چوٹی پر دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔

راگ نر: اوہ خدایا کس قدر دردناک حادثہ ہے۔ خیر وہ اپنا کام پورا کر کے نہ دکھا سکا۔

ہلڈا: (جوش میں) لیکن وہ ٹھیک چوٹی پر پہنچ گیا اور میں نے فضا میں بانسریوں کے نغمے کی آواز سنی۔ اس نے سب سے اونچی بلندی کو فتح کر لیا۔ میرا معمار اعظم۔' (ایضاً،ص 219)

پروفیسر محمد حسن کو اردو ڈرامہ نگاری میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کے ڈرامے فکر و فن اور پیش کش کے ساتھ تاریخ، تہذیب، ثقافت اور سماجی مسائل کے عکاس ہیں۔ جن پر بھرپور تنقیدی و تجزیاتی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر ان کی ڈرامائی تخلیق پر ہنوز کماحقہٗ تو کجا خاطر خواہ بھی کام نہیں ہوا ہے۔

■

Dr. Sarfaraz Javed
R-155, Gali No: 6, Sir Syed Road
Jogabai Ext., Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

محمد توقیر عالم راہی

اردو نصاب ہندوستان کے مدرسوں میں

ایک جائزہ

نصاب نہ صرف ملک کے تعلیمی نظام سے متعلق ہوتا ہے بلکہ طلبا کی کامیابی اور ناکامی میں بھی اس کا کردار ہوتا ہے۔ دراصل وہی نصاب مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتا ہے جو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین تعلیم کو فی زمانہ نصابی امور پر غور وخوض کرتے رہنا چاہیے تاکہ نصاب طلبا کے حق میں مفید رہے۔ نصاب مادری زبان کا ہو یا پھر بیرونی زبان کا، عمدگی سے اسے ترتیب دینا اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر تدریس میں کامیابی ممکن نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کامیاب تدریس ایک موزوں لائحۂ عمل پر مبنی ہوتی ہے جس کے تحت اغراض ومقاصد کا تعین کیا جاتا ہے۔ پھر ان مقاصد کے حصول کے لیے مناسب اقدامات کیے جاتے ہیں۔ انھی اقدامات میں نصاب بھی ایک اہم قدم ہے۔

نصاب کی تیاری میں ماہرین تعلیم کی رائے کی اہمیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ زمانے کے نشیب وفراز پر نظر رکھتے ہیں۔ تغیر پذیر حالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ پھر وہ لسانی مہارتوں، طلبہ کی ضروریات، دلچسپی، ماحول کے تقاضے اور قومی اقدار کے فروغ کو مدنظر رکھتے ہوئے اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ لیتے ہیں اور اس طرح کوئی پرکشش ومفید نصاب تیار ہو پاتا ہے۔ مدارس کے اردو نصاب پر گفت وشنید سے قبل نصاب کی تعریف پر توجہ مرکوز کرنا مناسب ہے۔

نصاب کی تعریف وتشریح مختلف ماہرین تعلیم نے مختلف طور پر کی ہے۔ ڈاکٹر صابرین نے نصاب کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

”مطالعے کے لیے درسی کتب کے منظور شدہ خاکے کو نصاب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یا ایک ایسا تعلیمی منصوبہ، جس کی تکمیل مخصوص منظور شدہ کتب کے خاکے کے مطابق اپنی مقررہ مدت میں عمل میں آئے نصاب کہلاتا ہے۔ یا تعلیم کا ایسا نظام جس میں مطالعے کے لیے وقت اور کتب دونوں کا تعین کیا گیا ہو، نصاب سے منسوب کیا جاسکتا ہے، یا ایک ایسا تدریسی منصوبہ جو ایک خاص مدت پر مشتمل ہو، نصاب سمجھا جاتا ہے، یا یہ کہ اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے مطالعے کا باقاعدہ منظور شدہ منصوبہ، نصاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک قسم کی تعلیمی منصوبہ بندی جس میں طلبہ کے ماضی اور حال کو نظر میں رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے مستقبل پر بھی نظر رکھی گئی ہو، نصاب کہلاتا ہے“۔

(ڈاکٹر محمد صابرین، یونیورسٹی درجات کے اردو نصابات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص 37، 1988)

ڈاکٹر صابرین نے نصاب کے مختلف پہلوؤں کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ مذکورہ اقتباس کی روشنی میں نصاب کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد ایک اچھے نصاب کے بنیادی ارکان کا تعین بھی تفہیم نصاب میں معاونت کرتا ہے۔ اساسی طور پر اچھے نصاب کے چار ارکان ہیں:

1. مقاصدِ تدریس
2. مضامینِ تدریس (جن کی تدریس کے ذریعے مقاصد کی تکمیل ممکن ہو سکے۔)
3. طریقۂ تدریس (تدریس کے لیے سوچا سمجھا طریقہ جس سے سیکھنے کا عمل آسان، دلچسپ اور مؤثر بن سکے)۔
4. اندازۂ قدر (Evaluation) یہ معلوم کرنے کا عمل کہ طلبہ کو سیکھنے کے عمل میں کس حد تک کامیابی ملی ہے، نیز اساتذہ تدریس کے عمل میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس عمل میں استاد کے ذریعے ’سبق کی منصوبہ بندی‘ اور ’طریقۂ تدریس‘ دونوں کی جانچ شامل ہے۔

مذکورہ چار ارکان کے تناظر میں ہندوستانی مدرسوں کے رائج اردو نصاب کا جائزہ لیا جاسکتا ہے تاہم یہ وضاحت لازمی ہے کہ مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس میں ایک طرف سیکولر اردو داخل نصاب ہے، وہیں اسلامیات کی تفہیم کے لیے اردو میں لکھی گئی کتابوں سے مدد لی جاتی ہے۔ گویا مدارس میں دو طرح کی اردو شامل ہے۔ سردست یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مدارس کی تعلیم کا بنیادی مقصد قرآن وحدیث کو مرکزی حیثیت دینا ہے، نیز اس کی روشنی میں طلبہ کی شخصیت کی ہمہ جہت نشو ونما کرنا ہے اور شخصیت کی یہ نشو ونما محض ایک پہلو پر توجہ دینے سے نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ دینی تعلیم کو بنیاد بناکر ہی نصاب تعلیم، تدریسی مقاصد، تدریسی مضامین، طریقۂ تدریس اور طریقۂ امتحان کا تعین کیا جائے تاکہ تعلیم سے فراغت کے بعد مدارس سے نکلنے والے افراد کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔

بہرحال، ایک اچھا نصاب وہ ہے جس کی روشنی اور

استاد کی رہنمائی میں متعینہ تجربات کی بنیاد پر طلبہ کی انفرادی ضروریات اور ملک کی اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لیے جملہ وسائل تعلیم کی مدد سے طلبہ کی شخصیت کی مکمل اور ہمہ جہت نشو ونما کی جائے۔

رہی بات مدرسہ بورڈوں میں اردو نصاب کی تو بہار اور اڑیسہ مدرسہ بورڈوں میں اردو زبان و ادب کی تعلیم تحتانیہ سے فاضل (پرائمری تا ایم اے) تک کے درجات میں دی جاتی ہے، جب کہ یوپی کے ملحقہ و امدادی مدارس میں ابتدائی درجات مولوی رُنشی (مساوی ہائی اسکول) اور عالم (مساوی انٹرمیڈیٹ) کے درجات میں اردو نصاب کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس آسام مدرسہ بورڈ کے ملحقہ مدارس میں ابتدائی درجات کے ساتھ ساتھ ثانوی درجات میں اردو نصاب شامل ہے۔ مغربی بنگال مدرسہ بورڈ کے تحت چلنے والے مدارس میں پرائمری درجات کے ساتھ سیکنڈری درجات میں بھی اردو زبان وادب داخلِ نصاب ہے۔

مدرسہ بورڈوں کے اردو نصاب کا یہ امتیازی پہلو ہے کہ وہاں ان ادبا اور شعرا کو شامل نصاب کیا جاتا ہے جن کی تخلیقات میں سیکولرازم کی روح بسی ہوئی ہو۔ مذکورہ کتب پر غور وفکر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نثری اور شعری دراصل وہی کتابیں مدرسہ بورڈوں میں پڑھائی جاتی ہیں جن سے شخصیت کی نشو ونما ہو سکے۔ بہ استثنائے آسام مدرسہ بورڈ، جس میں غیر ملحقہ مدارس کے اردو نصاب کی طرح مذہبی رعایتوں کے ساتھ اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب (اسمٰعیل میرٹھی) اور 'مسدس حالی' (حالی) وغیرہ بھی داخلِ نصاب ہیں۔ مذکورہ کتابوں کی روشنی میں یہ رائے قائم کرنا بھی مناسب ہے کہ مدرسہ بورڈوں میں سیکولر اردو داخل نصاب ہے۔

غیر ملحقہ مدارس کے اردو نصاب کی بات کی جائے تو اس کا مزاج بورڈ کے مدرسوں سے ذرا مختلف ہے۔ جیسا کہ مذکورہ سطور میں کہا گیا کہ مدارس کی تعلیم کا مقصد فروغِ اردو سے کہیں زیادہ اسلامیات کا فروغ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ایسی کتابوں کو شامل نصاب کیا جاتا ہے جن سے مذہبیات کی تفہیم ہو سکے یا پھر ایسی اردو کتابوں کو اہمیت دی جاتی ہے جو دینی مزاج کے ساتھ لکھی گئی ہوں یعنی ان مدارس میں ایسے ادبا و شعرا نیز ایسے مضامین منتخب کیے گئے ہیں جن سے مذہبی رواداری کو کوئی ٹھیس نہ پہنچتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر 'رحمت عالم' اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی (اسمٰعیل میرٹھی) داخل نصاب ہیں۔ اسی طرح حالی کی 'مسدس حالی' اور اقبال پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مدرسوں میں اردو کے داخل نصاب ہونے سے اردو فروغ پاتی، تاہم فروغ اردو اور مدارس کے ضمن میں یہ کہنا لازمی ہے کہ وہاں ذریعۂ تعلیم عموماً اردو ہے۔ اس لیے اردو از خود مدرسوں کے ذریعے پروان چڑھتی رہتی ہے۔ مشیر الحق کا خیال ہے:

''دینی تعلیم کی ترویج واشاعت کے علاوہ اردو زبان کو بھی برصغیر کے کونے کونے تک پھیلانے میں عربی مدارس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مدرسوں کے اس پہلو پر ابھی تک کسی نے باقاعدہ نظر نہیں ڈالی ہے، لیکن یہ موضوع اتنا اہم ہے کہ اس پر پوری تحقیق ہونی چاہیے۔ باوجودیکہ نصابی کتابیں تقریباً سب کی سب عربی زبان میں ہوتی ہیں لیکن ہندوستان کے مذہبی مدرسوں میں اعلیٰ تعلیم اردو ہی میں دی جاتی ہے... اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مدرسے کے طالب علموں کی راہ میں ملک کی جغرافیائی، لسانی اور تہذیبی حد بندیاں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ بغیر کسی مبالغہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے اس کونے سے اس کونے تک جہاں کہیں بھی کوئی عالم ملے گا، وہ اردو ضرور جانتا ہوگا... غیر ممالک کے طلبہ بھی جو علم دین کے حصول کے لیے یہاں [ہندوستان] آتے ہیں، چونکہ ان غیر ملکی طلبہ کو بھی دیر یا سویر اردو زبان میں ہی اسباق حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی جلد از جلد روزمرہ کی اردو سیکھ لیتے ہیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو برصغیر کے باہر بھی اردو کا تعارف کرانے میں مدارس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔''

(بحوالہ: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، دہلی اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل، دہلی، اردو اکادمی، ص 120، 1967)

مشیر الحق کے علاوہ پروفیسر وہاب اشرفی نے بھی متعدد مقامات پر کھلے دل سے فروغ اردو کے تناظر میں مدارس کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ کالجوں سے اردو غائب ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا میں نے اردو کی عظمت اور زندگی کی جب بھی باتیں کی ہیں تو مجھے مدارس کی کارکردگی ضرور یاد رہی۔ ان کے علاوہ ممتاز ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے اس طرح مدارس کی اردو دوستی کا حوالہ دیا ہے ''...ہندوستان میں بہرحال تمام مدرسے زبانوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی بھی اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ کمپیوٹر کی بھی تعلیم کا اہتمام بہت سے مدارس میں ہے۔ اتر پردیش، بہار، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں اردو کی بقا زیادہ تر مدرسوں کی مرہون منت ہے۔''

(اردو نصاب اور مدارس، نئی دہلی، براؤن پبلی کیشنز، 2012، ص نمبر 7)

حقیقت یہ ہے کہ مدارس دو سطحوں پر اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اول: وہاں اردو 'ذریعۂ تعلیم' ہے اور اردو کے ماحول میں ہی مدارس کے طلبا کی ذہنی نشو ونما ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بڑے مدارس میں زیر تعلیم بیرون ممالک کے طلبا بھی اردو سیکھ لیتے ہیں۔ گویا بیرون ممالک کے طلبا کے کندھوں پر سوار ہو کر اردو نے سرحدیں پار کیں۔

دوم: بورڈ سے ملحق مدرسوں کے ساتھ ساتھ غیر ملحقہ مدرسوں میں بھی اردو کتابوں کو شامل نصاب رکھا گیا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل مدارس دو سطحوں پر اردو کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مدارس میں اردو کتابوں پر مبنی جو نصاب شامل ہے، اس میں عصری تقاضوں کے مدنظر تبدیلی ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ راقم کا یہ بھی مفروضہ ہے کہ فروغِ اردو کے لیے کام کرنے والے اداروں کو بھی مدارس کے اردو نصاب میں تبدیلی لانے کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اردو نصاب اور مدارس کے تنقیدی ڈسکورس سے یہ بات واضح ہے کہ عہدِ حاضر میں مدارس اور اردو کی حیثیت لازم وملزوم کی سی ہو گئی ہے۔ مدارس کے بغیر اردو اور اردو کے بغیر مدارس کا تصور اب ایک ناممکن سی بات نظر آتی ہے۔ مدرسوں کے نصاب میں اردو کو کلیدی جگہ مل گئی ہے جو اردو زبان کی بقا کی ضمانت معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے مدارس کے اردو نصاب پر گہرائی سے غور وفکر کیا جائے اور اردو کا ایسا ہمہ گیر نصاب تیار کیا جائے جس میں اردو مذہبیات کی بھی گنجائش ہو اور 'سیکولر اردو' کی بھی، تا کہ فارغین مدارس نہ صرف زبان کی سطح پر اپنی انفرادیت درج کروائیں، بلکہ ادبی سطح پر بھی وہ مزید مستحکم ہو سکیں۔

■

Dr. Md. Tauqeer Alam Rahi
F-1/76, First Floor, Shaheen Bagh
New Delhi - 110025

حقیقت یہ ہے کہ مدارس دو سطحوں پر اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اول: وہاں اردو 'ذریعۂ تعلیم' ہے اور اردو کے ماحول میں ہی مدارس کے طلبا کی ذہنی نشو ونما ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بڑے مدارس میں زیر تعلیم بیرون ممالک کے طلبا بھی اردو سیکھ لیتے ہیں۔ گو یا بیرون ممالک کے طلبا کے کندھوں پر سوار ہوکر اردو نے سرحدیں پار کیں۔

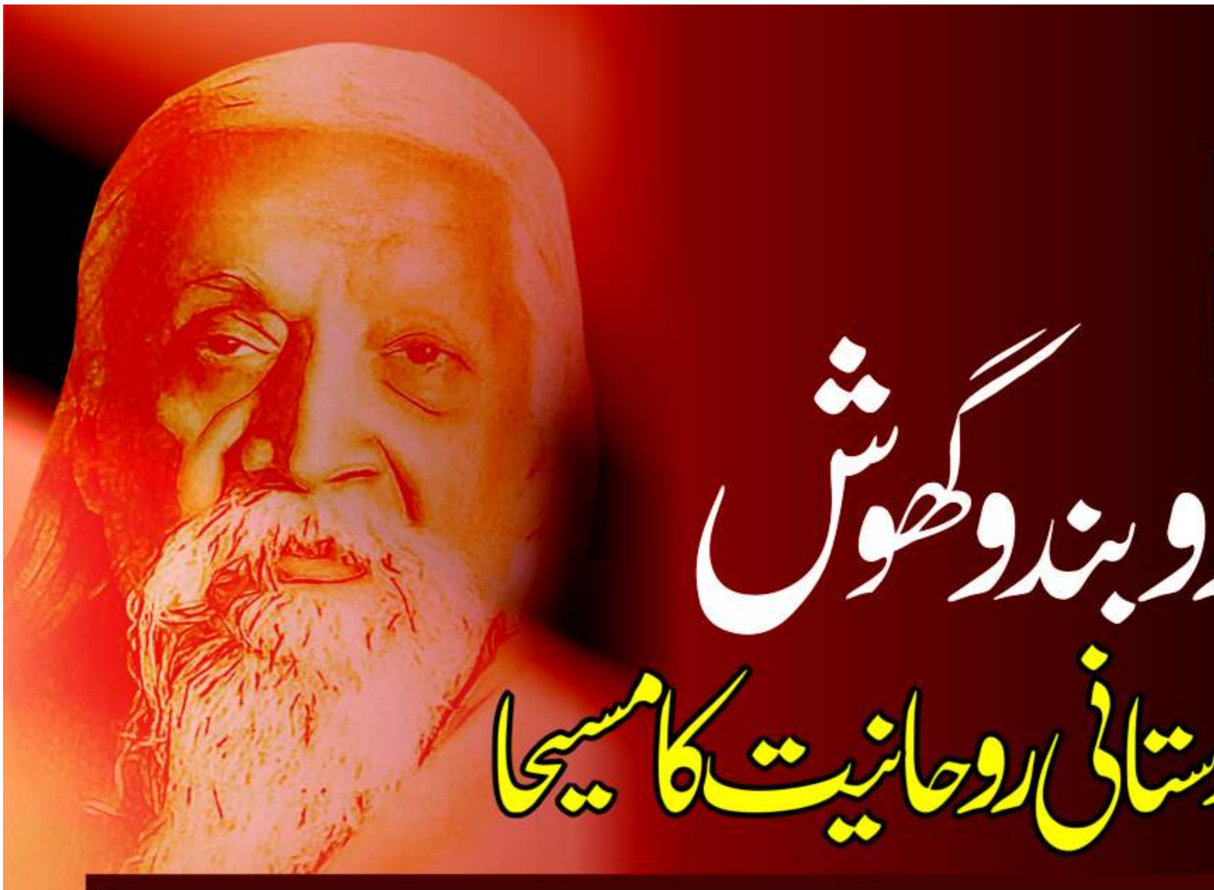

شیخ عقیل احمد

اروبندو گھوش

ہندوستانی روحانیت کا مسیحا

اروبندوگھوش کی شناخت ایک فلسفی، دانشور، یوگی اور گرو کی حیثیت سے ہے۔ انھوں نے یوگا کے عملی پہلو ؤں پر کتابیں تحریر کی ہیں اور روحانی ارتقا کے تصور سے عوام کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے قومیت اور روحانیت کا ایک الگ تصور دیا۔ ان کے فلسفیانہ افکار و خیالات ہندوستانی تناظر میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں میں ان کے حوالے سے بہت سی تحریریں ملتی ہیں مگر اردو میں اروبندوگھوش کے تعلق سے کم مواد دستیاب ہے۔

اروبندوگھوش کی پیدائش 15 اگست 1872میں ہوئی تھی اور 5 دسمبر 1950 کو وہ اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ خراج عقیدت کے طور پر یہ تحریر قارئین کی نذر ہے:

جامعیت اور ہمہ گیریت سے مالا مال شخصیت شری اروبندو کی زندگی اور ان کی اخلاقی اور روحانی مہارت سے مزین تحریریں ان کی دانشورانہ ذہانت کی ترجمان ہیں۔ وہ ہندستان کی روحانی اقدار اور عقلیت پر مبنی مغرب کے علمی ماحصل کے حتمی امتزاج کے آئینہ دار ہیں۔ وہ بلاشبہ ہندستان کی بحال شدہ روحانی تاریخ کی انتہائی گونا گوں شخصیت تھے۔ انتہائی قابلیت رکھنے والے شری اروبندو روحانیت اور بنیادی تحمل کے ذریعے ایک مضبوط تعمیر کے ذریعے قومی اور عالمگیر امور کا احاطہ کرنے کے متحمل تھے۔ بے انتہا تخلیقی اور ہمہ جہت طبیعت کے حامل شری اروبندو کی پرکشش زندگی اور ان کا پیچیدہ کیریئر معاشرتی تعمیر نو سے عبارت ہے جس کا مقصد بنی نوع انسان کو سیاسی اور روحانی حریت کی جانب گامزن کرانا، عوام الناس کی زندگی کو جہل کی لعنت سے پاک کرکے کامل بنانا اور عوام کو ان کی جذباتی بدگمانیوں پر قابو پانے کی جانب رغبت دلانا تھا۔ ان تمام چیزوں کے حصول کے لیے انھوں نے خارجی محرکات پر انحصار کے بجائے روحانی معرفت کی جانب رغبت دلائی۔

شری اروبندو نے قومیت پرستی کو روحانیت سے بھرپور بنانے والے پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے۔ روحانیت کے میدان کی ایک نابغہ روزگار شخصیت کی حیثیت سے معروف شری اروبندو اپنی دانشورانہ صلاحیتوں میں بھی بے مثال تھے۔ ان کے فلسفے کی رو سے وطن کے کسی باشندے کے لیے وطن پرستی ایک مذہب کی طرح ہوتی ہے جس میں انسان کے ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر وطن کی ذات میں ہی خدا کی موجودگی اور نصرت کو حاصل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک ہندستان کی حب الوطنی روحانیت کے ایک ایسے خزانے کا منبع ہے جس میں بے انتہا خدائی قوت ودیعت شدہ ہے۔ ان کا فلسفہ کسی ایک انسان کے ذہن میں تخلیق شدہ کسی تصور کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ یہ ایک ایسا نا قابل تسخیر تصور ہے جو اپنے کروڑوں باشندگان وطن کی صلاحیتوں کو وسیع تر پیمانے پر بروئے کار لانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شری اروبندو ایک سچے وطن پرست ہونے کے علاوہ یقینی طور پر انسانیت سے محبت کرنے والے عظیم انسان تھے۔ ان کی مدبرانہ سوچ انسانیت نواز طرز حیات کے تئیں ان کے پرعزم ہونے کے دعوے کی عکاسی ہے۔ ہندستانی فلسفے کو دی جانے والی ان کی عظیم خدمات کی جھلک ایک آئیڈیل انسانی وحدت کے ان کے فلسفے میں ملتی ہے جو انسانی ارتقا کے ہمہ گیر اور ہمہ جہت غور و فکر سے متعلق ہے۔ شری اروبندو جس مربوط روحانی طاقت کا تعارف کراتے ہیں وہ انسان کو لاحق ہونے والے تمام تر ممکنہ خدشات کو رفع کرنے والی ایک اکسیر ہے۔ ان کا تجویز کردہ قومیت کا تصور انھیں ہندستان کے دوسرے فلسفیوں کے مقابلے میں یکسر منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

ان کے مطابق ہندستان فی نفسہ ایک روحانی وجود کا نام ہے۔اس لیے لامحالہ ایک سچے ہندستانی محبِ وطن کو اپنے تخیل کے میدان میں مذہب کو ترجیح دینی ہوگی۔دوسرے لفظوں میں ہندستانی قوم پرستی بذات خود ایک مذہب ہے۔اس منفرد تصور کی بنیادیں خدا کو قادر مطلق ماننے سے مشروط ہیں جس کے لازمی نتیجے میں کائنات کی کوئی طاقت اس طاقت کی تاثیر کو مغلوب نہیں کرسکتی۔بقول شری اروبندو:

''اس کائنات کی جملہ مخلوقات بشمول خود مالک کائنات ' ایک متعیّن منزل کی جانب گامزن ہے۔ یہ منزل ہمیشہ اس کی خود کی ذات یا تصور ذات سے ماورا ہوتی ہے۔''[1]

برہمن ہر فرد کے مقصد حیات کے سفر کا رہبر ہے کیونکہ یہ قانون قدرت کے خالق کا نمائندہ بھی ہے جو زمان و مکان کی تمام تر حدود و قیود سے آزاد ہوتا ہے۔ برہمن وہ ہے جو ان تمام ممکنہ نتائج کو طے کرنے کا مطلق اختیار رکھتا ہے جن میں زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں اور نشیب و فراز شامل ہیں جو قانون قدرت کے باہمی تعامل سے معرض وجود میں آتے ہیں۔

شری اروبندو کے نزدیک قومیت پرستی اور وطن پرستی ایک ایسا جاوداں اور دائمی محرک ہے جس میں خداداد نصرت کے امکانات پنہاں ہیں؛ اس طرح اس کا مقصد لامحالہ روحانی بن جاتا ہے۔ ملکوتی تجربے کی یہ روانی انسانوں کے درمیان ذات پات مسلک و مذہب اور عقیدے کے تعصب سے پاک مساوات کے ماحول سے بھی مشروط ہے۔اسی روحانی اصول و قواعد کے تناظر میں ہندستان کو اپنے انتہائی مشن کی تکمیل کرنی ہے۔ اس مشن میں ہندستانیوں کو اپنے وطن کے درمیان یگانگت کے روحانی بندھن کو مزید تقویت دینا شامل ہے، جس کا انجام کائنات کی ایک اکائی کے روپ میں بدل جانے پر ہو۔ بنی نوع انسان کی روحانی اصلاح بحیثیت مجموعی ہندستان سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ روحانی بیداری کے پھیلاؤ میں وہ اپنی قائدانہ ذمے داریوں کو پورا کرے، جس سے مادّہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی اس دنیا کو حریت کی روشنی میسر آئے۔ اگر ہندستان نے عوام الناس کے اندر معنوی اور باطنی وحدت کا ارتعاش پیدا کرنے کے لیے روحانی بیداری کے عمل کی جانب پیش قدمی نہ کی تو ناگزیر روحانی اقدار کی یہ محرومی عالمی معاشرے کے لیے سوہان روح بن جائے گی۔اسی لیے انھوں نے ایک ایسے انسانی وجود کے تصور کی تائید کی ہے جو تمام اقوام عالم کا احاطہ کرے۔اس سلسلے میں ہندستان ایک الہامی رہبر کی حیثیت سے بنی نوع انسان کے ارتقا کے مادّی مراحل کی اس طرح توجیہ کرے کہ انسانوں کے درمیان پوشیدہ باہمی مساوات ظہور پذیر ہو۔

شری اروبندو کا وطن پرستی کا فلسفہ ہمیں تاعمر متاثر کرتا رہے گا کیونکہ اسے نہایت ہی منظم اور پرجوش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہندستانی روحانیت کے بے تاج بادشاہ اروبندو کی پوری فکر کو ایک وسیع روحانی اور جامع پیرائے میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ان کے فلسفے کی تمام تر توجیہات میں ان کی مذہبیت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان کے تصور وطن اور انسانیت کے تئیں ان کی محبت میں بھی مذہبیت کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ان کے افکار کا دقت نظر سے جائزہ لینے کے لیے اس بات کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھنا ہوتا ہے کہ اس میں پنہاں روحانیت کو سمجھا جائے اور کس طرح شری اروبندو نے ماوراء الطبیعاتی حقائق اور انسانی زندگی کے سیاسی گوشوں کے درمیان ربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے، اس بات کا بھی مکمل ادراک کیا جائے۔

اگرچہ ان کے افکار میں سیاست اور روحانیت کا ایک حسین امتزاج ہے لیکن ان کی فکر خالص روحانی بنیاد رکھتی ہے۔ مادّہ اور روح کے درمیان باہم تعلق کے حوالے سے ان کا پیش کردہ بیانیہ ہی وہ کلید ہے جس کی مدد سے روحانی ترفع کے وسیع تر نظم میں ہونے والی سیاسی حریت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

شری اروبندو کی جامع فکر کے ترکیبی اجزا ان کی ان بیش بہا دانشورانہ صلاحیتوں کی مرہون منّت ہیں جن کا سرچشمہ بلاشبہ ان کے روحانی تجربات ہیں۔ان کے وجود میں اپنے وطن کی تعمیر نو کا ایک ایسا جذبہ دوام کے ساتھ جوش مارتا ہے جس کی نظیر ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ایک تعمیراتی فلسفی کے طور پر ان کے ذریعے کی جانے والی ہندستانی فلسفیانہ روایات کی جدید تشریح نے نہ صرف ان روحانی بشارتوں میں مضمر اسرار و رموز کو آشکار کیا ہے بلکہ ان قدیم علمی وراثتوں میں پوشیدہ آفاقی پیغامات پر بھی مہر تصدیق ثبت کی ہے۔وہ دنیا کے سامنے ایک ایسے مذہبی اور مابعدالطبیعاتی افکار کو پیش کرتے ہیں جس کا مقصد جدید دور کے عمرانی تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ اس تناظر میں یہ کافی موزوں اور برمحل ہے کہ بنی نوع انسان کے ارتقا کے حوالے سے ان توجیہات کو بھی سمجھا جائے۔

نسل انسانی کا معاشرتی اور اجتماعی شعور اس امر کو بخوبی سمجھتا ہے کہ شری اروبندو 'ارتقا کے مراحل میں شامل مادّی عوامل' اور 'انسان کی شعوری نشو و نما' کی ایک مربوط توجیہ کے روح رواں ہیں۔اس طرح شری اروبندو نسل انسانی کو اس کائنات کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ کائنات جو مسلسل تغیر پذیر ہے اور اپنے ارتقا کے سفر میں ہے۔ارتقا کا یہ عمل نہایت عظیم الشان ہے۔اسی ارتقائی سفر میں بنی نوع انسان کا مقصد حیات پوشیدہ ہے۔انسانی معاشرے کا اجتماعی شعور ایک ردعمل کے نتیجے میں معرض وجود میں آتا ہے اور اسی کشاکش کے بعد کائنات ارتقا کے مراحل طے کرتے ہوئے اپنے مقصد حقیقی کی جانب گامزن رہتی ہے۔ انسان اس لطیف ارتقائی عمل کا ایک ناگزیر حصہ ہوتا ہے۔یہ کائنات ایک ایسی پوشیدہ قوت کا مظہر ہے جسے ہر انسان حاصل کرنا چاہتا ہے۔نسل انسانی اسی مقصد کے حصول کے لیے اس سفر میں مختلف نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔پھر وہ مشترکہ طور پر پرورش پائے گئے افکار و نظریات کو جو کہ اس جدلیاتی عمل کا حاصل ہوتے ہیں 'اپنی آئندہ نسل کو منتقل کرتی ہے۔اس جدلیاتی عمل کے نتیجے میں کائنات میں موجود نسل انسانی، انسان سازی کے نت نئے دور میں داخل ہوتی رہتی ہے۔انسان کے اجتماعی شعور کا کمال یہ ہے کہ انسان سازی کا یہ مستقل آگے بڑھتا ہوا قافلہ اپنی معراج کو پہنچنے کے بعد بھی کبھی جامد نہیں ہوتا۔ وہ پھر کسی نئے ارتقائی مرحلے میں داخل ہوجاتا ہے۔ایک فرد کے اندر اپنی ذات کے ترفع کی طاقت ودیعت شدہ ہوتی ہے۔اور وہ اپنے مادی وجود کے

ہندستانی روحانیت کے بے تاج بادشاہ اروبندو کی پوری فکر کو ایک وسیع روحانی اور جامع پیرائے میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے فلسفے کی تمام تر توجیہات میں ان کی مذہبیت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان کے تصور وطن اور انسانیت کے تئیں ان کی محبت میں بھی مذہبیت کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے افکار کا دقت نظر سے جائزہ لینے کے لیے اس بات کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھنا ہوتا ہے کہ اس میں پنہاں روحانیت کو سمجھا جائے اور کس طرح شری اروبندو نے ماوراء الطبیعاتی حقائق اور انسانی زندگی کے سیاسی گوشوں کے درمیان ربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس بات کا بھی مکمل ادراک کیا جائے۔

محدود تخیلات سے ماورا ہونے کی بالقوۃ صلاحیت کا بھی مالک ہوتا ہے۔ وہ معرفت ذات کے جوہر کی تلاش کے لیے ایک لافانی حقیقت کی جانب گامزن ہوتا ہے:

''وہ اپنی عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی محدود زندگی کے تقاضوں کی تسکین کا سامان کرتا ہے۔ لیکن آخرکار اس کی عقل اپنی حقیقی تحدیدات سے آشنا ہوتی ہے اور ایک لازوال اور مطلق العنان وجود کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے۔''[2]

شری اروبندو کے حوالے سے عام تاثر یہ ہے کہ انھیں ایک پروقار زندگی کے حصول کے لیے کافی مزاحمت کرنی پڑی۔ یہ تجربہ ان کے لیے عوام الناس سے ان کی قربت کا بھی موجب بنتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ انسانی وحدت کے لیے وافر امکانات کے راستے کھلتے ہیں۔ قادر مطلق کی ذات غم اور الم کی آمیزش سے متصف متعدد مخلوقات کو وجود بخشتی ہے لیکن انسان کے اندر پیدا ہونے والے آلام اور فرحت کی متنوع کیفیات کو یکجا ہوکر ایک ایسی قوت میں ظاہر ہونا ہے جہاں معاشرے کی قوت اور فرد کی طاقت لازم وملزوم بن جائیں۔ اس منزل کے حصول کے لیے لازمی طور پر اجتماعی کاوشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مشترکہ کاوشیں ایک اخلاقی تدبیر کی شکل میں اس بات کو یقینی بناتی ہیں کہ اقوام عالم میں موجود تمام افراد کے درمیان باہم تعمیراتی ہم آہنگی اور ربط کا رجحان پیدا ہو اور آخرکار دنیا اپنے مالک حقیقی کی ذات میں ضم ہونے کے ایک منطقی طریقہ کار کی شاہد بنے۔ حیران کن طور پر شری اروبندو اپنے زمانے کے شعور سے کافی آگے تھے اور انھوں نے اس حقیقت کا بہت پہلے ہی ادراک کرلیا تھا کہ دور جدید میں پیدا ہونے والا یہ مادہ پرست معاشرہ جس میں زندگی اس طرح گڈمڈ ہے کہ فرد ہر اعتبار سے اجتماعیت کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ یہ عمل سماجی تشکیل کے ایسے سانچے کے ظہور پر منتج ہوتا ہے جہاں افراد زندگی کی پیچیدگیوں کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہیں۔ تکنیکی میدان میں ہونے والی ترقی نے سماج میں موجود افراد کو اجتماعیت اور انسان سازی کی جانب جانے پر مجبور کیا۔ یہ ساری تبدیلیاں تقاضا کرتی ہیں کہ انھیں مثبت اور معنوی طریقے سے پوری دنیا کے لوگوں کے درمیان روحانی وحدت کے عنصر کو مضبوط کرکے بروئے کار لایا جائے۔

اروبندو علم وعرفان اور تفکر سے لبریز ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے حامی تھے جس کا سارا زور افراد کی روحانی تربیت پر ہو۔ اگرچہ مذہب انسان کی روحانی جبلّت کو دوام بخشتا ہے لیکن جب یہی مذہب ایک ادارے کے طور پر اپنی تعلیمات کا عملی مظاہرہ کرتا ہے تو اس میں ایک رسمی جمود اور موروثی عقیدے کا عنصر غالب آجاتا ہے جو کہ ایک روحانی معاشرے کی ترقی کو بے اثر کردیتا ہے۔ سماج کی اجتماعی تشکیل کا ارتقا اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ روحانیت خیز معاشرے کے تمام اوصاف کو بہ تمام وکمال قبول کرے جس سے اس میں موجود افراد کو ایک خوش حال اور تابندہ زندگی میسر آئے۔ اس طرح محض عارفانہ عمل سے آنے والی تبدیلی ہی، جو کہ انسانی ضرورتوں اور رضائے خداوندی سے ہم آہنگ ہو، اروبندو کے روحانی معاشرے کے خواب کی تعبیر بن سکتی ہے۔ اروبندو کے فلسفے کی رو سے ایک معیاری معاشرہ وہ ہوتا ہے جو اعلیٰ ترین اقدار کا مظہر ہو اور ایسا معاشرہ صرف ایک 'انسان کامل' کی بنیادوں پر ہی استوار ہوسکتا ہے اور یہی ان کے روحانی معاشرے کے تصور کا لب ولباب ہے۔ ایک روشن خیال اور تجدید شدہ روحانیت کے علمبردار کی حیثیت سے شری اروبندو نے سماج کے مختلف طبقات کے درمیان فصل نزاع کے طریقوں کا بھی بخوبی ادراک کیا ہوا ہے۔

وہ انسان کامل (Supramentalized Superman) کے ایک ایسے تصور کے ساتھ آتے ہیں جو کہ نمایاں طور پر روحانی طاقت کا ترجمان ہو۔ اروبندو کا انسان کامل (Superman) ایک ایسا منفرد وجود ہے جو حریت کے فرسودہ اور مبہم اصول وضوابط کے تابع نہیں ہوتا بلکہ اس کی زندگی رحم، شفقت، ہم آہنگی اور اعتدال کی اعلیٰ ترین صفات سے عبارت ہوتی ہے۔ وہ انسان کامل ان مطلق روحانی اقدار کی علامت ہوتا ہے جن کی مدد سے اتحاد، میل جول، اور انضمام پر مبنی معاشرے کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ اس طرح اجتماعیت اور فرد کی ذات کے مابین ایک رشتہ قائم ہوتا ہے اور ان کا اشتراک فرد کی ذات میں ماوراء الطبیعاتی کے سرایت کرنے کے بعد ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس طرح اروبندو ایک ایسے منفرد روحانی معاشرے کے داعی اور بانی ہیں جو اقوام عالم میں موجود تمام تر معاشرتی اور سیاسی ابتری کے لیے اکسیر ثابت ہوگا۔ روحانی معاشرے کے بطن سے صرف خوش حال زندگی کی خوشنمائی ہی برآمد ہوگی۔ ایسے معاشرے میں جہاں روحانی شعور قابل ذکر طور پر بیدار ہوتا ہے وہاں افراد اپنی ذمے داریوں سے بڑے ہی بے غرض اور بے لوث انداز میں عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ایسے ماحول میں انا پرستی دم توڑ چکی ہوتی ہے اور خدا کی زمین پر روحانی حقائق کے مطلق العنان ہونے کا ڈنکا بجتا ہے۔ روحانی ترفع سے سرفراز شری اروبندو کی شخصیت بذات خود روحانی حقائق کا مظہر ہے۔ روحانی تجربات اور حقائق کے ادراک نے ہی انھیں نزاع، تصادم اور جنگ وجدال سے پاک انسانیت نواز معاشرے کا تصور دینے میں مدد کی۔ ایک کامل روحانی معاشرے کے نقیب کے طور پر انھوں نے قدرتی حقائق میں مادّہ پرستانہ پیوندکاری کو سختی سے مسترد کیا۔

بلاشبہ شری اروبندو ہندستان میں پیدا ہونے والے عظیم ترین روحانی شخصیت تھے جنھوں نے ایک ایسی روحانی حریت کی وکالت کی جو انسان کے باطن میں بے غرض ہونے کا جذبہ بیدار کرکے اس کی زندگی کو ایک نئے رخ کی جانب گامزن کرے۔ اس طرح اس قلب ماہیت کے نتیجے میں انسان کے سامنے ایک ایسا روحانی شعور آشکار ہوتا ہے جس سے متاثر ہوکر وہ ایک ملکوتی تاثیر والی روحانی طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ روحانی طاقت کے حصول کی اس سمت کو جب اروبندو کے وضع کردہ تصور حریت کے وسیع تر تناظر میں دیکھا جاتا ہے تو یہ راستے اور سمت قدرے قابل عمل معلوم ہوتے ہیں۔ انسان کی ذات کا حقیقی جوہر ظاہری کردار نہیں ہوتا بلکہ اس کے وجود میں ودیعت شدہ روحانی وجدان ہوتا ہے۔ یہ روحانی وجود جب قادر مطلق کے وضع کردہ روحانی قوانین کے تابع ہوجاتا ہے تو وہ لامحالہ اسے اپنے باطنی وجود کی جبلی ہدایات سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ حریت کا یہ منفرد تصور بھگوت گیتا کی ہدایات سے بہت حد تک مطابقت رکھتا ہے، جس کے مطابق انسان کو اپنی ذات پر عائد ہونے والی تمام ذمے داریوں سے اپنے آپ کو عہدہ برآ ہونے کا پابند بنانا چاہیے۔ اور فرض کی یہ ادائیگی بے لوث جذبے اور روحانی کیفیت کے ساتھ کرنی چاہیے جس سے وہ آخرکار روحانی شعور کو بہ تمام وکمال حاصل کرسکے۔ اس عمل سے خود بہ خود کامل روحانی اقدار کے ظہور کا راستہ ہموار ہوگا۔ ان اقدار کے پنپنے اور پروان چڑھنے سے معاشرتی اور سیاسی ہم آہنگی کی فضا پیدا ہوگی اور اعتدال پسندی اور برداشت کا ماحول فروغ پائے گا۔ روحانی اقدار کے اس طرح فروغ پانے کی وجہ سے وحدت، ہم آہنگی، امن وآشتی اور بھائی چارے کا بول بالا ہوگا اور اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان موجود تضادات رفع ہوجائیں گے۔ اس لیے اروبندو کے مطابق انسان کی وقعت کی پیائش کے لیے اس کی روحانی ترقی کو معیار بنانا چاہیے۔ یہاں یہ امر دلچسپ ہے کہ معرفت ذات اور روحانی شعور کی بیداری کے عمل کو مذہب کے راستے سے ہوکر ہی اپنے کمال تک پہنچنا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ

یہ عمل مادّی دنیا میں موجود معاشرتی اور سیاسی نظام کی سفاک خواہشات کو اپنے راستے کی رکاوٹ بھی بننے نہیں دیتا۔ روحانیت کے مطلق العنان داعی کی حیثیت سے اروبندو باطنی روحانی وجدان اور ماوراء الطبیعاتی شعور کے حصول کے لیے مروجہ مذہبی مفروضوں اور توہمات کو مسترد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس طرح فرد کے روحانی وجود کا اعادہ کرتے ہوئے اور اسے دائمی شعور کی توسیع مانتے ہوئے شری اروبندو نے محسوس کیا کہ ہر فرد کی باطنی روحانی وقعت اور اس کے تقدّس کو بجا طور پر قائم رکھا جائے اور اس کی افادیت کو تسلیم کیا جائے۔

جب ہم شری اروبندو کے سماجی اور روحانی غور وفکر کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو دور حاضر کے مادّی سماج کے حوالے سے ان کے کلیدی انکشافات کا علم ہوتا ہے۔ اور

اروبندو کو بلا شبہ ہندستان کی فلسفیانہ روایت کے سب سے زیادہ روشن خیال دانشوروں میں سے ایک تھے۔ انسانی وحدت کے حوالے سے انھوں نے جو ماورائے طبیعاتی حل پیش کیا ہے وہ انسانیت کے لیے ان کی ہمدردی کا آئینہ دار ہے۔ وہ ایک غیرمعمولی وجود تھے جنھوں نے مادہ پرستی کے دور میں روح کی طاقت کو حتمی حقیقت قرار دیا۔ وہ ایک بے مثال روحانی مفکر تھے جنھوں نے ایک ایسے کامل معاشرے کا خواب دیکھا جس کی بنیادیں اقوام عالم کی یگانگت اور روحانی بیداری پر استوار تھیں۔

ساتھ ہی ہمیں ایک آئیڈیل سماج کے حوالے سے ان کے مشوروں سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔ سماج کو اپنے متعین کیے گئے معیارات کے تناظر میں پرکھا جانا چاہیے۔ ان معیارات کو انسانی تحمل کی صحیح ترفہم کے ذریعے وضع کیا جاتا ہے۔ یہ ہر سماج پر لازم ہے کہ وہ اپنے افراد کے لیے مناسب اور خوشگوار حالات پیدا کرے۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے باطنی وجود کے حوالے سے صاحب معرفت بنے اور اپنے اندر روحانی قوت بیدار کرنے کی جانب پیش قدمی کرے۔ جب انسان معصیت سے پاک روحانی ترفع کی جانب اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے تو اپنی ذات کی معرفت ان کی ہمہ جہت ترقی کے بہت سے مواقع کے راستوں کو کھول دیتی ہے اور وہ انسان بلا خوف وخطر اور بغیر رکاوٹ کے اس کامل معاشرے کی جانب مسلسل گامزن رہتا ہے جس کا خواب اروبندو نے دیکھا تھا۔ روحانی ترفع کی معراج تک پہنچنے کے لیے انسان کو ایک ایسے سفر کا آغاز کرنا پڑتا ہے جس میں متعدد گرداب آتے ہیں، اور ہر گرداب سے مرحلہ وار نکلا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہر گرداب کے مرحلے کو پار کرنے کے بعد اس کی روحانی قوت بھی مرحلے وار طریقے سے آشکار ہوتی ہے۔ اس طرح انسان اپنی ذات کی اصل معرفت سے آشنا ہوتا ہے اور نتیجے میں خود اعتمادی اور ذہنی لیاقت کو حاصل کرتا ہے۔ پھر اپنے حقیقی وجود اور مقصد حیات سے آشنا یہ انسان کامل اپنے فرسودہ سماج کو حریت اور قابلیت کے معیار کے سماجی نظم کی طرف لے جاتا ہے۔ اروبندو بلا شبہ فرد کے باطنی وجود کی پرزور وکالت کرتے تھے۔ اس طرح اپنے روحانی وجود کی معرفت حاصل کرنے کے لیے چوکنا ہو جانا اروبندو کے کامل سماج کی جانب پہلا قدم ہے۔ یہ سماج ہر سطح پر منافقت اور تضادات سے پاک معاشرہ ہونا چاہیے۔ اروبندو اس روحانی انقلاب کے تدریجی طور پر وقوع پذیر ہونے کے زبردست حامی تھے۔ روحانی کاملیت حاصل کرنے کی غیر معمولی قوت پر اروبندو کو پختہ یقین تھا۔ جس کے بعد ہی انھوں نے روحانی طور پر روشن خیال ایک آئیڈیل معاشرے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ ان کی روحانی سعادت کا فلسفہ مکمل طور پر اجتماعی ہے کیوں کہ یہ ہم آہنگی کے ایسے قانون پر مبنی ہے جس کی رو سے ہر فرد کا ذاتی فائدہ معاشرے کے اجتماعی فائدے سے مشروط ہے۔ ان کے فلسفے میں ہمیں فرد اور سماج کے درمیان نہایت ہی مربوط لیکن پیچیدہ رشتہ ملتا ہے۔ اروبندو ہر فرد سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کی روحانی ترقی پر بھی اتنی ہی تندہی اور چستی سے نظر رکھے جتنی وہ خود اپنی ترقی پر رکھتا ہے۔ انسان کی روحانی منزل میں اس کی ذاتی انا کے ساتھ ساتھ روحانیت کی گہرائی کو نہ سمجھنا بھی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اس لیے انسان کے لیے نجات کا راستہ یہی بچتا ہے کہ وہ تنہا رہنے کے بجائے سماج کے اس اجتماعی عمل کا حصہ بنے جس کے تحت معاشرہ روحانیت کے مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ فرد پر کچھ پابندیاں بھی عائد کرتے ہیں۔ وہ فرد کو اس جانب رغبت دلاتے ہیں کہ وہ اپنے ذاتی ترفع کے ساتھ ساتھ سماج کے ارتقائی عمل میں مددگار بن کر سماج کو روحانی بنائے۔ ان کے روحانی آئیڈیل میں اصل مقصد خدا کی ذات کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ ساتھ ساتھ اس روحانی ارتقائی عمل کا اظہار ملک اور قوم کی اجتماعی ترقی کے ذریعے ہونا چاہیے۔

ان کی متحرک روحانیت تجرباتی تحقیق کی بندشوں سے ماورا ہے۔ جب تک انسانی معاشرہ مفروضوں پر مبنی اپنی ذاتی حقیقت اور لذتیت کے حصار میں ہوگا، سماج کی یہ بے انتہا قوت خوابیدہ شکل میں ہی موجود رہے گی۔ انسان کا اصل جوہر تدریجی مراحل طے کرتا ہوا ظہور پذیر ہوتا ہے اور آخرکار اپنی معراج کو حاصل کر ہی لیتا ہے۔ اس طرح آج کے دور میں پھیلے ہوئے خونی تصادم سماجی افراتفری کا اچوک علاج یہی ہے کہ روح کی خوابیدہ طاقت کو متحرک کر کے ہر فرد کو ایک منظّم اجتماعی نظام کا حصہ بنایا جائے۔ اروبندو معاشرے کی حقیقی روحانی بیداری کے روح رواں تھے جہاں فرد کے اندر موجود برائیاں بے اثر ہو جائیں جس کے نتیجے میں سماج کا اجتماعی روحانی شعور ایک نئے باب کا آغاز کرے گا:

''سماج کی تنظیم کا مقصد سرفہرست یہ ہونا چاہیے کہ انسان کو ایک فرد کی حیثیت سے بغیر کسی طبقاتی یا نسلی امتیاز کے؛ زندگی کے تقاضوں کی جانب توجہ مبذول کرائی جائے تاکہ معرفت ذات کا اس کا یہ سفر خوش اسلوبی سے آگے بڑھتا رہے۔ اس طرح مادی تقاضوں کو پورا کرتے کرتے وہ روحانی تکمیل کی منزل کو بھی پا لے۔''[3]

اروبندو کو بلا شبہ ہندستان کی فلسفیانہ روایت کے سب سے زیادہ روشن خیال دانشوروں میں سے ایک تھے۔ انسانی وحدت کے حوالے سے انھوں نے جو ماورائے طبیعاتی حل پیش کیا ہے وہ انسانیت کے لیے ان کی ہمدردی کا آئینہ دار ہے۔ وہ ایک غیر معمولی وجود تھے جنھوں نے مادہ پرستی کے دور میں روح کی طاقت کو حتمی حقیقت قرار دیا۔ وہ ایک بے مثال روحانی مفکر تھے جنھوں نے ایک ایسے کامل معاشرے کا خواب دیکھا جس کی بنیادیں اقوام عالم کی یگانگت اور روحانی بیداری پر استوار تھیں۔

References:

1 "The complete works of ShriAurobindo", Volume 17, Published by ShriAurobindo Ashram Publication Department, published in 2003, Page No. 26.

2 "The synthesis of Yoga", Volume 23 & 24, "The complete works of ShriAurobindo", Published by ShriAurobindo Ashram Publication Department, Pondicherry, India, Page No. 467.

3 "Sri Aurobindo, The Human Cycle (Pondicherry: Sri Aurobindo Ashram), 1962, PP. 83-84

■

Dr. Shaikh Aquil Ahmad
Cottage-42
Shipra Suncity
Indirapuram, Ghaziabad-201014

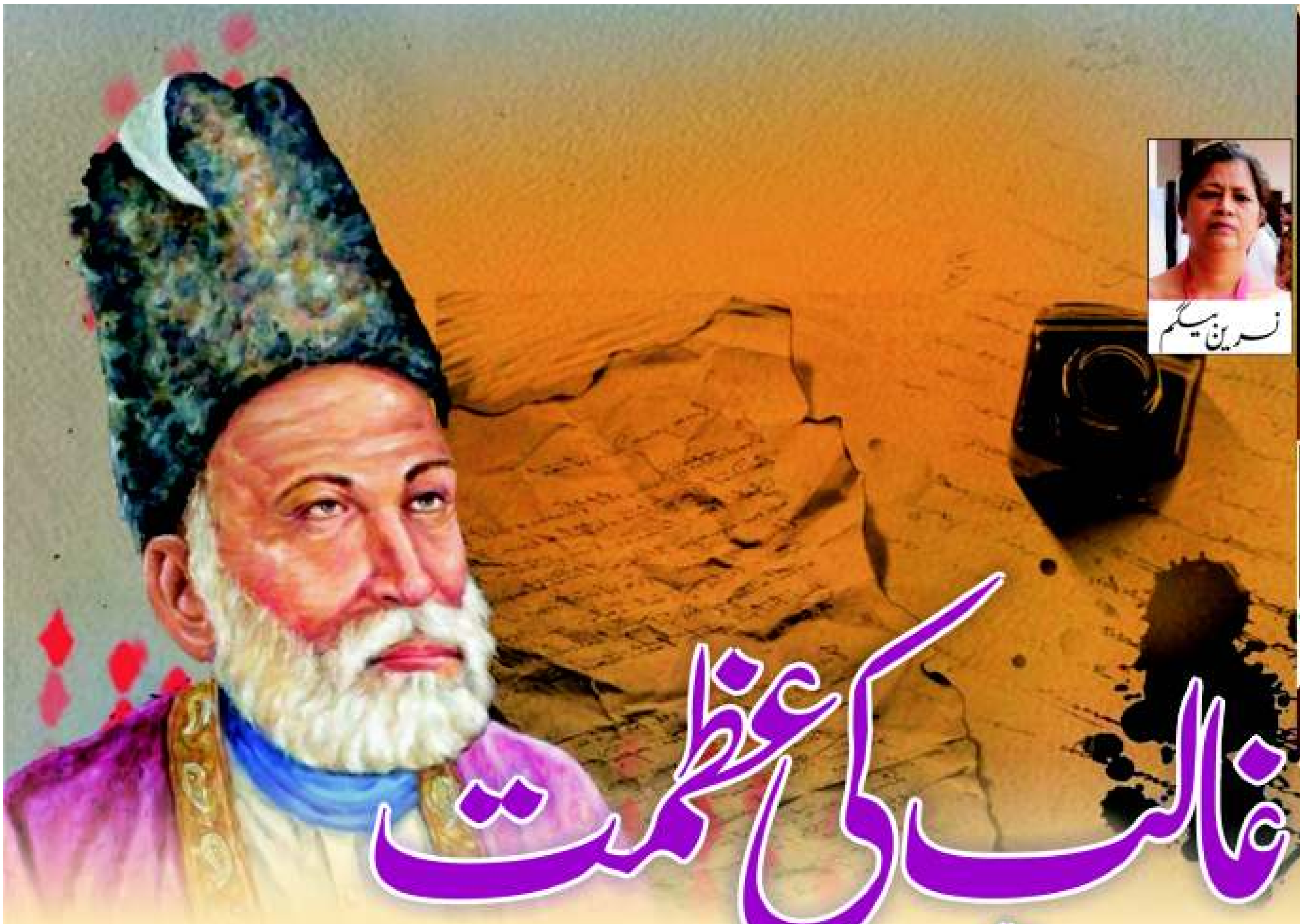

نسرین بیگم

غالب کی عظمت

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کی غالب کا ہے انداز بیاں اور

ہندوستان کے عظیم سخنور، جن کا نام مرزا اسداللہ بیگ خاں ہے۔ غالب تخلص۔ جائے پیدائش اکبرآباد (آگرہ) ہے۔

اور اب اس شہر کو آگرہ کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ غالب کی ولادت 27 دسمبر 1797 کو اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی۔ بچپن آگرہ میں گزرا۔ مرزا نوشہ لقب اور نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ خطاب تھا۔ والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ جب غالب کی ولادت ہوئی اس وقت آگرہ مرہٹوں کے قبضے میں تھا اور سلطنت مغلیہ کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر مرہٹوں کا قیدی بنا ہوا تھا۔ اس وقت انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا۔ مرہٹوں کو شکست دے کر انگریزوں نے اپنا پرچم دلی و آگرہ اور اس کے اطراف و جوانب پر لہرایا۔[1]

غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا کی شادی کمیدان (Commandant) خواجہ غلام حسین رئیس آگرہ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ (الف) غالب نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور اساتذہ سے پائی۔ شیخ معظم جو اس وقت آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے، غالب ان سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ غالب مع اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف خاں کے سن شعور تک آگرہ ہی میں رہے۔ ہرمزد نامی ایک پارسی شخص جو غالباً آگرے میں بحیثیت سیاح آیا اور اسلام قبول کر لینے کے بعد اس کا نام عبدالصمد ہو گیا۔ عبدالصمد دو برس تک مرزا کے پاس آگرے میں رہے اور غالب نے دو برس تک عبدالصمد سے فارسی پڑھی۔[2]

آگرہ میں غالب کا ننھیالی مکان جس میں وہ پیدا ہوئے تھے اس کے بارے میں غالب لکھتے ہیں:

''ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب سیٹھ لکھی چند نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری میں میری نشست تھی۔''

آگرے کی اس حویلی میں اب اندر بھان گرلس انٹر کالج قائم ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کی لکھی ہوئی غالب کی سوانح عمری 'یادگار غالب' میں کلاں محل کا ذکر ہے، وہ کلاں محل جواب کالا محل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کالج وہیں ہے۔ غالب کے نانا کی جاگیر میں بہت سارے دیہات بھی شامل تھے اور شہر آگرہ میں بھی ان کی بڑی جاگیر تھی۔ 10 ستمبر 1833 کو منشی شیو نرائن آرام اکبرآبادی آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مفید عام نام سے کالج قائم کیا۔ یہ کالج موتی لال نہرو روڈ پر آج بھی موجود ہے مگر وہاں جانے کے بعد مایوسی ہاتھ آئی۔

وہاں منشی شیو نرائن آرام اکبرآبادی کی ایک فریم کی ہوئی تصویر جو بوسیدہ حالت میں تھی اور ایک ہال جہاں وہ تصویر زمین پر ایک کونے میں رکھی ہوئی ملی۔ وہاں کی انتظامیہ نے دوبارہ لگانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ باقی جو نشانی وہاں ملی وہ کھنڈر کے سوا کچھ نہیں۔

اسی کھنڈر میں کہیں کچھ دیے ہیں ٹوٹے ہوئے
انھیں سے کام چلاؤ بڑی اداس ہے رات

مفید عام کالج کے حالات دیکھ کر اور وہاں کے ایک استاد کی زبانی کچھ باتیں سن کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب

مفید الخلائق پریس بھی منشی شیو نرائن آرام اکبرآبادی کا تھا۔ عالمی شہرت یافتہ فارسی اور اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کا پہلا دیوان فارسی اور دیوان اردو 1863 میں یہیں سے شائع ہوا تھا۔ دستنبو فارسی پہلی بار نومبر 1858 میں مطبع مفید الخلائق آگرہ سے چھپی تھی۔ اس مطبع سے کتاب کی اشاعت معیار و شہرت کی ضمانت تھی۔ منشی شیو نرائن آرام اکبرآبادی غالب کے شاگرد تھے۔ غالب کے ہم عصر اساتذہ جو اس وقت آگرے میں تھے ان میں خلیفہ

اسیر، مرزا اعظم بیگ اعظم، افہام اللہ افہام وساحر، شیخ نیاز علی پریشاں، سید مددعلی تپش، مولوی نبی بخش حقیر، مہاراجہ بلوان سنگھ، مرزا خانی رنج، سید بلاقی زر، قطب الدین خاں باطن، احمد خاں شیفتہ، منشی جواہر لال جواہر، میر سعادت علی سعید، مولوی اصغر علی اصغر کے نام قابل ذکر ہیں۔

بابو گووند سہائے نشاط اکبرآبادی جنھوں نے 1862 میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور آگرہ دیوانی میں وکیل ہوئے، یہ بھی مرزا غالب کے شاگرد تھے۔

غالب کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی اور نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کی بھتیجی امراؤ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس وقت مرزا کی عمر تیرہ برس اور امراؤ بیگم کی عمر گیارہ برس تھی۔

غالب کے سات اولادیں ہوئیں مگر ان میں سے کوئی نہ جیا۔ تب امراؤ بیگم کے بھانجے زین العابدین عارف کو گود لیا تھا۔ غالب عارف سے بہت محبت کرتے تھے مگر افسوس کہ زین العابدین عارف کا انتقال جوانی میں ہی ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد غالب نے ایک غزل بطور نوحے کے لکھی۔

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا، کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور [4]

خدائے سخن اور فن غزل گوئی کے استاد میر تقی میر کی ولادت 1723 کو اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی۔ وہ آگرے کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ محلّہ ہینگ کی منڈی میں ان کا موروثی مکان تھا۔ (اب ہینگ کی منڈی، آگرہ جوتوں کے کاروبار کے لیے مشہور ہے) میر تقی میر کا انتقال 1810 میں لکھنؤ میں ہوا۔

میر تقی میر، غالب کے ہم وطن یعنی آگرے کے ہی تھے۔ مرزا غالب کے اشعار نواب حسام الدین حیدر خاں نے میر تقی میر کو دکھائے۔ غالب کے لڑکپن کے اشعار سن کر میر نے یہ کہا کہ ''اگر اس لڑکے کو کوئی استاد کامل مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر ہوگا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔''[5]

میر تقی میر کی یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی اور رفتہ رفتہ مرزا کے کلام کو شہرت حاصل ہونے لگی اور وہ لاجواب شاعر بن گئے۔

غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں جس محلے میں رہتے تھے اس محلے کا نام گلاب خانہ ہے۔ اس وقت گلاب خانہ فارسی زبان کا مرکز تھا۔ یہیں ملا ولی محمد شارح مثنوی مولانا روم، مولوی شمس الضحیٰ، مولوی بدالدجی، منشی اعظم علی اعظم، مولوی محمد کامل، مولوی محمد معظم، خواجہ غلام غوث بیخبر رہا کرتے تھے۔ جن سے غالب کو فیض حاصل ہوا۔ ان کے علاوہ جو حضرات فارسی میں شعر کہا کرتے تھے اور اکبرآباد میں تھے ان میں گلرخ، پنڈت ڈونگر مل سنسکرت کے ساتھ فارسی کے بھی ماہر تھے، سلیمہ جن کی شادی 965ھ میں بیرم خاں سے ہوئی تھی، شاعرہ تھیں، اشکی، فارغی، شیخ ابوواجد و شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر، شیخ ابوالفیض فیضی، علامہ شیخ ابوالفضل، بیاض خاں اکبرآبادی بیاضی، میر حشمی اکبرآبادی، خنجر بیگ چغتائی، طالعی یزدی، ملا صبوحی اکبرآبادی، سیرابی اکبرآبادی، ملا شیدا، طفلی، ماہر، برہمن، لالہ ٹیک چند اکبرآبادی بہار، اعجاز، آتشم، خان آرزو اکبرآبادی، میر تقی میر، مولوی سید امجد علی شاہ اصغر، شاہ محمدی بیدار اکبرآبادی، ذرہ، محمد امین ذوقی اکبرآبادی، سحری اکبرآبادی، مولوی نبی بخش حقیر الٰہی بخش شوق اکبرآبادی، حکیم نظام علی خاں افضل، الٰہی، انعام، بیخبر، سید کاظم علی اکبرآبادی، حافظ عبدالغفور وفائی اکبرآبادی، مولوی سید اصغر علی شاہ اکبرآبادی، مولانا عاشق حسین سیماب اکبرآبادی، مولوی سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔[6]

محلّہ گلاب خانہ آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ غالب کا بچپن یہیں گزرا۔ یہ محلّہ اس زمانے میں فاضلان فارسی کا محلّہ تھا۔ اس وقت فارسی اور اردو میں طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ''پنج آہنگ' میں ایک خط میر اعظم علی کے نام ہے جو فارسی میں ہے جس کا ترجمہ اردو میں کچھ اس طرح ہے۔ میر اعظم علی غالب کے بچپن کے دوست تھے۔ ان کو لکھتے ہیں:

... آپ کے خط نے میری مردہ آرزوؤں میں زندگی کی رو دوڑا کر دنیائے دل کو محشرستان بنا دیا... دیرینہ آرزوؤں کے جو کانٹے دل میں چھپے ہوئے تھے وہ دل سے باہر نکل رہے ہیں۔ آہ، مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب یہ پوری کائنات (یعنی اکبرآباد) میرا وطن تھی اور ہمدرد دوستوں کی انجمن ہر وقت آراستہ رہا کرتی تھی۔''[7]

غالب کو فارسی سے خاص رغبت تھی اور شعر گوئی سے فکری مناسبت۔ گیارہ برس کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے تھے اور خاص طور پر آگرے کے علمی ماحول نے غالب کی شاعری پر اثر ڈالا۔ ان کی شاعری دل کی گہرائیوں کو چھوتی ہے اور ہمیں یہ قبول کرنا ہی پڑتا ہے کہ غالبؔ کا انداز بیان ہی انہیں اوروں سے الگ کرتا ہے۔ سننے والا بجائے رنج وغم کے ایک خاص قسم کی مسرت حاصل کرتا ہے۔ غالب کو اپنی انفرادیت کا خود احساس تھا۔

کوئی ایسا بھی، کہ غالب کو نہ جانے؟
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

غالب عالمی شہرت یافتہ شاعر ہیں۔ کلام میں روانی ہے۔ ان کے کلام میں یہ خوبی موجود ہے کہ جب پڑھیے نیا لطف آتا ہے۔

قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

مرزا غالب کے شاگرد عزیز خواجہ الطاف حسین حالی تھے۔ حالی نے انیسویں صدی کے آخر میں 'یادگار غالب' جو استاد مرزا غالب کی سوانح عمری ہے، لکھ کر غالب کی قدر ومنزلت اور ان کی زندگی سے وابستہ عام معلومات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ و لافانی کر دیا۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر خوب لکھا۔ جو رہتی دنیا کے لیے سند ہے۔ غالب کو سمجھنے، پہچاننے کے لیے یادگار غالب کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔

غالب اردو غزل میں ایک نیا خیال، نیا فلسفہ، ایک نیا گوشۂ فکر اور ایک نیا شعور لے کر آئے تھے۔ ان سے پہلے ایسی بے باکی اور کہیں نہیں ملتی۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ میرا جام سفال اچھا ہے
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا غالب کی شاعری جتنی حسین اور دلکش ہے اتنی ہی دلچسپ اور پرکشش ان کی شخصیت بھی ہے۔ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ہی ایک عظیم نثر نگار بھی ہیں۔ ان کے خطوط ہمارے لیے بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ غالب کے خطوط

غالب کو فارسی سے خاص رغبت تھی اور شعر گوئی سے فکری مناسبت .گیارہ برس کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے تھے اور خاص طور پر آگرے کے علمی ماحول نے غالب کی شاعری پر اثر ڈالا .ان کی شاعری دل کی گہرائیوں کو چھوتی ہے اور ہمیں یہ قبول کرنا ہی پڑتا ہے کہ غالبؔ کا انداز بیان ہی انہیں اوروں سے الگ کرتا ہے .سننے والا بجائے رنج وغم کے ایک خاص قسم کی مسرت حاصل کرتا ہے .

کا پہلا مجموعہ 'عودِ ہندی' اکتوبر 1868 میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ اردوئے معلّی مارچ 1869 میں، اس کے علاوہ خطوط غالب، قاطع برہان اور غدر کے احوال پر ان کی تصنیف دستنبو۔ غالب کے خط لکھنے کا انداز بالکل الگ تھا۔ غالب پنج آہنگ میں لکھتے ہیں کہ "خطوط نویسی کا میرا یہ طریقہ کہ جب لکھنے کو قلم اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو ایسے الفاظ سے پکارتا ہوں جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ القاب وآداب کا پرانا طریقہ، شادی وغم کا قدیم رویہ میں نے بالکل ترک کر دیا ہے۔

غالب میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"ہا ہا ہا! میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو، یہ رام پور ہے، دارالسرور ہے، جو لطف یہاں ہے اور کہاں ہے۔ سبحان اللہ! آؤ میاں سید زادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے"[8]

غالب نے 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی تباہی و بربادی کو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پینشن کے لیے کلکتے تک کا سفر تنگ دستی، قرض خواہوں کی مصیبت اور پریشانیوں نے غالب کو ایک ایسا فنکار بنا دیا جسے دنیا کبھی فراموش کر ہی نہیں سکتی۔ ان کے خطوط اردو نثر کا شاہکار بن گئے۔ وہ اپنے حوصلے سے زندگی کے ہر غم اور ہر مصیبت کا مقابلہ کرتے رہے اور اپنے عزیزوں، دوستوں، شاگردوں کو خط لکھ کر اپنے دل کی بات بتا کر تسلی کرتے رہے۔

وہ ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور! تم کو پہلے یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا..... پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے کوئی اس میں میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق تھا اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ عزیز،

کچھ دوست، کچھ شاگرد کچھ معشوق سو وہ سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو، ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مرونگا تو میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون[9]

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کیا کروں کیا کارفرماں جل گیا

غالب کے خطوط کا یہی کمال تھا۔ منشی ہرگوپال تفتہ جو غالب کے عزیز شاگرد اور میر مہدی مجروح مرزا کے شاگرد خاص تھے۔ میر سرفراز حسین خواجہ غلام غوث کا نام غالب کے خطوط کی وجہ سے ہی زندہ جاوید ہو گیا۔ اور وہ خطوط ہمیشہ پڑھے جاتے رہیں گے۔ غالب نے اپنے خطوط کے ذریعے انسانوں کے درمیان پھیلی نفرتوں کو ختم کرنے کے لیے اپنے دل سے نکلی بات لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب رہے اور جہاں انھوں نے سنجیدہ موضوع پر لکھا وہیں طنز ومزاح کو اپنے خطوط اور شاعری میں جگہ بھی دیا۔

سنبھلنے دے ذرا اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

غالب کے خط میں طنز و مزاح کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

امراؤ سنگھ دوسری بیوی کے انتقال کے بعد تیسری شادی کا ارادہ کر رہے تھے اس بات کو مرزا تفتہ کو وہ کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندہ گلے پڑا ہے نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچوں کو پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟

بے باکی اور حاضر جوابی غالب کے خطوط میں موجود ہے خطوط نویسی کے ساتھ شاعری بھی غالب کی زندگی تھی۔ انھوں نے شاعری کو ایک خوبصورت زندگی کی طرح جیا ہے اور آخر وہ عظیم شاعر 15 فروری 1869 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے نزدیک دفن ہوئے۔

مرزا غالب کا دائرہ تخیل کائنات کی طرح وسیع ہے۔ وہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے سخن کے عظیم اور محبوب شاعر ہیں۔ وہ اپنے الگ انداز بیان کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب کی عظمت کا راز بھی ان کا اپنا الگ انداز بیان ہی ہے۔ اور وہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے محبوب شاعر ہیں۔

حواشی

1. غالب ایک مطالعہ: ممتاز حسین، انجمن ترقی اردو روڈ، کراچی 1969
الف ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، فروری 2001، کالی داس گپتا رضا، ص2
2. یادگار غالب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ص 25-26
3. ہماذ اجسٹ غالب نمبر، مدیر عبدالوحید صدیقی، جلد 5، شمارہ 33
4. دیوان غالب: مرزا اسداللہ خاں غالب، ص 81، یہ زین العابدین خاں عارف کا مرثیہ ہے
5. ماہنامہ شاعر، آگرہ نمبر، مدیر مسئول، سید اعجاز حسین اعجاز صدیقی اکبرآبادی، جون- جولائی 1936، ص 19
6. ماہنامہ شاعر، آگرہ نمبر جون- جولائی 1936، ص 69-73
7. آجکل فروری 2001، غالب اور اکبرآباد، کالی داس گپتا رضا، ص 40
یہ خط اواخر 1834 یا اوائل 1835 کا ہے۔ گویا غالب نے مستقلاً آگرہ 1814 یا 1815 میں چھوڑا۔ وہ اس وقت اٹھارہویں سال میں ہوں گے۔' کالی داس گپتا رضا'
8. ہما اردو ڈائجسٹ مارچ 1969، نئی دہلی، غالب نمبر مدیر عبدالوحید صدیقی، ص 145
9. عود ہندی، نجم الدولہ دبیرالملک مرزا اسداللہ خاں غالب، دہلوی 1858، ص 143
10. ہما اردو ڈائجسٹ، مدیر عبدالوحید صدیقی، غالب نمبر 1969، ص 144-45

■

Dr. Nasreen Begum (Alig)
Associate Prof. & Head Dept of Urdu
Baikanthi, Devi Girls PJ College
Agra (UP)

اس شکل سے گزری غالب

حقائق اساس ڈرامہ

پرویز شہریار

اردو ادب میں ڈرامے کے رجحان کا غلبہ دیگر اصناف کے مقابلے میں اگرچہ زیادہ نہیں رہا ہے۔ تاہم اندر سبھا کے ڈراموں کی روایت واجد علی شاہ کے زمانے سے کافی مشہور اور مقبول رہی ہے۔ اردو میں اسٹیج ڈرامے اور ریڈیائی ڈرامے دونوں ہی لکھے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں، یک بابی ڈرامے بھی تعلیم و تدریس کے اغراض و مقاصد کے تحت لکھے جاتے رہے ہیں۔

اردو کے مشہور ڈراموں میں 'انارکلی' کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اصلاحی ڈراموں میں عابد حسین کے ڈرامے 'پردۂ غفلت' اور آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ 'یہودی کی لڑکی' کا ذکر ہوجاتا رہا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں پارسی تھیٹر نے ڈرامے کے کرافٹ کو بام عروج تک پہنچایا۔ اسے اردو ڈرامے کا سنہرہ دور کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بولتی ہوئی جدید فلموں کی آمد سے تھیٹر کا زور کم پڑ گیا اور رفتہ رفتہ اس کی جگہ فلموں نے لے لی۔

لیکن، دوسری طرف ہوا یہ کہ ڈرامے کو اسٹیج سے ہٹ کر ریڈیو میں جگہ مل گئی اور ریڈیائی ڈرامے کی مقبولیت نے بڑے بڑے ڈرامہ نگاروں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اپیندر ناتھ اشک اور ریوتی سرن شرما کے نام قابل ذکر ہیں۔ دورِ جدید میں اپٹا (IPTA) اور دوسری غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعے پیش کیے گئے ڈرامے قابل تعریف رہے ہیں، جن میں صفدر ہاشمی کے ڈرامے بھی شامل ہیں۔

ادبی اصناف میں ڈرامہ ایک ایسی صنف ہے جس میں ناظرین براہِ راست کرداروں سے روبرو ہوتے ہیں۔ اس میڈیم کو سب سے زیادہ موثر ذریعہ ترسیل سمجھا جاتا ہے۔ کتابی ڈراموں میں بہت ساری باتیں اَن کہی رہ جاتی ہیں، لیکن جب ہم اسٹیج پر کرداروں کو آپس میں متصادم دیکھتے ہیں تو ان کے جذبوں کا رنگ کرداروں کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے۔ جس کی گرماہٹ جلسہ گاہ یا ہال میں موجود تماش بین آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔ آواز کے اُتار چڑھاؤ اور مکالموں کی تیزی و ترشی ہم اسٹیج ڈراموں میں بخوبی محسوس کر لیتے ہیں۔

جہاں تک غالب پر کھیلے گئے ڈراموں کا سوال ہے۔ اس موضوع پر بھی وقتاً فوقتاً ڈرامے اسٹیج کیے جاتے رہے ہیں۔ اس قسم کے ڈرامے ایوانِ غالب کی ثقافتی و تہذیبی اکائی 'ہم سب ڈرامہ گروپ' کے ذریعے پیش کیے جاتے رہے ہیں، جن میں غالب شناسی کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس میں اب تک جو ڈرامے پیش کیے جا چکے ہیں، ان میں سے چند مشہور ڈرامے ہیں، سید محمد مہدی کا ڈرامہ 'غالب کون'، منجو قمر کا ڈرامہ 'مرزا غالب'، حبیب تنویر کا ڈرامہ 'میرے بعد'، اے آر کاردار کا ڈرامہ 'غالب کی واپسی'، اور محمد حسن کے ڈرامے 'تماشہ اور تماشائی' اور 'کہرے کا چاند'، نیز ابن کنول کا ڈرامہ 'بزم داغ' وغیرہ۔

پروفیسر صادق نے اپنے ڈرامے، 'اس شکل سے گزری غالب' کے لکھنے کے جواز کے طور پر نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع شدہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مجھے مروجہ ڈرامے دیکھنے کے بعد اکثر کچھ تشنگی سی محسوس ہوتی رہی ہے۔ اس تشنگی سے مجھے ترغیب ملی کہ مرزا غالب کے معرکہ آرا واقعے کو ڈرامہ کے طور پر پیش کر دیا جائے جو سچے واقعات پر مبنی ہو اور پھر اس کو اسٹیج پر کھیلا بھی جا سکے۔ اسی منصوبے کے تحت پروفیسر صادق نے 'اس شکل سے گزری غالب' کے ذریعے مرزا غالب کے کردار، اُس عہد کی تہذیب، اس دور کی سیاسی چال بازیوں اور غالب کے خلاف رچی گئی سازشوں اور بے انصافیوں سے ناظرین کو متعارف کرایا ہے اور اس شعر کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ڈرامے کا اصل موضوع یہ ہے کہ پنشن میں ہوئی بے انصافیوں سے غالب پہلے ہی پریشان تھے لیکن جب اخراجات حد سے زیادہ بڑھ گئے۔ مہاجنوں اور ساہوکاروں سے لیے گئے، سودی قرض کی رقم حد سے تجاوز کرنے لگی اور جب غالب کے تایا سسر نواب احمد بخش کے صرف دلاسہ دینے سے بات بنتی نظر نہ آئی تو غالب نے کلکتے کے سفر کا قصد کیا تا کہ وہاں جا کے کمپنی سرکار کے گورنر جنرل سے اپنی عرضی گزار سکیں۔ اُس وقت ان کی عمر تقریباً 30 سال رہی ہوگی۔ اس سفر کی پوری روداد اس ڈرامے میں موجود ہے۔ دورانِ سفر غالب نے لکھنؤ، بنارس اور عظیم آباد، وغیرہ میں قیام کیا تھا۔ اس عرصے میں ان کی طبیعت بھی خراب ہوئی اور تنگ دستی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ لیکن کلکتے میں ان کے دشمن افضل نے ان کے خلاف وہاں کے عوام اور خواص یعنی وہاں کے مقامی لوگوں اور انگریزی افسران دونوں طبقے کے لوگوں کو غالب کے خلاف بھڑکا دیا اور غالب کو چار و ناچار، وہاں سے خالی ہاتھ اور بے نیل و مرام دلّی واپس آنا پڑا۔

غالب کے چچا نصر اللہ بیگ کو انگریزی سرکار سے ملی جاگیر کے ضبط ہو جانے کے بعد دس ہزار روپے مہینہ کا وظیفہ جاری ہو گیا تھا، لیکن ایک ماہ کے بعد اس میں خواجہ حاجی نے سازش رچی اور اس پنشن کا تین فریقین میں بٹوارہ ہو گیا۔ خواجہ حاجی، غالب اور غالب کی دادی۔ اس پہ مستزاد یہ کہ پنشن کی رقم منہا کر کے پانچ ہزار کر دی گئی تھی۔ بڑے حصے پر خواجہ حاجی خود قابض ہو گیا۔ اسے دو ہزار روپے مہینہ وظیفہ اور بقیہ تین ہزار کی رقم میں سے غالب اور غالب کی دادی ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے پنشن کے حقدار قرار دیے گئے تھے۔ جبکہ چچا نصر اللہ بیگ کے وارثین میں ان کی تین سگی بہنیں یعنی غالب کی پھوپھیاں اور ایک بھتیجا یعنی غالب کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف جس کی عمر سات سال تھی، وہ بھی شامل تھے۔ لیکن ان چاروں میں سے کسی کا نام تک اس سرکاری دستاویز میں شامل نہ تھا۔

نواب احمد بخش سے غالب کا سسرالی رشتہ تھا۔ وہ ان کے چچا سسر تھے۔ لہٰذا، ان سے اس موضوع پر کبھی کھل کر بات نہیں ہو سکی تھی اور چچا مرحوم کا چھوڑا ہوا زر کبھی رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ چناں چہ پنشن کی رقم کم پڑنے لگی تو مرزا نوشے میاں نے قرض لینے کی شروعات کر دی۔ آمدنی تو بڑھی نہیں۔ قرض دن بہ دن بڑھتا چلا گیا۔

یہ ڈرامہ پنشن کے سلسلے میں غالب کی ایک طویل جدوجہد اور نامساعد حالات کے سچے واقعات پر مبنی ہے۔ اس

حوالے سے غالب نے جتنے بھی اسفار کیے اور اس کی صعوبتیں برداشت کیں اور جن سازشوں کا انھیں قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا، وہ سب اس ڈرامے میں دستاویزی حقائق کے ساتھ بیان کردیے گئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ تین سال کے لیے غالب کی پنشن بند ہوگئی تھی۔ 1857 میں غدر کے بعد دوبارہ پنشن جاری ہوئی۔ گھر میں کھانے والے بیس افراد تھے اور ساٹھ روپے آٹھ آنے مہینہ کی پنشن تھی۔ والیِ رام پور سے ماہانہ سو روپے کا وظیفہ آجاتا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں غالب نے اپنی زندگانی کا سفر طے کیا۔ لیکن ان کے اندر کا ایقان اور استقلال انھیں نچلا بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ انھوں نے اخیر تک انصاف کی جنگ جاری رکھی۔ حتیٰ کہ برطانیہ کی ملکہ معظمہ کو بھی خط لکھا اور حق بات پر سینہ سپر ہوکر ڈٹے رہے۔ یہ ایسے واقعات ہیں جو غالب کی جہاندار شخصیت کے اس وصف کو نمایاں کرتے ہیں کہ ان کے اندر رجائیت تھی۔ زندگی کے تئیں ان کا یہی مثبت رویہ تھا جس کی وجہ سے وہ کبھی کسی چیز کو آسانی سے ہاتھ سے جانے نہیں دیا کرتے تھے۔ یعنی انھوں نے اپنے نصب العین سے کبھی روگردانی نہیں کی اور اپنے موقف پر ثابت قدم رہے۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے تمام عمر سعی کرتے رہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ انھیں اپنی قسمت پر کبھی بھروسہ نہیں تھا۔ سیاہ بختی اور طالع خفتہ کا احساس تمام عمر ان کے دامن گیر رہا، وہ اپنے ساتھ ہوئی اس بے انصافی اور حق تلفی کے لیے داورِ محشر سے بھی فریادرسی کے متمنی تھے۔

غالب کی زندگی کے مذکورہ واقعات کو ڈرامے میں بہت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ 12 ایکٹ اور مرزا یوسف اور ہمزاد سمیت تقریباً 15 کرداروں پر مشتمل یہ ڈرامہ دہلی اردو اکادمی کے ذریعے شری رام سینٹر، منڈی ہاؤس، نئی دہلی میں 28، نومبر 2019 کو شام 6:30 بجے پیش کیا گیا تھا۔ میں اس ڈرامے کا فی نفسہ ایک ناظر رہا ہوں۔ مرزا غالب کے کردار میں ایک تو اُس نوجواں غالب یعنی مرزا نوشہ کو دکھایا گیا ہے جس کی عمر تیس سال تھی۔ جوانی کی رعنائیاں اور ان کے جوش و خروش کو اسٹیج پر بہت پرکشش طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

بعدازاں، غالب کے بڑھاپے کی حالت کو جب مرزا غالب چھڑی کی مدد سے چلتے پھرتے تھے، بہت ہی ضعیف اور ناتواں، بلکہ نیم جاں والی حالت کو اسٹیج پر بڑے موثر انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی زوجہ امراؤ بیگم کا کردار بہت جاذبِ نظر اور خوش باش طور پر دکھایا گیا ہے۔ ان کے بھی ایامِ شباب کو اور پھر ڈھلتی ہوئی عمر کے ٹھہراؤ کو بحسن و خوبی اسٹیج کیا گیا ہے۔

اسکرپٹ رائٹر کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو پروفیسر صادق نے اس میں بھی اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ یہاں، مثال کے طور پر ان کی اس فن پر استادانہ گرفت کی بات کی جائے تو ماہرین ڈرامہ جانتے ہیں کہ ڈائیلاگ کے ذریعے ہم خارجی، مادّی یا تاریخی واقعات کو تو آسانی سے ناظرین کے سامنے پیش کردیتے ہیں۔ لیکن معاملہ جب قلبی واردات کا ہو تو اس میں خود کلامی سے کام لیا جاتا ہے۔ Monologue اور Soliloquy مکالمے کے دو بہت مؤثر ذرائع اظہار مانے جاتے ہیں۔ لیکن پروفیسر صادق، چونکہ خود بھی رنگ منچ سے ایک اداکار کی حیثیت سے وابستہ رہے ہیں، اس لیے انھوں نے اداکار کی سہولت، رنگ منچ کی رنگا رنگی اور ناظرین کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے مرزا غالب کا ہمزاد تخلیق کردیا۔ ان کا یہ تجربہ بہت زبردست ثابت ہوا۔ اداکاروں نے جس روانی کے ساتھ برجستہ اور بے ساختہ انداز میں مکالمات ادا کیے، وہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔ ہمزاد کے تلخی آمیز مکالموں کی ادائیگی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ پروفیسر صادق کے مکالمات نے قصیدہ اور غزل میں بیان ہونے والی تجّی اور جھوٹی تعریف کے فلسفے کو طشت از بام کردیا ہے۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ مرزا اپنے ہمزاد کے آگے لاجواب ہوکر بغلیں جھانکتے نظر آئے ہیں۔ اس مقام پر ناظرین نے دل کی گہرائیوں سے داد دی ہوگی۔ میں، ایسا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ شور مچانا یا خوشی سے تالیاں بجانا رنگ منچ کی تہذیب کے منافی ہوتا ہے۔ لہٰذا، اُس وقت کے دورانیہ میں پن ڈراپ خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ ناظرین زبانِ حال سے اس کی پذیرائی کررہے تھے۔

اس ڈرامے کی ڈیزائننگ اور ہدایت کاری میں پرتیبھا سنگھ نے بھی اپنے فن کا دل کھول کے مظاہرہ کیا ہے۔ اشعار کے پس منظر میں چل رہے رقص کی موومنٹ نے جو منظر کشی کی ہے، وہ بہت دلکش معلوم ہوتی تھی اور نظروں کو باندھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ اس کے علاوہ، انگریز کردار خواہ وہ پچاس سالہ افسر سائمن فریزر ہو یا برٹش حکومت کا چیف سکریٹری پچپن سالہ انگریز سوئن ٹن یا پھر اس کا ماتحت، پچاس سالہ انگریز ہنری، ان سب کی برٹش لب و لہجے (Accent) میں اردو کے ڈائیلاگ ساعت فرمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں دلّی کے نوجوان اداکاروں نے اپنے جذبات اور اپنی توانائیاں جھونک دی تھیں۔ جس سے مکالمات کے بے ساختہ اور فطری ہونے کا زبردست احساس ہوتا تھا۔ کرداروں کے ملبوسات، حقہ اور پاندان اور نشست و برخواست کے فرشی انتظامات، کلومیاں کا بار بار ازار بند میں گرہ لگانا یہ ایسے عمل تھے جس سے مغلیہ عہد کی طرزِ معاشرت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس ڈرامے کی کامیابی یہ ہے کہ ڈھائی گھنٹے کے لیے ہر تماش بین ذہنی طور پر غالب کے زمانے میں خود کو سیر کرتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔

پروفیسر صادق نے مرزا غالب کی والدہ عزت النسا بیگم کو ایک پروقار خاتون کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کی کردار سازی بہت محنت سے کی گئی ہے۔ اس ڈرامے میں ان کے بال سفید اور ملبوسات بھی سفید دکھائے گئے ہیں، جس کی ستائش نہ کرنا فنکار کی حق تلفی کے مترادف سمجھا جائے گا۔ ڈومنی نواب جان کے رقص کو بھی بنارس کی شام میں یادداشت کے طور پر پیش کردیا گیا ہے جس کے بغیر عام ناظرین کے لیے غالب کے ڈرامے میں دلچسپی کے فقدان کو محسوس کیے جانے کا احتمال برقرار رہ جاتا۔ ڈرامہ کی ڈائریکٹر نے جابجا رقص، موسیقی اور بیک ڈراپ میں مصوری کے ذریعے مختلف تہذیبی مناظر کو پیش کرکے ناظرین کی دلچسپی بنائے رکھنے میں بڑا زبردست کام انجام دیا ہے۔

کلومیاں کا لنگ پا ہونا، لونڈی وفادار کی تلاہت اور رائے چھجمل کی یاری، مداری خان کی چھوٹی چھوٹی خدمت گزاری، افضل بیگ اور عبدالکریم کی مکاری اور دغابازی، انگریز افسران کی مستعدی و ہشیاری اور ان سب سے بڑھ کے ہمزاد کی تنہائیوں میں ہم کلامی سب یاد رہ جاتی ہیں۔ ناظرین کے حافظے کا حصہ بن کے اسٹیج سے باہر جانے پر بہت دیر تک اپنی گل کاریاں کرتی رہتی ہیں۔

اسٹیج ڈرامے کے کرافٹ میں متعدد ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں، جو ڈرامے کے مسودے کا حصہ نہیں ہوتیں، مگر زیبِ داستان اور ناظرین کی حس سامعہ و بصارت کو باندھے رکھنے کے لیے ہدایت کار اپنی طرف سے کچھ چیزوں کا اضافہ کردیتا ہے۔ لہٰذا، اس ڈرامے کا موضوع کافی گمبھیر تھا مگر ہدایت کار پرتیبھا سنگھ نے اسے پرلطف اور دلچسپ بنانے کے لیے جابجا تفریحی عناصر کا استعمال کیا ہے۔ جس طرح شیکسپیئر نے سب سے پہلے یونان کے المیہ ڈراموں کے اصول کے برخلاف اپنے ڈراموں میں Comical elements کا استعمال کیا تھا۔ اسی طرح پرتیبھا نے اپنے اسٹیج کرافٹ کے تجربے کو بروئے کار لا کر اس کی المناکی کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے، جسے ذاتی طور پر میں بھی مستحسن سمجھتا ہوں۔ ان طربیہ عناصر کا فائدہ یہ ہوا کہ بحیثیت مجموعی تماش بین اس ڈرامے سے بے حد محظوظ اور لطف اندوز ہوکر اُٹھتے ہیں۔ ایسے بہترین ڈرامے روز روز نہیں اسٹیج کیے جاتے، جن میں ڈرامے کی تینوں ہی اکائیاں اپنے عروج و کمال پر ہوں یعنی ٹائم، اسپیس اور ایکٹ اور ان میں ایسا زبردست تال میل شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

■

Dr. Perwaiz Shaharyar
Flat No: 4/48, NCERT Campus
Sri Aurobindo Margm, New Delhi - 119916

غالب تاریخ کے دوراہے پر

ایک جائزہ

ثاقب عمران

تحقیق وتنقید کی دنیا میں جن ادیبوں اور دانشوروں نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور اپنے علم اور محنت کے ذریعے اس میدان میں بیش بہا اضافے کیے، ان ادیبوں اور دانشوروں میں ایک اہم نام نثار احمد فاروقی کا بھی ہے۔ وہ میدانِ تحقیق وتنقید میں حوالے کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے نام کو اردو دنیا جانتی، ان کے کام کو پہچانتی اور ان کی قابلیت کا اعتراف بھی کرتی ہے۔ انھوں نے ادیب، محقق، ناقد، شاعر اور مترجم کی حیثیت سے دامنِ علم وادب کو بجا طور پر وسعت دی ہے۔

نثار احمد فاروقی کا اسلوبِ تنقید ایک منفرد انداز کا حامل ہے۔ وہ اپنی ترجیحات کو پیش کرنے کے لیے سیدھے سادے اور سپاٹ انداز سے گریز کرتے ہوئے مدلل گفتگو کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس کا معقول جواز بھی پیش بھی کرتے ہیں۔ ان کی تصنیفات، تالیفات اور مضامین کی فہرست خاصی طویل ہے کہ میر، غالب، مصحفی، اقبال، آزاد اور ابوالکلام آزاد کے ساتھ سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔

نثار احمد فاروقی کی ایک اہم کتاب 'تلاش غالب' ہے، جس میں غالب سے متعلق تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں نثار احمد فاروقی نے غالب کی زندگی اور فن کے بعض نئے پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ غالب شناسی کے ضمن میں یہ کتاب اس لیے بہت اہم ہے کہ اس میں غالب پر بعض ایسے مضامین شامل ہیں جن سے مطالعۂ غالب کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ 'تلاش غالب' غالب کی تفہیم وتحقیق میں اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ بطور خاص اس کتاب میں غالب کے دیوان نسخۂ امروہہ کی بحث بہت اہم ہے۔ نثار احمد فاروقی غالبیات سے متعلق تحقیقی اور تنقیدی کاموں سے مطمئن نہیں تھے یوں بھی ان کے جیسا اعلیٰ تحقیقی ذہن اور تنقیدی شعور رکھنے والا، کسی بھی تحقیقی منزل پر مطمئن نہیں ہوسکتا۔ وہ تو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے اور نئے تحقیقی انکشافات اور تنقیدی نکات کی جستجو کرتا رہتا ہے۔ 'تلاش غالب' میں شامل مضامین ان کے اسی تحقیقی ذہن اور تنقیدی شعور کے غماز ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے سہل نگاری اور قناعت پسندی سے دامن بچاتے ہوئے 'غالب تحقیق' کے نئے دروازے کھولنے اور غالب کی شخصیت اور ان کے کلام کو ان کے تاریخی اور تہذیبی سیاق میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی کتاب میں ایک اہم مضمون 'غالب تاریخ کے دوراہے پر' ہے۔ میں نے اپنے مضمون کی عمارت اسی مضمون پر قائم کی ہے۔

نثار احمد فاروقی نے 'غالب تاریخ کے دوراہے پر' میں مرزا غالب کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اس امر کا بھی خاص خیال رکھا ہے کہ غالب کے سیاسی اور سماجی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے سلطنت مغلیہ کے زوال کی وہ کہانی نہ دہرائی جائے جسے بیشتر ادیب مغل حاکموں اور ان کے نااہل جانشینوں سے شروع کرتے ہیں اور اس کا اختتام 1857 میں ہونے والی ہندوستان کی آزادی کی کوشش پر کرتے ہیں۔ اس مضمون کی بنیادی بات یہ ہے کہ ہمیں کسی فن کار کا سیاسی اور سماجی پس منظر جاننے اور اسے بیان کرنے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔ کیا کسی بھی ادب پارے یا فن پارے کو سمجھنے کے لیے اس ادیب کی زندگی، اس کے احوال، اس کے معاشی حالات، اس عہد کا ماحول، اس وقت کا سیاسی اور

تلاشِ غالب

پروفیسر نثار احمد فاروقی

سماجی ماحول جاننا ضروری ہے؟ کیا ان باتوں کو جانے بغیر کسی بھی ادب کو سمجھنا یا اس کی صحیح پرکھ کرنا ممکن نہیں؟ ان تمام سوالات کو خود نثار احمد فاروقی نے اپنے اس مضمون میں اٹھایا ہے اور ان کے جواب غالب اور اس کے عہد کو بنیاد بنا کر تفصیل سے دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس دنیا کی عمر آپ تھوڑی دیر کے لیے چند ہزار سال سمجھ لیجیے۔ انسان کی جبلت ہزاروں سال سے وہی ہے، بقائے نسل کی خواہش، بقائے ذات کی کشش، خوف، تحفظ کا احساس۔ اسی طرح انسانی نفسیات اور جذبات بھی وہی ہیں۔''[1]

جس طرح زمانہ ماقبل میں کسی حسین صورت یا دلفریب منظر کو دیکھ کر لوگوں کو مسرت ہوتی رہی ہوگی، آج بھی لوگوں کی کیفیت اس سے مختلف نہیں ہے۔ آج جس طرح کسی باغیچے میں چہل قدمی کرتے وقت لوگ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے مناظر، رنگ برنگے پھول اور ہریالی سے فرحت محسوس کرتے ہیں، پہلے زمانے کے لوگوں کے جذبات بھی اس سے مختلف نہیں رہے ہوں گے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ، بارش کا ہونا، پھولوں کا کھلنا اور اس کی خوشبو، نیز قدرت کے جتنے بھی خوش نما مناظر ہیں ان تمام چیزوں کا اثر لوگوں کے ذہنوں پر پڑتا ہے۔ لیکن ان چیزوں کا اثر قبول کرتے ہوئے شاعر یا ادیب ان تمام چیزوں کو ادب میں جگہ دینے کی کوشش کریں، ضروری نہیں۔ ذہنوں پر ان تمام مناظر کے اثرات پڑتے تو ہیں لیکن کسی بھی معاشرے میں اگر کوئی تغیر رونما ہوتا ہے، چاہے اس میں سیاسی عوامل کارفرما ہوں یا تہذیبی، کوئی تحریک منظر عام پر آئی ہو یا کسی انقلاب کا پرچم بلند کیا گیا ہو۔ اس کا اثر اس معاشرے میں رہنے والے تمام لوگوں پر یکساں پڑتا ہے اور دیرپا ہوتا ہے۔ انسان اپنے اطراف میں، اپنے معاشرے میں ہونے والی اتھل پتھل کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے۔ چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ حکومت بدل جائے یا باہری طاقتیں حملہ آور ہو جائیں۔ شہر میں خوش حالی کا ماحول ہو، ہر طرف چراغاں ہو اور لوگ عیش وعشرت سے زندگی بسر کر رہے ہوں یا لوٹ مار اور تباہی کی وارداتیں عام ہوں، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو۔ ان تمام حالات کا انسان کے ذہنوں پر اثر پڑنا لازمی ہے۔ ادیب یا شاعر عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں اور یہ تمام چیزیں سوچنے کے انداز اور اظہار کے طریقے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی بھی ادیب یا فن کار کے ادب پارے یا فن پارے کو سمجھنے میں اس ادیب کے عہد کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر اس عہد کو سمجھ لیا جائے تو تخلیق کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''خارجی مظاہر کی یہ سب کیفیات سوچنے کے انداز اور اظہار کے اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لیے فن کار جس تاریخی اور سیاسی سیاق و سباق میں زندہ رہا ہے، اسے گہری نظر سے جانچے بغیر اس کے فن کو بھی اچھی طرح پرکھا نہیں جا سکتا۔''[2]

اس مضمون کی ابتدا میں نثار احمد فاروقی نے غالب کے عہد یعنی 1797 سے 1869 تک پھیلی ہوئی 72 سالہ مُدّت پر سرسری لیکن پرمغز گفتگو کی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کی تاریخ کو بدل دیا۔ اس عہد کو اگر قدیم تہذیب و تمدن اور جدید تہذیب کے درمیان کی کڑی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس عہد میں لوگوں کا ذہن کافی حد تک بیدار ہو چکا تھا۔ یوروپ میں رونما ہونے والے صنعتی انقلاب کی تکمیل ہو رہی تھی۔ اب ایسے ادب کی بات کی جا رہی تھی جو صرف عوام کے لیے ہو۔ جس کا بنیادی مرکز عام لوگ ہوں اور جس سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ یہ نظریہ پیش کرنے والا کارل مارکس اسی عہد کا تھا۔ اس سے پہلے تک ادب بھی زمینداروں کی جاگیر سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسی عہد میں فریڈرک اینگلز پیدا ہوا جس کی فکر سے نئے اشتراکی نظام کی بنیاد پڑی۔ گوئٹے اور فرائڈ جیسی نامور شخصیات اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ غرض یہ کہ اس عہد میں ایسے بلند مرتبہ مفکرین پیدا ہوئے جن کا اثر آج بھی ہماری زندگیوں پر بہت گہرا ہے۔ جن شخصیات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ سب مغرب کے رہنے والے تھے۔ مغربی ادب تیزی سے ترقی کرتا جا رہا تھا جس کے مقابلے میں مشرقی ادب کافی کمزور تھا۔ عالم اسلام میں بھی کئی تحریکیں رونما ہوئیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر وحدت اسلام کی دعوت دے رہی تھیں۔ اسلام کے مرکز میں عبدالوہاب نجدی نے تحریک احیا کا کام شروع کر دیا تھا، جس کا خاتمہ مولانا اسمٰعیل شہید کی شہادت پر ہوا۔ بعد میں اس تحریک احیا نے دوسری شکل اختیار کر لی اور آج ہندوستان کے ہر شہر اور قصبے میں مدارس کی شکل میں چل رہی ہے، جن کا بنیادی مقصد دینی تعلیم کا احیا ہے۔ مذہب نے ہمیشہ اپنے اقتدار اعلیٰ کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے متعلق نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''... عقلیت اور سماجی انقلاب کی جو تحریکیں انیسویں صدی میں اٹھیں وہ سب مغرب کی مادہ پرست اقوام کی طرف سے اٹھیں۔ عالم اسلام نے اگر کوئی انقلابی آواز بلند کی تو وہ دین کے احیا کی آواز تھی۔ اگر افغانی اور سرسید کی طرح تعلیمی یا فکری انقلاب کی کوئی دعوت آئی تو وہ بھی مذہب کی ظلِ حمایت میں آئی۔ شاید اسی لیے مولانا شبلی نے ایک خط میں مولانا آزاد کو لکھا تھا کہ اگر اپنی دعوت کو مقبول و موثر بنانا ہو تو مذہب کا لبادہ اُوڑھ کر آؤ۔''[3]

مولانا شبلی کا یہ جملہ اپنی جگہ درست ہے۔ ماقبل زمانے میں بھی اور دور حاضر میں بھی یہ قول صادق آتا ہے۔ اگر کسی بھی دعوت کو مذہب کا لبادہ اُڑھا دیا جائے تو اس کا خاطر خواہ اثر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود گذشتہ زمانوں کے مقابلے دور حاضر میں لوگوں کی سوچ میں بھی وقت کے ساتھ بہت تبدیلی آئی ہے۔ اس تبدیلی کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلامی حکومت کا کمزور پڑنا یا اس کا ختم ہو جانا۔ دوسرے یہ کہ مغرب پرستی ہماری تہذیب، ہمارے سماج اور ہمارے معاشرے میں در آئی ہے۔ جس کی وجہ سے بھی ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں فیصلہ کرنے اور ان سے احکامات لینے کے بجائے، حالات کے مطابق فیصلہ کرنا بہتر سمجھنے لگے ہیں۔ غالب بھی ایسے ہی دور میں پیدا ہوئے تھے۔ جو معاشرہ یا حکومت نام کو تو مسلمانوں کی تھی لیکن ایک اسلامی حکومت اور مغلوں کی طرز حکومت، معاشرت اور تہذیب و تمدن میں بہت فرق تھا۔ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''انھوں (غالب) نے قدیم و جدید کی کشاکش میں کبھی قدامت کی سرپرستی نہیں کی۔ ان کا مذہب بھی واجبی اور روایتی تھا۔ اہل تقلید نے ایک تو ان کی ذہانت کے سبب معاف رکھا۔ دوسرے اس لیے کہ انھیں غالب کے دور میں سیاسی اقتدار نصیب نہیں تھا۔ ورنہ جو طبقہ ابن المقفع جیسے نابغہ کو 26 سال کی عمر میں یہ شعر کہنے اور زندیقوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنے کی پاداش میں:

یا بیت عاتکته الذی التعزل
حذر العدی و بك الفواد موکل
انی لأمنحك الصدود و اننی
قسماً الیك من اصدود لأمیل

زندہ جلا کر ہلاک کر سکتا تھا، وہ غالب کو 'دین بزرگاں خوش نہ کرد' کہنے پر دار نہیں دے سکتا تھا۔"[4]

نثار احمد فاروقی نے غالب کی زندگی میں ہندوستان میں رونما ہونے والے اہم سیاسی اور تاریخی حوادث پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس میں انگریزوں کا دہلی فتح کرنا ہو یا مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مضبوط سکھ ریاست قائم کرنا وغیرہ۔ انگریزوں نے اپنی حکمت عملی سے نہ صرف ہندوستانیوں پر حکومت کی بلکہ انھوں نے ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالنا بھی شروع کر دی۔ لیکن ہندوستان کی آزادی ایک ایسا مدّعا تھا جس نے تمام ہندوستانیوں کو آپس میں باندھ رکھا تھا اور اسی اتحاد کے نتیجے میں 1857 کی پہلی جنگ آزادی سامنے آئی۔ اس جنگ آزادی نے انگریزوں کی بھی آنکھیں کھول دیں اور ان کو احساس ہو گیا کہ ہندوستانیوں کے اتحاد کو ختم کیے بغیر ان پر حکومت نہیں کی جا سکتی۔ انگریزوں کی پالیسی کے متعلق نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"...اس جنگ آزادی نے انگریزوں کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے یہ محسوس کر لیا کہ ہندوستانیوں کے قومی اتحاد کو پارہ پارہ کر کے ہی وہ اپنے استعمار کو باقی رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ورنا کیولر ایجوکیشن کا وہ نظام شروع کیا گیا جس نے اردو اور ہندی کو قطبین میں بدلنا شروع کر دیا۔"[5]

ورنا کیولر ایجوکیشن کے تحت انگریزوں نے ہندوستان میں تعلیم کے فروغ کے لیے جو بھی رپورٹ پیش کی ہو اور ہندوستان میں تعلیم کی ترقی کے لیے جو بھی تدابیر پیش کی یا اختیار کی ہوں لیکن اس پروگرام کا جو سب سے بڑا نقصان سامنے آیا وہ یہ تھا کہ ہندوستانی، زبان کے نام پر تقسیم ہو گئے۔ پہلے مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں ہندی اور اردو دونوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مدرسوں میں ہندو بچے بھی پڑھتے تھے اور پاٹھ شالاؤں میں مسلمان طالب علم۔ لیکن سید احمد شہید کی تحریک جہاد جو احیائے دین کے لیے شروع ہوئی تھی، اسے بنیاد بنا کر انگریزوں نے اردو اور عربی کی تعلیم کو صرف مدرسوں تک مخصوص کر دیا اور ہندی پاٹھ شالاؤں کے ذمے آ گئی۔ مسلمان اردو اور عربی کو اپنی مادری زبان سمجھنے لگے اور ہندوؤں نے ہندی کی طرف رجوع کرنا شروع کیا۔ سنسکرت کبھی مندروں سے اتری ہی نہیں۔ وہ کبھی عوام کی زبان نہ بن سکی۔ مغل دربار کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کا بھی زوال ہوتا گیا۔ انگریزوں نے اس میدان میں بھی حکومت کرنے کے لیے جگہ جگہ مشنری اسکول قائم کر دیے۔ جس میں انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انگریز مغربی علم و ادب کی اتنی کتابیں ہندوستان لے آئے کہ ہندوستانی اس کی چکا چوندھ میں کھو کر رہ گئے۔ میکالے نے بھی اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ ہمارے یہاں ایک شیلف کا ادب ہندوستان کے تمام ادب پر بھاری ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ ہم ہندوستانیوں کو خون سے تو انگریز نہیں بنا سکتے لیکن ذہنی طور پر اتنا انگریز ضرور بنا دیں گے کہ صبح اٹھنے کے ساتھ چائے کا پیالہ اور اخبار اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ ہندوستان کے نظام تعلیم کے متعلق نثار احمد فاروقی رقمطراز ہیں:

"...ترکی حکومت محمد شاہ پر ختم ہو گئی تھی۔ وہ آخری مغل بادشاہ تھا جس کی مادری زبان ترکی تھی۔ فارسی بچی کچی باقی تھی، اسے ایرانیوں کی لن ترانیوں نے قدم جمانے سے روکا۔ عربی مذہبی مدارس میں معتکف ہو گئی۔ سنسکرت کبھی عوامی چلن کی زبان نہیں تھی۔ ہندی ابھی انگھڑ تھی، اردو کچہری کے مقدمے لڑنے اور رپٹ لکھوانے کے کام آ سکتی تھی۔ دفتری انتظام اور علمی تصانیف کے لیے انگریزی کو صاف میدان مل گیا۔ مشنریوں کو سرکاری سرپرستی میں جگہ جگہ اسکول کھولنے کی سہولتیں دی گئیں۔ ایک نیا نظام تعلیم اور اس کے ساتھ مغرب سے مختلف علوم پر کتابوں کا ایسا سیلاب آ گیا کہ ساری مقامی زبانیں منقار زیر پر ہو کر بیٹھ گئیں۔ چنانچہ انگریزی آج بھی راج کر رہی ہے اور اسے اپنی جگہ سے ہلائیے تو ہمیں عالمی برادری سے اپنا رشتہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔"[6]

مغرب کے علم و ادب کا ہمارے یہاں بہت گہرا اثر پڑا۔ اس کی وجہ سے ہندی اور اردو کی تقسیم تو ہوئی ہی ساتھ ہی ساتھ مغربی تعلیم کا اثر زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ہماری تہذیب پر بھی پڑا۔ ہندوستان میں پہلا، سال پتہ کرنے کے لیے بکرمی اور ہجری کلینڈر کی طرف رجوع کیا جاتا تھا لیکن اب عیسوی سنہ نے ان کی جگہ لے لی۔ دن جو آٹھ پہروں میں تقسیم تھا اس کی جگہ 24 گھنٹوں نے لے لی۔ اس کے علاوہ ہمارے ادب کو جو بہت بڑا نقصان ہوا وہ یہ تھا کہ ہماری زبان یعنی اردو کی لغت کو ترتیب دینے کا کام انگریز کرنے لگے تھے۔ اردو کی ایک لغت اور اس کے اصول و قواعد کی ایک کتاب گلکرسٹ نے بھی تیار کی۔ ہم غفلت میں مبتلا رہے۔ ہم صرف اپنی دل طبعی میں لگے رہے۔ اردو ادب میں ہمارا رول صرف اتنا تھا کہ ہم غزلیں کہہ کر ہی خوش ہو لیا کرتے تھے اور دوسری طرف انگریز ہماری تہذیب اور ہمارے مذہب کی تاریخ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے یہ چیزیں لکھنے میں نہ جانے کتنی چیزیں حذف اور کتنی چیزیں اپنی طرف سے شامل کر دی ہوں گی۔ انگریز ملک کی دولت کو تو برطانیہ بھیج ہی رہے تھے، ساتھ ہی ساتھ وہ ہندوستان کے ادب کو بھی برطانیہ کی لائبریریوں کی طرف روانہ کر رہے تھے۔ چنانچہ آج بھی بڑی مقدار میں ہمارا قدیم ادبی سرمایہ برطانیہ کی لائبریریوں میں محفوظ ہے۔

نثار احمد فاروقی نے 'غالب تاریخ کے دوراہے پر' میں غالب کو ایک نئے اور اچھوتے پہلو سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کی پیدائش آگرہ میں ہوئی۔ آگرہ کے قریب فتح پور سیکری پر اس وقت تک انگریز قابض ہو چکے تھے اور دھیرے دھیرے پورے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرتے جا رہے تھے۔ انگریزوں نے ڈیوائڈ اینڈ رول کی پالیسی اپنائی تھی۔ وہ ہندوستانیوں کو دولت، جاگیر اور حکومت میں اعلیٰ مرتبوں کا لالچ دے کر اپنے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بناتے جا رہے تھے۔ ہندوستان میں ہر طرف ابتری چھائی ہوئی تھی۔ ان حالات میں جب کہ اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا تھا، لوگ ظاہری مرتبے اور القاب و آداب کو اپنی شان سمجھنے اور اس پر قناعت کرنے لگے تھے۔ حکومت سے وابستہ رہنا اپنے لیے فخر سمجھتے تھے۔ بھلے ہی وہ حکومت انگریزوں کی ہی کیوں نہ ہو۔ غالب بھی امیر زادے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب سلجوقی خاندان اور افراسیاب تک پہنچتا ہے۔ غالب کی بدقسمتی کہ انھوں نے جب آنکھ کھولی تو ان کے خاندان کی بادشاہت تو نہ تھی لیکن ان کے والد اور چچا حکومت میں اچھے مرتبے پر فائز تھے۔ لیکن بچپن میں ہی ان دونوں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ان کی زندگی میں پریشانیوں کی وہ لہر آ گئی، جس نے مرتے دم تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ غالب چونکہ امیر زادے تھے، اس لیے ان کی نظروں میں بھی حکومت کی طرف سے ملنے والی مراعات اور القاب وغیرہ بہت اہمیت رکھتے تھے تاکہ جو عظمت ان کے آبا و اجداد کو میسر تھی اس کی شناخت قائم رہے۔ اپنے آبا و اجداد کی، اپنے خاندان کی اور خود اپنی شناخت قائم رکھنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"جب کسی عقیدے یا نصب العین کی روح مر جاتی ہے تو اس کے رسوم و ظواہر کی لکیر پیٹنے میں مبالغہ کیا جاتا ہے، اسی طرح جب سچی طاقت حقیقی سطوت اور واقعی دولت ہاتھوں سے نکل جاتی ہے تو ظاہری القاب و آداب ہی عظمت رفتہ کا نشان رہ جاتے ہیں اور انہیں دانتوں سے پکڑا جاتا ہے۔ یہی سب کچھ غالب کے عہد میں بھی تھا۔

انہیں دربار مغلیہ سے کھوکھلے خطابات پاکر جو طمانیت ہوتی ہے، اپنے قلیل وظیفے کو آثار امارت کے طور پر باقی رکھنے کے لیے جو تگا پو کرتے ہیں، انگریز کے دربار میں کرسی کے لمبر کو جن للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں اور الور، حیدرآباد، اودھ، انگریز ریذیڈنٹ یا ملکہ معظمہ کے دربار سے براہ نام وابستگی کو جو اہمیت دیتے ہیں وہ سب دراصل غالب کی اپنی تہذیبی شناخت کا مسئلہ ہے، اس لیے ان کی نگاہ میں سارے مسئلوں سے زیادہ اہم ہے۔''[7]

ایک جگہ اور نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''... غالب نے تین مغل بادشاہوں کا زمانہ پایا۔ جب انھوں نے آنکھ کھولی تھی تو کورچشم شاہ عالم ایک شامیانے کے نیچے فاعتبروا یا اولی الابصار بنے بیٹھے تھے۔ اور انگریزوں کی عطا کردہ ایک لاکھ ماہانہ پنشن میں مگن تھے۔ پھر اکبر شاہ ثانی کا دور آیا تو یہ پنشن اور بھی کم ہو گئی اور مراعات میں تخفیف کر دی گئی۔ لیکن وظیفہ کے گھٹنے سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ انگریزوں کی طرف سے آنے والی چٹھیوں میں القاب و آداب گھٹتے جا رہے تھے... بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے بالکل ہی شاہ شطرنج بنا دیا تھا۔ اور یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ ان کے بعد کوئی بادشاہ کا لقب اختیار کر کے نہیں بیٹھے گا۔''[8]

مغل بادشاہوں کی ایسی حالت کے باوجود غالب نے بہادر شاہ ظفر کے دربار سے اپنا تعلق قائم کیا اور تاریخ نویسی کے فرائض بھی انجام دیے۔ جس کے لیے ان کی پچاس روپے تنخواہ مقرر تھی لیکن کئی کئی مہینے تنخواہ نہیں ملتی پھر بھی غالب دربار سے اپنا تعلق استوار رکھے ہوئے تھے اور بادشاہ کے مصاحب بن کر اتراتے پھرتے تھے۔ لیکن غالب کو اس بات کا بھی بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ اب مغرب کی حکمرانی مشرق پر بھی ہوگی اور یہ کسی کے روکنے سے رکنے والے نہیں۔ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ 'شاید اسی لیے جب سرسید ان سے آئین اکبری پر تقریظ لکھوانا چاہتے ہیں تو وہ مغربی تہذیب کا ایک قصیدہ نظم کر کے بھیج دیتے ہیں۔ جس کے بین السطور میں یہ ہے کہ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ اکبر اعظم کا زمانہ واپس آنے والا نہیں'۔[9] شاید یہی وجہ تھی کہ جب مغل حکومت کا سورج غروب ہو گیا اور انگریز قابض ہو گئے تو غالب نے اپنے دامن میں لگے دربار مغلیہ کی وفاداری کا داغ دھونا شروع کر دیا۔ جب کہ 1857 کی جنگ آزادی میں غالب کا بھی ناقابل تلافی نقصان ہوا تھا۔ ان کا مال و اسباب، خلعت و مراعات سب لٹ گیا۔ ان کی تنخواہ بند ہو گئی تھی۔ جس کو پھر سے شروع کرانے کے لیے غالب کو بہت مشقت کرنی پڑی۔ غالب نے یہ بات بہت اچھی طرح سے محسوس کر لی تھی کہ مغل حکومت کا عہد واپس لوٹ کر آنے والا نہیں ہے اور اب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت رہے گی۔ اس لیے ساری تباہی کے باوجود بھی وہ ہندوستانیوں کو ہی اس کا مجرم ٹھہراتے رہے۔ غالب کے اس رویے کے بارے میں نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ اس رویے کا تعلق غالب کی خود غرضی سے نہیں ہے بلکہ یہ بھی ان کا تاریخی شعور ہے۔ جسے 1857 سے ایک نئی مہمیز ملی تھی، یا اسے تاریخی وجدان کہہ لیجیے جو انہیں یہ بتا رہا ہے کہ محض ہندوستانی باغیوں کی وکالت کرنا یا ان کی مظلومیت کا مرثیہ پڑھنا تاریخی اور تہذیبی قوتوں کے اس تصادم میں پیش آنے والے فیصلے کو بدل نہیں سکتا۔''[10]

اس میں کوئی کلام نہیں کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور اس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ غالب نے مسجع اور مقفیٰ جملوں سے گراں بار اردو نثر کو عام فہم بنایا۔ اگر کوئی ادیب یا شاعر فن کی بلندیوں پر فائز ہے تو کیا وہ بحیثیت انسان بھی عظیم ہو سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔ اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی اختلاف نہیں کہ فن اور شخصیت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ادبی دنیا میں Legend بننے کے لیے شخصیت کا روشن و تابناک ہونا ضروری نہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس سے محسوس ہوتا ہے کہ نثار احمد فاروقی غالب کی شخصیت سے اس قدر مرعوب نظر آتے ہیں کہ غالب کی انگریز نوازی بھی انہیں تاریخی شعور نظر آتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے 1857 کی جنگ آزادی کے ذیل میں غالب کے رویے کو دوسرے نظریہ سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ غالب نے 1857 کی جنگ آزادی کا ذمے دار ہندوستانیوں کو ٹھہرایا اور ہندوستانیوں کو باغی، حکومت برطانیہ کا غدار اور نہ جانے کون کون سے القاب سے نوازا۔ تاریخ کا طالب علم ہو یا ادب کا، غالب کے اس رویے کو انسانیت سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ محض حکومت برطانیہ کی نوازشوں کے حصول کے لیے ان کے تمام مظالم کو نظر انداز کر کے ان کا قصیدہ پڑھنے اور ہم وطنوں کی تحقیر کرنے کو دور اندیشی اور تاریخی شعور کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

نثار احمد فاروقی اپنے مضمون 'غالب تاریخ کے دوراہے پر' کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس طرح غالب نے تاریخ کے دوراہے پر پہنچ کو وہ راستہ اختیار کیا جس پر وہ اگر اور زندہ رہتے تو چلتے، لیکن سرسید اسی راہ پر چلے اور ہمیں بھی یہی ایک گلی دور تک جاتی نظر آتی ہے۔''[11]

اس میں کوئی کلام نہیں که مرزا اسد الله خاں غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور اس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی که غالب نے مسجع اور مقفیٰ جملوں سے گراں بار اردو نثر کو عام فهم بنایا۔ اگر کوئی ادیب یا شاعر فن کی بلندیوں پر فائز ہے تو کیا وہ بحیثیت انسان بھی عظیم ہو سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔ اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی اختلاف نہیں که فن اور شخصیت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ادبی دنیا میں Legend بننے کے لیے شخصیت کا روشن و تابناک ہونا ضروری نہیں۔

چاہے غالب نے انگریزوں کو درست قرار دیا ہو یا سرسید نے انگریزی تعلیم کی طرف زور دیا ہو اور انگریزوں کی حمایت کرتے رہے ہوں لیکن سرسید اور غالب کا موازنہ درست نہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں۔ ایک ہی تاریخی حادثے پر کتابیں لکھنے کا دونوں کا مقصد بھی الگ الگ ہے۔ 'اسباب بغاوت ہند' اور 'دستنبو' میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان لوگوں کا مقصد خواہ کچھ بھی رہا ہو۔ لیکن اگر ہم آج کے تناظر میں بات کریں تو ہمیں نثار احمد فاروقی کا یہ جملہ ''ہمیں بھی یہی ایک گلی دور تک جاتی نظر آتی ہے'' بہت معنی خیز اور حقیقت کے بہت قریب نظر آتا ہے۔ اسے ہماری مجبوری کہیے یا ہماری ضرورت، چاہے تہذیب کا معاملہ ہو یا علم و ادب کا، ہم آج بھی مغرب پرستی میں پیچھے نہیں ہیں۔

حوالہ جات:

1. نثار احمد فاروقی، غالب تاریخ کے دوراہے پر، تلاش غالب 1999، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص 343
2. ایضاً، ص 343
3. ایضاً، ص 342
4. ایضاً، ص 342
5. ایضاً، ص 345
6. ایضاً، ص 345
7. ایضاً، ص 344
8. ایضاً، ص 347
9. ایضاً، ص 348
10. ایضاً، ص 349
11. ایضاً، ص 349

Dr. Saquib Imran
Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

مناظر عاشق ہرگانوی

مظفر حنفی
یادیں باتیں

مظفر حنفی بلند قامت تھے۔ اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی۔ انھیں عزت ملی اور شہرت بھی ملی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے کلکتہ یونیورسٹی تک انھوں نے سلوک کو جائزہ بنایا اور ایک محتسب کی حیثیت سے اپنی چھاپ چھوڑی۔ افسانہ لکھا، شاعری کی، تحقیقی کام کیا، تنقید کی طرف توجہ دی، بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا اور ترجمے کا بھی کام کیا۔

مظفر حنفی سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی یاد نہیں ہے۔ لیکن وہ میرے گھر آئے تب ان سے قربت بڑھی۔ 1996 میں بھاگلپور کے ڈی ایم نے کل ہند مشاعرے کا پروگرام بنایا اور میرے ذمے شاعروں کو بلانے کا کام سونپا۔ شاعروں سے رابطے کے لیے میں خود پٹنہ اور دہلی گیا۔ دہلی میں مظفر حنفی کے گھر پہلی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ وہیں طے پایا کہ فہمیدہ ریاض دہلی میں ہیں۔ انھیں بھی مدعو کیا جائے تاکہ مشاعرہ انٹرنیشنل ہوجائے۔ رفیق الزماں دہلی میں میرے رہنما تھے۔ مظفر حنفی نے اپنے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں چائے ناشتہ کرایا۔ یہ ڈرائنگ روم مظفر حنفی کا نگار خانہ تھا۔ ان کی تصویریں، ان کی کتابیں، ان کو ملے ایوارڈس اور ان سے متعلق دیگر معلومات سے بھرا یہ گھر ایک نظر میں مظفر حنفی کا شناخت نامہ تھا۔ بعد میں درجن بھر ان کے گھر بٹلہ ہاؤس گیا اور اسی کمرے میں بیٹھا، ہر بار ایک ہی نظارے سے واسطہ پڑا۔ استادی عرق ریزی ان کے یہاں تھی جو منقش روداد کا احاطہ کرتی تھی۔

مشاعرے میں مظفر حنفی بھی غلام ربانی تاباں، فہمیدہ ریاض، کمار پاشی، مخمور سعیدی اور دوسرے شعرا کے ساتھ آئے، انھیں یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا۔ مشاعرے کی اگلی صبح افتخار امام صدیقی، زیب غوری، ان کی اہلیہ، فہمیدہ ریاض اور مظفر حنفی میرے گھر پر آگئے۔ بغیر اطلاع دیے اچانک آجانے پر مجھے حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ خوشی ہوئی۔ ایک آدھ گھنٹے کی اس ملاقات میں ہم نے ایک دوسرے کے لیے قربت محسوس کی۔ کتابیں اور رسائل اپنی جگہ پر لیکن فکری سطح پر ملاقات کے سلسلے کو ایک الگ عنوان اور نام دیا جاسکتا ہے جس کی جھنکار کی جھنجھناہٹ میں اپنائیت اور خلوص کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔ ہم قلمکاروں کے لیے محبت دفاعی ہتھیار ہے۔ جس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ علم و ادب کے خزانے لٹانے والے کثرت میں جیتے ہیں اور نئی جہت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

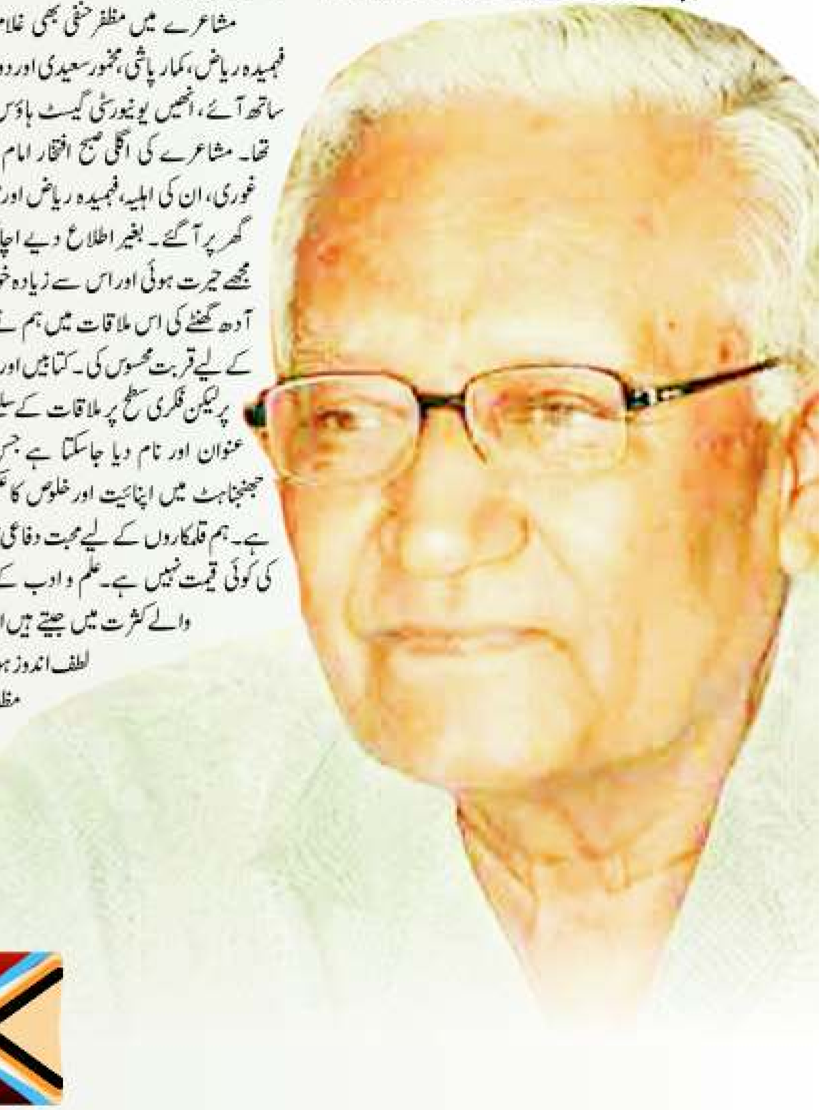

مظفر حنفی وسیع النظر اور کشادہ دل انسان تھے اور تکریم احساس کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کی ایک مثال دینا چاہتا ہوں، میں اس وقت ریڈر کی پوسٹ پر تھا اور مظفر حنفی اقبال چیئر کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ میرے پروفیسر بننے کا مرحلہ شروع ہوا تو ایک اکسپرٹ مظفر حنفی کو بنایا گیا۔ وائس چانسلر کی طرف سے خفیہ طور پر میرے کاغذات مظفر حنفی کو بھیجے گئے۔ انھوں نے میری حمایت میں اپنی رپورٹ بھیجنے کے بعد مظہر امام کو خبر دی کہ "مناظر صاحب پروفیسر بن گئے ہیں۔"

مظفر صاحب نے خود مجھے اطلاع نہیں دی کہ معاملہ ابھی راز کا تھا۔ لیکن انھوں نے مظہر امام کے ذریعے مجھے مبارک باد بھی دی۔ یہاں احساسات، خیالات اور الفاظ کے کلیش سے نبرد آزمائی نہیں تھی بلکہ مطالعے کی روشنی کی جگمگاہٹ تھی جو مظفر حنفی کے بطن میں تھی۔ یہ طرز زندگی کی ایک انفرادیت ہے جس سے شخصیت کا آئینہ سامنے آتا ہے جس کی آفاقی اہمیت ہوتی ہے۔ اسے فنکارانہ ذات کا اسلوب اور نئے پن کے سراغ کی چمک کہہ سکتے ہیں۔

مظفر حنفی اپنی بیشتر کتابیں مجھے بھیجتے تھے اور میں اپنے رسالہ 'کوہسار جرنل' میں یا دیگر رسائل میں تبصرہ ضرور کرتا تھا۔ کبھی 'کوہسار' میں انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ہر شمارے میں کسی نہ کسی شخصیت سے میرے انٹرویو شائع ہوتے تھے، مظفر حنفی سے بھی میں نے انٹرویو شائع کیا تھا۔ اس طرح ان کی شخصی اور ادبی فنکاری پر روشنی پڑتی ہے؟ نئی معلومات حاصل ہوتی ہے اور بہت سے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

ہرگانوی: غزل آپ کے مزاج سے زیادہ قریب ہے یا نظم

مظفر: غزل، میرا مقطع ہے۔

بری نہیں ہے مظفر کوئی بھی صنف ادب
قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے

ہر چند کہ آپ نے وجہ دریافت نہیں کی، پھر بھی اجمالاً عرض کردوں کہ ادب کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ مختصر ترین لفظوں میں بات یوں کہی جائے کہ سننے والے کے دل میں اتر جائے۔ غزل اس باب میں سب سے زیادہ کامیاب ہے۔

ہرگانوی: کیا نثری نظم کا زور ختم ہوگیا؟

مظفر: حقیقت یہ ہے کہ اردو میں نثری نظم نے کبھی زور نہیں پکڑا۔ ہمارے ہاں پابند شاعری کی اتنی چھتنار روایت ہے کہ آزاد نظم کو ہی جڑیں جمانے میں دشواری ہورہی ہے۔ ویسے نثری نظمیں آج بھی چھپ رہی ہیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ تجرباتی چیزیں زندہ رہ سکیں گی۔

ہرگانوی: آپ ایک مدت تک کہانیاں لکھتے رہے لیکن اب باضابطہ طور پر شاعری کر رہے ہیں اور تنقید لکھ

رہے ہیں اس تبدیلی کی وجہ؟

مظفر: یہ سچ ہے کہ 1952 تا 1960 میں نے افسانے زیادہ لکھے، شاعری کم کی۔ پھر جب 1959 میں ماہنامہ 'نئے چراغ' کی ادارت سنبھالی تو ساتھ ہی تجارت کا کام بھی تھا۔ وقت کم ملتا تھا کہانیاں لکھنے کا۔ چنانچہ اس زمانے میں رسالے کے لیے ارسطو ثانی کے نام سے منی کہانیاں (افسانے) کافی لکھے۔ غزل کے اشعار چونکہ ایک نشست کا مطالبہ نہیں کرتے، مختلف اوقات میں ہوتے رہتے ہیں اس لیے اس طرف رغبت زیادہ ہوگئی، مزید برآں جدیدیت کے رجحان نے شاعری کے ساتھ نثر اور فکشن میں بھی علامت پسندی اور تجریدیت کو پسندیدہ قرار دیا لیکن میرا ذاتی خیال تھا اور اس بارے میں اس دور کے ناقدین کے مباحثے بھی رہے کہ علامت، ابہام، تجرید وغیرہ شاعری کے زیور ہیں۔ ان کے استعمال سے افسانہ 'منہ بند' ہوجاتا ہے۔ جب اس رویے میں شدت آئی تو میں نے غزل کو اپنا لیا کیونکہ اس کا تو خمیر ہی رمزیت اور اشاریت سے اٹھا ہے۔ اسی کے آس پاس شاد عارفی کا شاگرد ہوا اور اوائل 1962 میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے ہمعصر ناقدین بوجوہ ان سے خفا تھے اور میں چاہتا تھا کہ مرحوم کے فن پر تنقیدی اور تحقیقی کام ہو۔ لہٰذا خود ہی ابتدا کی اور مضامین کے علاوہ ان پر ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی مقالہ بھی لکھا۔ پھر یونیورسٹی کی ملازمت میں آکر پیشہ ورانہ تقاضوں کے تحت بھی تنقید کے میدان میں اترنا پڑا۔ سو نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

ہرگانوی: آپ نے تدوین کا بھی اہم کام کیا ہے۔ اس کی افادیت بتائیں؟

مظفر: تدوین بے شک ایک اہم ادبی کام ہے، ذوق پر مولانا محمد حسین آزاد نے یا شاد عارفی پر اس خاکسار نے توجہ نہ کی ہوتی تو غالباً ان اہم فنکاروں کو ان کا جائز ادبی

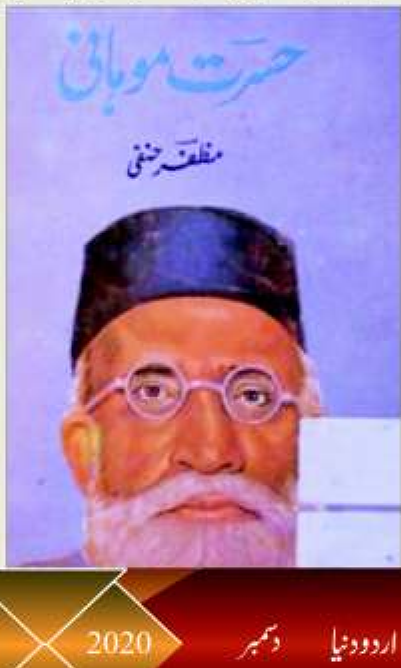

مقام نہ ملتا یا بہت دیر سے ملتا۔

ہرگانوی: ہمارے یہاں علامتی شاعری کئی مرحلے سے گزری۔ اس کی ترقی کے امکانات کیا ہیں؟

مظفر: موجودہ صنعتی اور مشینی دور میں بیانیہ شاعری، رزمیہ، مثنوی وغیرہ کا ذوق بہت کم ہوگیا ہے۔ شاعری کی رمزیت اور اس میں علامت کے استعمال سے جو پرتیں پڑتی ہیں اور ہر ذوق کے قاری کی پسند کے مفاہیم اس سے برآمد ہوتے ہیں اس کے پیش نظر علامتی شاعری کے لیے ترقی کا میدان کھلا ہے۔

ہرگانوی: ترجمے کی افادیت؟

مظفر: اس کی افادیت سے کوئی منکر نہیں ہوسکتا۔

ہرگانوی: آج کی اردو صحافت؟

مظفر: بیشتر سنسنی خیزی پر انحصار کرتی ہے لیکن اعلیٰ نمونے کم سہی، نایاب نہیں ہیں۔

ہرگانوی: آپ کی دانست میں آج کے انسان کے کرب کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

مظفر: انسان اور کرب لازم وملزوم ہیں۔ ماضی میں بھی انسان کرب سے دوچار تھا اور مستقبل میں بھی ہوگا۔ تاوقتیکہ سائنسی ترقی اسے احساسات سے عاری نہ کردے۔

ہرگانوی: کیا مشاعرے زبان وادب کے فروغ میں کوئی کردار ادا کرتے ہیں؟

مظفر: بے شک مشاعروں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، البتہ مشاعروں کی بھرمار اور بے کردار، نقلی شاعر اور شاعرات کی کثرت نے اس مفید ادارے کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔

مظفر حنفی کا جواب چشم کشا ہے۔ پانچ دس سوالات اور جوابات اور بھی تھے جنھیں یہاں دے کر خودنوشت کا حصہ نہیں بنانا چاہتا۔ ہاں، اتنا ہے کہ انھوں نے سیاسی پشت پناہی سے نہیں بلکہ اپنی تحریر اور کلام کے بل بوتے پر وہ ادب میں زندہ ہیں۔ ذرائع ابلاغ پر چھائے رہنے کا ہنر انھیں معلوم تھا۔ تقریباً سات یا آٹھ درجن کتابیں ان کے نام سے ہیں۔ مثبت کردار نے انھیں تمام لوازمات کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔

دہلی میں اس دن رفیق الزماں میرے ساتھ اور رہنمائی کررہے تھے۔ پہلے ہم شمع افروز زیدی کے یہاں گئے لیکن وہ گھر پر نہیں تھیں۔ رفیق الزماں نے کہا کہ یہیں پر تھوڑا آگے مظفر حنفی رہتے ہیں، میں نے کہا 'چلیے' اور ہم مظفر حنفی کے یہاں پہنچ گئے۔ باتوں کے دوران جب انھیں بتایا کہ شمع افروز زیدی گھر پر نہیں تھیں تو انھوں نے ایک لطیفہ سنایا۔ وزیر آغا دہلی آئے ہوئے تھے، رسالہ 'بیسویں صدی' کے لیے مظفر حنفی کو وزیر آغا سے انٹرویو لینا تھا۔ میز پر دوسری طرف ٹیپ پر گفتگو ریکارڈ کرنے کے لیے شمع افروز زیدی اور رحمان نیر بیٹھے تھے۔

''یہ محترمہ کون ہیں؟'' وزیر آغا نے شمع کی جانب اشارہ کرکے پوچھا۔

''شمع افروز زیدی ہیں۔ 'بیسویں صدی' کی نائب مدیر ہیں'' مظفر حنفی نے تعارف کراتے ہوئے کہا ''جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ 'اردو ناول میں طنز ومزاح' کے موضوع پر جامعہ سے ہی میری نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ مکمل کررہی ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب، ایک بات رہ گئی۔ ازراہ کرم یہ بھی بتا دیجیے۔''

رحمٰن نیر بول پڑے ''یہ محترمہ میری بیوی بھی ہیں۔'' اس دن بھی ہم دو تین حضرات مظفر حنفی کے گھر پر تھے۔ گفتگو جاری تھی کہ مظفر صاحب نے مجھ سے کہا ''ایک سیمینار شاد عارفی پر کرائیے۔ میں ہر طرح سے تعاون کے لیے تیار ہوں۔''

میں نے اسی وقت عثمان انجم صاحب کو وشاکھا پٹنم فون لگایا کہ وہ اس غیر اردو داں علاقے میں اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ ہر سال نیشنل سیمینار کرتے ہیں اور ماہنامہ 'اصنام شکن' پچیس سال کا زیادہ عرصے سے نکال رہے ہیں۔'' میں نے عثمان انجم صاحب سے کہا کہ شاد عارفی کی وفات کی پچاسویں برسی ہے۔ اس موقع پر آپ ایک سیمینار کیجیے اور تمام مقالے کتابی شکل میں شائع کیجیے۔ یہ 2015 کی بات ہے۔ عثمانی صاحب میری بات مان گئے اور سیمینار ہوا اور کتاب 'شاد عارفی کی شاعرانہ عظمت' وشاکھاپٹنم سے شائع ہوئی۔ کتاب میں تازہ بہ تازہ مضامین لکھنے والوں میں بالترتیب عثمان انجم، مظفر حنفی، مناظر عاشق ہرگانوی، فراز حامدی، نیر فتح پوری، محبوب راہی، فاروق جائسی، محمد زماں آزردہ، رؤف خیر، محمد محفوظ الحسن، مولا بخش، افضل مصباحی، سعدیہ پروین، شان بھارتی، امتیاز احمد راشد، احمد معراج اور محمود خاں اصغر کے نام شامل ہیں۔ اس سیمینار اور کتاب کے بعد مظفر حنفی سے قربت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ والہانہ اور وارفتہ انداز دراصل زندگی کی علامت ہے۔ جس طرح حسن، عشق کی تخلیق کرتا ہے اور عشق اپنی انتہائی منزلوں میں پہنچ کر حسین ہوجاتا ہے اسی طرح رشتے حسی کیفیت کو اجاگر کرتے ہیں اور زندگی کو جلا بخشتے ہیں۔

میں نے مانا کہ تو چلا بھی گیا
دل کی محفل یونہی سجی ہے ابھی

■

Prof. Manazir Ashique Harganvi
Kohsar Bhikanpur-3
Bhagalpur - 812001 (Bihar)
Mob.:9430666156

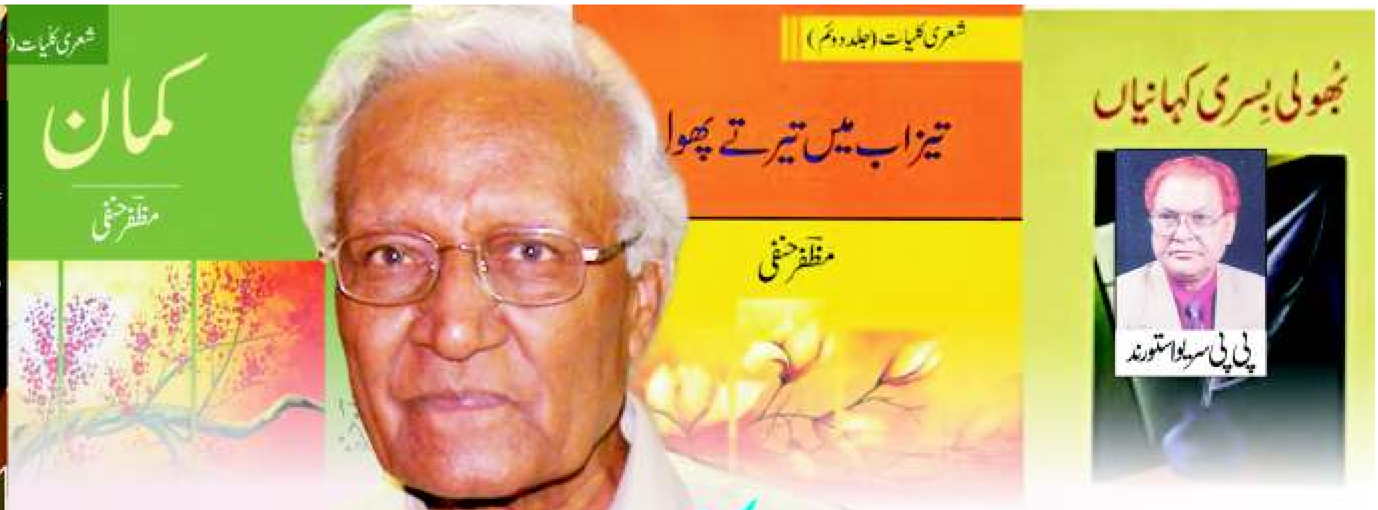

آہ! مظفر حنفی

10 اکتوبر 2020 کی صبح موبائل کی گھنٹی بجی۔ غازی آباد سے ڈاکٹر ذکی طارق کا فون تھا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی ایک دلدوز خبر نے ذہن اور دل دونوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بولے ''رند صاحب! آپ کے دوست ڈاکٹر مظفر حنفی ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔'' میں یکدم سکتے میں آگیا۔ مجھے یہ تو علم تھا کہ مظفر بھائی ان دنوں کچھ زیادہ ہی علیل ہیں مگر اس خبر کی توقع کبھی نہیں تھی— موبائل پر فیس بک کھولتے ہی دیکھا کہ یہ خبر تو تیزی سے گشت کر رہی ہے— برا ہو اس ''کورونا وائرس'' کا کہ جنازے میں بھی شرکت کے لیے پابندیاں ہیں۔ لوگ مزاج پرسی اور کسی کے غم میں بھی شریک نہیں ہو سکتے، پرانی تہذیب اور رواداری کا جنازہ اٹھ گیا۔ میں نے گھر والوں کو یہ جانکاہ خبر سنائی اور مظفر بھائی کے جنازے میں شرکت کی خواہش بھی ظاہر کی مگر کوئی تیار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ میرے ڈرائیور نے بھی جامعہ نگر جانے سے انکار کر دیا۔ افسوس کہ اپنے دیرینہ دوست کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔

مظفر بھائی سے خط و کتابت کا سلسلہ تو 1970 سے تھا۔ وہ میرا کلام ادبی رسائل میں پڑھتے اور خطوط کے ذریعے اس پر گفتگو بھی کرتے تھے۔ میں ان دنوں محکمۂ ریلوے میں ذمے دار عہدے پر تھا مگر اکثر تبادلے کا شکار بھی ہوتا رہا۔ پھر بھی خط و کتابت کا سلسلہ قائم رہا مگر بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ 1992 میں بھائی مظفر حنفی کا ایک خط موصول ہوا جس میں انھوں نے کچھ غزلوں کی فرمائش کی۔ اس وقت تک مظفر بھائی پروفیسر اقبال چیئر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی ہو چکے تھے۔ وہ شعرا کے کلام کا ایک تاریخی انتخاب جو 1940 تک بقید حیات تھے ترتیب دے رہے تھے جس کا نام تھا 'روح غزل' مجلس مشاورت میں جناب مجروح سلطانپوری، شمس الرحمٰن فاروقی، سالک لکھنوی اور سید عبدالکریم تھے۔ اس تاریخی انتخاب کو انجمن روح ادب، 1-میور روڈ، الہ آباد نے 1993 میں شائع کیا۔ مظفر حنفی کا یہ ایک بڑا کام تھا۔ انھوں نے اپنے مقدمہ میں لکھا کہ:

''میں نے شاعر اور اس کے کلام کے انتخاب میں قدیم وجدید یا ترقی پسند اور غیر ترقی پسند جیسی کوئی حد بندی کو روا نہیں رکھا اور کوشش کی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں کے ہر قابل ذکر غزل گو کا انتخاب اس کتاب میں یکجا ہو جائے۔''

'روح غزل' کے انتخاب میں تقریباً 693 شعرا کو شامل کرنا جو 800 صفحات پر مشتمل تھا کوئی آسان کام نہ تھا مگر انھوں نے کر دکھایا۔ آرزو لکھنوی، آنند نرائن ملا، ابر احسنی، اثر لکھنوی، اختر شیرانی، بہزاد لکھنوی، بیخود دہلوی، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، جوش ملسیانی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، نشور واحدی، میراجی، بانی جیسے شاعروں کے کلام منگانا اور پھر اس کی ترتیب ایک مشکل کام تھا مگر مظفر حنفی نے کر دکھایا۔ انھوں نے میری غزلیات کو بھی 'روح غزل' میں شامل کیا جو صفحہ 217 پر ہیں۔

آج میری یادوں میں ماضی کے اوراق پھڑ پھڑا رہے ہیں۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

مظفر حنفی کو میں نے پچاس برس پہلے کسی ادبی رسالے میں پڑھا تھا اور ان کی شاعری کو پڑھ کر چونکا بھی تھا۔ یہ بات شاید 65-1964 کی ہے۔ ادبی رسائل ہمیشہ سے میرا شغل رہے ہیں۔ میں مرکزی سرکار کے محکمۂ ریلوے میں ایک ذمے دار عہدے پر فائز تھا اور میرے فرائض میں اپار مستقل انکوائریاں تھیں جس کی وجہ سے کافی وقت سفر میں گزرتا تھا۔ بڑی مصروف زندگی تھی۔ سفر کے یہ لمحات ہی میرے لیے فرصت کے ہوتے تھے، اس لیے میری کوشش یہی رہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت مطالعے میں گزرے۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران مظفر حنفی کی کچھ غزلیں نظر سے گزریں۔ نیا لہجہ، نیا انداز، گنگا جمنی الفاظ نے مجموعی طور پر میرے ذہن پر اپنا اثر چھوڑا جس میں انوکھا پن تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسندی اور عام خبریاتی شاعری کا ہینگ اوور (Hang Over) اتر رہا تھا اور اردو شاعری میں جدیدیت کا رنگ واضح سمت کی طرف گامزن تھا۔ نوجوان شعرا کی طرح ایک عام قاری بھی دوراہے پر کھڑا تھا۔ روایتی شاعری اور ترقی پسند شاعری سے طبیعتیں بیزار ہو چکی تھیں۔ ایسے ماحول میں جدید لب و لہجے میں ایک خوشگوار فضا کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ مجھے مظفر حنفی کی غزلیں پسند آئیں۔ اس وقت مظفر حنفی کی عمر شاید 25-24 برس کی رہی ہوگی۔ پہلی غزل جس نے مجھے متاثر کیا اس کے چند اشعار درج ہیں۔

دیواروں پر گیلی ریکھائیں روتی ہیں
ٹینوں پر گھنگھرو کی بوندیں ناچ رہی ہیں
ڈول رہے ہیں آنکھوں میں پتھر کے سائے
شریانوں میں بہتی ندیاں سوکھ گئی ہیں
در پر ویرانی کا پردہ جھول رہا ہے
کھونٹی پر تنہائی کی بیلیں لٹکی ہیں
مجھ سے مت بولو، میں آج بھرا بیٹھا ہوں
سگریٹ کے دونوں پیکٹ بالکل خالی ہیں
چلیے صاحب اور کوئی دروازہ دیکھیں
آج مظفر کی باتیں بہکی بہکی ہیں

مجھے محسوس ہوا کہ مظفر حنفی نے اس زمانے کی شعری آوازوں کی بازگشت قبول نہیں کی بلکہ ان کی جگہ لفظوں کی تازگی اور نئے مضامین کے ساتھ اپنے محسوسات کو انفرادیت بخشی ہے۔ اس زمانے میں کہی گئی غزلیات کے مطالعے سے ایک بات جو واضح طور پر نظر آتی ہے وہ یہ کہ ان کی شاعری کے کئی پہلو داخلی اندھیروں کے روشن اجالوں کے نام ہیں۔ ان کے یہ گوشے عام انسانی زندگی کے منور پہلو ہیں، حالانکہ مظفر حنفی کو اس وقت کے مستند استاد محترم شاد عارفی سے شرف تلمذ حاصل تھا مگر انھوں نے 24-25 برس کی عمر میں ہی استاد کے نقش قدم پر چلنا پسند نہیں کیا، انھوں نے فن کی باریکیاں، مضمون آفرینی، الفاظ کی نشست و برخاست تو سیکھی مگر اپنی راہ الگ اختیار کرنے کی کوشش کی اور اپنا چراغ الگ جلایا۔

1964-65 کا دور بڑے اتھل پتھل کا دور تھا۔ فراق، جوش، جگر مشاعروں کے کامیاب شاعر تھے۔ علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، مجروح وغیرہ ترقی پسندی کا ڈھول بجا رہے تھے۔ جدید غزل اپنا رنگ بکھیر رہی تھی، ایسے دور میں منفرد سوچ، بالغ نظری، طرفگی احساس کے ساتھ نوجوان شاعر مظفر حنفی بھی اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مظفر حنفی نے اس زمانے کی یا اس زمانے سے کچھ پہلے کی آوازوں کی بازگشت کا کوئی اثر نہیں لیا۔ کئی نوجوان شعرا جدیدیت کا سہارا لے کر حد سے کچھ زیادہ ہی جدید ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں شائع شدہ مظفر حنفی کی ایک اور غزل دیکھیں۔

چھپڑا کے ہاتھ انا سے کہاں چلے صاحب
اب آ چکی ہے یہ دلدل گلے گلے صاحب
کرن کی ڈور سے لٹکی ہوئی کئی لاشیں
مجھے ملی تھیں اسی پیڑ کے تلے صاحب
زمین پاؤں کے نیچے نہیں، مگر پھر بھی
ہمارے خون میں آتے ہیں زلزلے صاحب

اس بات سے قطع نظر کہ قصبات اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں اس وقت بھی روایتی شاعری ہو رہی تھی۔

مظفر حنفی کی پیدائش کھنڈوہ (مدھیہ پردیش) کی ہے جہاں سے انھوں نے روایتی شاعری کا لبادہ نہیں اوڑھا۔ مندرجہ بالا غزل میں ایک نیاپن ہے۔ لب ولہجہ تازہ ہے۔ وہ اپنی نوجوانی کے عالم میں اور چھوٹے شہر سے تعلق رکھنے کے باوجود جدید غزل کے نزدیک نظر آتے ہیں۔ لفظیات، تراکیب، علامتیں اور جذباتی قدریں اس وقت بھی ان کی شاعری میں نمایاں تھیں اور ایسا لگتا ہے کہ ان کی طبیعت پورے طور پر جدیدیت کی طرف راغب تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے کہا تھا:

عظمت سے ہٹ کے ندرت وجدت کو ناپیے
ہم اور چیز، غالب و میر و ذوق اور

1964-65 میں بھی مظفر حنفی کا لب ولہجہ اور شعری آہنگ اس زمانے کے ماحول کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان کا جو کلام رسالوں میں شائع ہوا، اس میں فصاحت کے ساتھ سادگی تھی، جسے پڑھ کر مجھے احساس ہوتا تھا کہ ترقی پسندی اور جدیدیت سے ہٹ کر بھی شاعر اپنے طرز فکر سے اپنی تخلیقات کے موتی بکھیر سکتا ہے اور نئی فضا قائم کر سکتا ہے، اچھا ادب زندگی کا ادراک ہے۔

میر کے زمانے کو آج تین سو سال ہونے کو آئے۔ اس طویل عرصہ میں زبان اور اظہار کے طور پر طریقے بھی وہ نہیں رہے۔ نئے شعرا نے اپنا لہجہ Diction یعنی زبان کے استعمال کا منفرد انداز اپنانے کی کوشش کی۔ میر اور سودا کا دور الگ تھا۔ دونوں شعرا نے تمام اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن دونوں کے الفاظ اور زبان میں نمایاں فرق رہا۔ یہی صورت میر و غالب کے درمیان ہے۔ میر آخر میر ہیں۔ انھوں نے زبان کے سلسلے میں جس جرأت سے کام لیا، انھیں کا حصہ ہے۔ جدید شاعری کا دور آتے آتے الفاظ، زبان اور زبان کے برتاؤ میں نمایاں فرق آیا۔ نوجوان شعرا اپنی شعوری فکر اور شدت احساس کے مطابق روایتی ڈھانچے سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اظہاریت کے امکانات تلاشتے نظر آئے۔ مظفر حنفی نے بھی اپنے لہجے میں نیاپن لانے کی کوشش کی اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اظہار کے راستوں پر اپنے شناخت نامے چسپاں کیے اور غیر غزلیہ احساس کو بھی مخصوص کشادگی کے ساتھ نئے اور ستھرے انداز میں پیش کیا۔

کھیتوں میں ابر لے کے نہ پروائی جائے گی
بدلی سمندروں پہ ہی برسائی جائے گی
اک مصرف اوقات شبینہ نکل آیا
ظلمت میں تری یاد کا زینہ نکل آیا
کس قدر تیز چلی سرد ہوا پچھلی رات
گرم بستر کو بہت یاد ہماری آئی
اور پھر پانچویں درویش کی باری آئی
باغ افسانہ میں ندرت کی سواری آئی

ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے میں مظفر حنفی جدیدیت سے کافی متاثر تھے اور روایتی شاعری سے دامن جھٹکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر انھوں نے جدیدیت کے شعلے کو اس طرح لپک کر نہیں پکڑا کہ ان کی ہتھیلیاں ہی جلا دے۔ انھوں نے جدیدیت کا اثر بہت ہی محتاط اور سنجیدہ طور پر لیا جس کا لطف دے رہا ہے۔ ان کا لب ولہجہ اور شعری آہنگ اس زمانے کے قاری کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس وقت بھی ان کے کلام میں فصاحت، سادگی، رنگینی اور تاثر کی شان پوری آب وتاب سے نمایاں تھی۔ اب یہ اشعار دیکھیں۔

ٹوٹی ہوئی چوڑی کی مزیدار کہانی
خوابیدہ گلی جاگ پڑی آنکھ مسل کر
اچھی خاصی دو آنکھیں لے کر پھرتے ہو
پھر بھی مانگے کی عینک سے دیکھا تم نے
کیوں اوڑھے ہوئے ہو بیتے دن کا پشچا تاپ
بھور بھئی نگ بیت چکا ہے کھڑکی کھولو

سادگی کی ان کی علامتوں کو مظفر حنفی خوب سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں تاثراتی میلانات اور فکر کی وسعت موجود تھی۔ جذباتی انتشار، جذباتی کشمکش، داخلی کیفیت کا احساس نوجوان مظفر حنفی کو تھا۔ اس طرح کی غزلیں جو اس زمانے میں شائع ہوتی تھیں، آپ بھی دیکھیں۔

سنا تھا دل کو کہ گرم و گداز ہوتا ہے
ہمارے سینے میں یہ سخت و سرد کیا شے ہے

....

موروثی اقدار کو تج کر ہم نے وہ تکلیف سہی
جیسے زندہ پاؤں کسی کے کاٹے جائیں آرے سے
وہ سر سے پا تک تمام شعلہ
اسے کوئی چومتا کہاں سے
اب تو خوش آمدید کہیے ملکۂ بہار
کانٹوں پہ چل رہا ہوں بڑے اعتماد سے

میں مظفر حنفی کی پچاس سال پہلے کی شاعری پر کوئی طویل مضمون نہیں لکھ رہا ہوں، میں تو اپنے ذہنی تاثرات قلم بند کر رہا ہوں جو مظفر حنفی کی اس وقت کی شاعری سے میرے ذہن ودل پر مرتب ہوئے۔ مضامین یا تقریظیں لکھنا یا کسی شاعر کا مجموعی طور پر جائزہ لینا تو ناقدین اور اہل قلم حضرات کا حصہ ہے۔ آج مظفر حنفی جس مقام پر ہیں اور انھوں نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

افسوس کہ مظفر حنفی اب ہمارے درمیاں میں نہیں ہیں مگر انھوں نے جو سرمایۂ ادب چھوڑا ہے، وہ نئی نسل کے لیے مشعل راہ بنے گا۔ مظفر حنفی کبھی کسی خاص عنوان کے پابند نہیں رہے مگر ان کا طرز بیان ہمیشہ سے ہی بے ساختہ رہا۔ ان کی تمام تخلیقات میں بلند فکری تخیل، گہرا مشاہدہ اور مطالعے کی وسعت کا شعور بھرپور عظمتوں کے ساتھ نمایاں ہے۔ معاصر ادب میں مظفر حنفی ایک اہم نام تھا اور رہے گا۔ اس پر ہم سب کو فخر ہے۔

■

PP Srivastav Rind
R-16, Sector - 11, NOIDA - 201301 (UP)
Mob.:9711422058

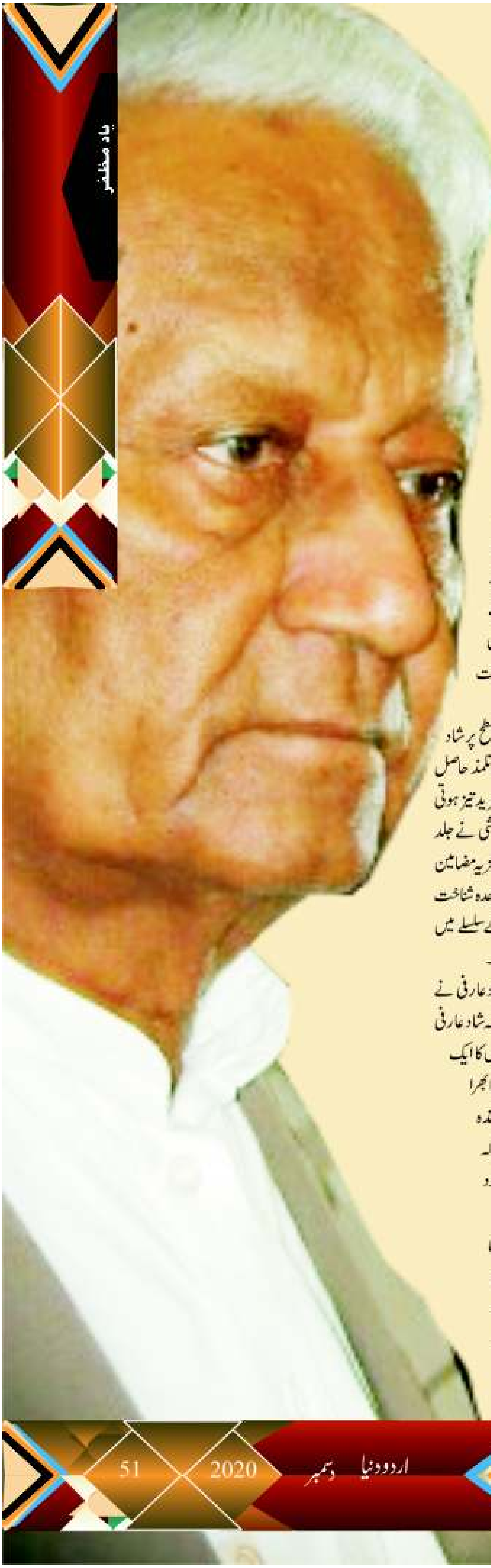

مظفر حنفی کی شاعری میں جدید حسیت

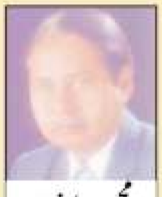

محسن جلگانوی

پچھلے مہینے جدید شاعری کے نہایت معتبر اور نمائندہ شاعر مظفر حنفی کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اپنے جدید اسلوب اور لہجے کی آمیزش سے اپنی شاعری میں سماجی معنویت اور عصری حسیت کو پیش کیا ہے۔ ان کے آہنگ شعر میں جو تلخی' طنز اور تازہ کاری کا کرارہ پن دکھائی دیتا ہے اس کی نظیر اس عصر کے کسی شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

مظفر حنفی اپنی فکری شادابی، اسلوب کی ندرت اور جدید حسیت کے باوصف، اردو کی غزلیہ شاعری کے مستند اور معتبر شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کے الاؤ میں تجربات کا ایندھن ہمیشہ شعلہ زن رہا ہے۔ ان کی شعری حسیت میں تازہ کاری، نیا پن اور عصری حسیت ان کے فن کی پہچان بن کر ابھرتے ہیں انھوں نے زندگی کو اس طرح بھوگا ہے کہ تجربے ان کے اظہار کی زبان بن کر بولتے ہیں۔ مظفر حنفی کی غزل کا خاص وصف ان کی زبان و بیان کی کھنک اور گونجتے ہوئے قافیے اور اچھوتی ردیفیں ہیں۔ ان کے لہجے میں جو چھپا ہوا طنز ہے وہ مظفر حنفی کی غزل کو ممیز کرتا ہے مظفر حنفی کی شاعری کے تعلق سے یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ روایت کا احترام کرنے والا کوئی شاعر شعور و ابلاغ کی سطح پر عصری حسیت اور نجی تجربے کو شعری صورت دینے میں مظفر حنفی سے بہتر طریقے پر زبان کو شاید ہی برت سکے۔

مظفر حنفی کے زبان و بیان کا خاصہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے فارسیت کے غلبے سے اپنی شاعری کو بچائے رکھا اور رواں دواں اور سہل انداز بیان میں شعر کہے لیکن اس سادہ بیان میں انوکھا پن اور نادرانہ اظہار ان کے ہاتھوں سے نہیں گیا۔ بیان و زبان پر ان کی گرفت اور قادرالکلامی کو اردو غزل ان کی شخصیت کو اعتبار بخشتی ہے۔ اردو غزل کے اکثر شاعروں کے یہاں مقلدانہ لفظیات کے باوصف ان کی شاعری پر کسی نہ کسی پیش رو شاعر کی کاربن کاپی ہونے کا الزام لگتا رہا ہے۔ مظفر حنفی ان شاعروں میں سے ہیں جن کے بارے میں گوپی چند نارنگ نے اظہار خیال کیا تھا کہ ان کی اپنی لفظیات کا دائرہ بہت وسیع ہے کہتے ہیں۔

''مظفر حنفی ہمارے دور کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جن کی لفظیات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ انھیں نئی بات پرانے انداز میں اور پرانی بات نئے اسلوب میں کہنے پر قدرت حاصل ہے۔ اکثر قدیم علامتیں ان کے جذبے میں تحلیل ہو کر مفاہیم اور جدید حسیت کی آئینہ دار بن جاتی ہیں۔''

ابتدا ہی سے مظفر حنفی، ذہنی اور مزاجی سطح پر شاد عارفی سے متاثر رہے تھے۔ شاد عارفی سے تلمذ حاصل کرنے کے بعد ان کے کلام میں طنز کی دھار مزید تیز ہوتی چلی گئی۔ حنفی کی ذہنی تازہ کاری اور ندرت تراشی نے جلد ہی اپنی شاعری کی ایک مخصوص پہچان بنائی اور طنزیہ مضامین میں مزید وسعتوں اور اضافوں کے ساتھ اپنی علاحدہ شناخت بنالی۔ حنفی کے طنزیہ لہجے کی الگ شناخت کے سلسلے میں ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اس طرح تجزیہ کیا ہے۔

''اردو میں طنز و جراحت کی جو مثال شاد عارفی نے قائم کی تھی اور جس کے بارے میں خیال تھا کہ شاد عارفی اس انداز فکر کے شاعر آخرالزماں ہوں گے اس کا ایک روشن زاویہ مظفر حنفی کی شاعری کی صورت میں ابھرا ہے۔ مظفر حنفی چونکہ شاد عارفی کے رشاد و تلامذہ میں سے تھے اس لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کے فن میں فیضِ استاد کی کرنیں بھی موجود ہیں۔''

مظفر حنفی نے شاد عارفی کی جزوی شاعری کا تتبع بھی کیا اور اس کی توسیع بھی کی۔ شاد عارفی کی تیکھی اور نوکیلی غزل کے وہ مداح تھے اور اس سلسلے پر انھیں فخر بھی ہے اور ناز بھی۔ لکھتے ہیں۔

ہے شاد عارفی سے مظفر کا سلسلہ
اشعار سان چڑھ کے بہت تیز ہوگئے

پیروکار شاد، مظفر حنفی میں دو ایک سہی طنز غزل کے تار پہ چل کر دکھلاتے ہیں مثلاً میں شاد عارفی نے ناقدانِ فن کو نشانہ بناتے ہوئے کہا تھا

غالب کے شعر نام سے میرے سنا کے دیکھ
پھر اعتراضِ ناقدِ فن آزما کے دیکھ

ہر چند کہ اب غزل یا نظم میں درشت لہجے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے اور 'درشت لہجہ تو اب حرفِ مسترد ٹھہرا' مگر مظفر حنفی نے اپنی کھردری اور درروری درشت زمین میں یہ شعر کہہ کر غزل میں کھردرے پن کا جواز پیش کیا تھا

اس کھردری غزل کو نہ یوں منھ بنا کے دیکھ
کس حال میں لکھی ہے مرے پاس آ کے دیکھ

حنفی نے طنزیہ غزل کے وسیلے سے سماجی مقصدیت اور عصرِ حاضر کی حسیت کو کھردرے لہجے میں پیش کر کے موضوع شعر کے امکانات کو وسعت دی اور خود کو یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی جیسے عصر ساز شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

دشت میں پہنچے تو ویرانی نہ راس آئی ہمیں
گھر ملا تو اس کی دیواریں نہیں درد آشنا

جدید شاعری کے رجحان کی شناخت 1960 میں ہوئی اس سے پہلے یعنی 1955 میں اس کے درخت کا بیج بویا جا چکا تھا۔ 1960 میں اس کا وجود ایک تناور درخت کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا۔ تحریکیں اور رجحانات میں فکر و شعور اور نظریات کی رو آہستہ آہستہ اپنی جگہ بناتی رہتی ہے۔ کوئی تحریک یا رجحان اچانک ہی منظرِ عام پر نہیں آ جاتا بلکہ مروجہ رجحانات نئی بلندیوں کے لیے اپنی جگہ چھوڑتے جاتے ہیں۔ جدید شاعری کے سلسلے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ نئی نسل پر ترقی پسند تحریک نے جو اثرات مرتب کیے ان میں بعض منفی نوعیت کے تھے۔ ان سے متنفر ہو کر نئی نسل نے اس تحریک سے گلوخلاصی حاصل کی۔ اسے نئی شاعری میں زیادہ توانائی اور اعتماد حاصل ہوا یہی شاعری تجرباتی عبوری دور سے گذر کر اردو شاعری کا ایک نمایاں کردار بن گئی۔

مظفر حنفی کے بموجب ان کی شاعری کی ابتدا 1960 سے پہلے ہو چکی تھی لیکن سنجیدگی کے ساتھ شعر گوئی میں نے 1960 کے بعد ہی شروع کی ہے اور ابتدا ہی سے روش عام سے بچ کر کہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں... 1960 کے بعد سے اردو ادب میں جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اس وقت تک بھوپال میں نئی شاعری کے صرف دو نام ایسے تھے جنھیں جدید لہجے کے شعرا کہا جا سکتا تھا جن میں مظفر حنفی کے علاوہ ایک اور نام فضل تابش کا تھا۔ جدید تنقید نگاروں اور دانشوروں نے مظفر حنفی کو ایک مستند اور معتبر جدید شاعر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ حنفی جدیدیت کی وضاحت اور اس سلسلے میں اپنے موقف کی صراحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جدیدیت کوئی تحریک نہیں، مختلف ادبی رویوں کے اجتماع کا نام ہے، نیا شاعر ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ ترقی پسندی سے بیزاری کا اعلان کیا جائے لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ نئی شاعری کو ترقی پسند شاعری کی توسیع سمجھا جائے۔ جدید رجحان رکھنے والوں میں بیش تر شاعر ایسے نکلیں گے جو ترقی پسندانہ خیالات یا اینٹی کمیونسٹ نظریات رکھنے کے باوجود کامیاب نئے شاعر ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ نئی شاعری مخصوص نظریات کی قائل نہیں، ہر نیا شاعر اپنی جگہ اپنے طور پر سوچنے کے لیے آزاد ہے۔''

ڈاکٹر محبوب راہی جنھوں نے مظفر حنفی کی شخصیت اور شاعری پر ڈاکٹریٹ کی تھی اپنے مقالے میں مظفر حنفی کی انفرادیت پسندی کے ضمن میں لکھا ہے کہ اکثر ناقدین و مبصرین جدید غزل کے منفرد ناموں میں مظفر حنفی کے ساتھ ظفر اقبال، محمد علوی، سلیم احمد، بانی وغیرہ کے نام بھی جوڑ لیتے ہیں۔ عصری حسیت اور جدید تقاضوں کی ترجمانی کی حد تک اس بات کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ مظفر حنفی بھی مذکورہ بالا کامیاب جدید شاعروں میں سے ایک ہیں لیکن جہاں تک جدید غزل میں منفرد رنگ و آہنگ اور اچھوتے لب و لہجے کا تعلق ہے، مظفر حنفی کے رنگِ سخن سے ہندو پاک کے کسی شاعر کا رنگ میل نہیں کھاتا اور وہ اپنے رنگ میں یکتا اور بے جوڑ ہیں۔ شاید اسی لیے حنفی نے کہا ہے۔

ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفر کے نام کا
اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

اے مظفر ریشمیں غزلوں سے میں الجھا نہیں
ورنہ بن جاتیں وہ پیر تسمہ پا میرے لیے

نازک ہے فنِ شعر مگر طرزِ نو کے ساتھ
ہم اس حباب کو بھی سلامت اٹھائیں گے

بلا سے گردِ تغزل مری غزل میں نہیں
جدید لہجہ گھٹن کو تو صاف کرتا ہے

مظفر حنفی کی شاعری میں احساس کی شدت، جذبات کی ہنگامہ خیزی نے رجز کی ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ قاری کا لہو خود بہ خود جوش مارنے لگتا ہے یہ لہجہ اردو کی جدید شاعری میں کمیاب ہے۔

دریائے خوں سے اٹھتے تھے سر بلبلے نہیں
پل کی جگہ تنا ہوا خنجر تھا سامنے

زلزلہ خون میں آیا تھا جو اندر کی طرف
میں نے شہ رگ ہی بڑھا دی ترے خنجر کی طرف

گردن کو جھکاتے ہی چلی پشت پہ تلوار
مرہم نے اٹھایا تھا کہ ماتھے پہ لگا تیر

سر پہ تلوار لٹکنے کا مزا کہتا ہے
اور کچھ دیر ابھی سر نہ اٹھایا جائے

رزم گاہوں کے ایسے خون آشام منظر اردو شاعری میں انیس و دبیر کے مرثیوں میں ملتے ہیں کہ وہاں یہ چیزیں موضوع کے تقاضے کے تحت ہیں لیکن اردو شاعری اور بالخصوص جدید شاعری میں اس کی مثالیں ناپید ہیں۔ شدتِ اظہار اور سرفروشی کا یہ والہانہ پن حنفی کے لہجے کی شناخت ہے۔ مزید کچھ اشعار

جھوم کر اٹھا بگولہ، برگِ زرد اے برگِ زرد
لطف آتا ہے ہوا سے چھیڑ خانی میں بہت

جھونکتی ہوئی ہوا، ہونکتی ہوئی فضا
چونکتی ہوئی زمیں شہر بے چراغ میں

اک مدت سے اسے حسرتِ ہنگامہ ہے
آج اے سیلِ بلا میرے مکاں تک چلنا

بلا کو گھر تک آنے کی دعوت دینا، بگولے دیکھ زرد پتوں سے چھیڑ خانی کرنا، بدن میں آندھی بھر دینا، شہر سے چراغ میں ہوا کے ہونکنے سے زمیں کا چونکنا ایسی علامات و تراکیب کا استعمال مظفر حنفی کے مخصوص اور غضب ناک لہجے کا وصف ہے۔ ان کی غزل میں جو تیکھا پن اور کٹیلا انداز ہے وہ ان کا بنیادی اور انفرادی شناخت نامہ ہے۔

بھیڑ ہے اور اشتراک شدہ
بیچ میں اک ہرن ہلاک شدہ

شکست کھا چکے ہیں ہم مگر عزیز فاتحو!
ہمارے قد سے کم نہ ہو فرازِ دار دیکھنا

یلغار، چیخ، تیغ، گرم ہوا، شگاف، زلزلہ، آندھی، بگولہ، شہ رگ، لاش، تابوت، سرخ پرچم، ہنگامہ، سیلِ بلا، بھیڑیے، ہلاک شدہ ہرن، تیر کمان، تلوار، کسک، صدائے بازگشت، بال و پر، رگ و پے، شب خون، نیزے، اڑان، زقند، صحرا ایسے الفاظ لہو کو گرم اور احساس کو مشتعل و متحرک رکھتے ہیں یہ الفاظ حنفی کی شاعری میں علامیہ بن کر ان کے مخصوص لہجے کی بنیادی شناخت بن جاتے ہیں۔ مظفر حنفی کا یہ کھردرا، ٹیڑھا، ترچھا لہجہ ان کا دانستہ اختیار کردہ ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر انور صدیقی نے ایک تبصرے میں بہت ہی خاص بات کہی ہے:

''جب ہم دوسروں سے لڑتے ہیں تو خطابت جنم لیتی ہے اور جب خود اپنے آپ سے لڑتے ہیں تو شاعری...

مظفرحنفی کی لڑائی سے دونوں ہی صورتوں میں شاعری پیدا ہوتی ہے۔ اچھی، سچی اور معتبر۔ ہندوستان میں بانی کے بعد محمد علوی اور مظفر حنفی دو ایسے شاعر ہیں جنھیں ہم اعتماد کے ساتھ پاکستانی غزل کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ علوی کے مقابلے میں لسانی اور فنی مہارت کے اعتبار سے مظفرحنفی زیادہ پختہ اور زیادہ قادرالکلام شاعر ہیں۔''

ہر مروجہ فیشن سے بغاوت کر کے اپنے ایجاد کردہ ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلنا اور ہر اعتبار سے اپنے آپ کو بھیڑ بھاڑ سے منفرد رکھنا ہی مظفرحنفی کا مقصد فن اور مطمح نظر ہے۔

جدیدیت کی آمد آمد کے دور میں نیا شاعر علامتی پیرایۂ اظہار کے وسیلے سے نئے امکانات کی جستجو میں نئے نئے تجربے کر رہا تھا، مظفرحنفی نے بھی نئی فضا میں چند تجربات کیے لیکن وہ جلد ہی عام تقلیدی دائرے سے کٹ کر منفرد راہ اپنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس دور میں انھوں نے جو تجرباتی غزلیں کہیں ان سے چند اشعار پیش ہیں۔

گرمی جو آ گئی تری یادوں کے خون میں
پرچھائیوں نے چھوڑ لیے سر جنون میں
بجلی کے کھمبوں نے آنکھیں جھپکائیں
جلدی جلدی ہاتھ ملائے یاروں نے
روئی پر ناریل چڑھا تھا یار
سیب اندر سے پلپلا تھا یار
اب اسے سگریٹ کے مرغولے ذرا بھاتے نہیں
تھک چکی ہے آنولے کے تیل میں لت پت ہوا

جدیدیت کے ابتدائی دور میں چند کم سواد و کم بساط شاعروں کی اول جلول قسم کی شاعری نے اس رجحان کو نقصان پہنچایا لیکن اس تجرباتی دور کے بعد جو شاعر آئے ان میں مظفر حنفی کا نام بہت اہم رہا۔

جدید شاعری کا یہ ادعا رہا ہے کہ وہ اپنے عصر کی تہہ در تہہ کیفیات اور مخصوص موضوعات کی پہلوداری اور ناگفتہ بہ تجربات کے اظہار کے لیے برہنہ پیرائے اظہار اختیار کرنے کا جوکھم نہیں لے سکتا اس لیے اس کو اپنے موضوعات و تجربات کو برتنے کے لیے ابہام کی پرت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جدید شاعری کی اس ادعائیت و روش نے عام قاری ہی نہیں بعض تنقید نگاروں کو بھی بدگمانی کا شکار بنایا۔ ہر چند کہ مظفرحنفی شاعری میں ترسیل و ابلاغ کے زبردست حامی ہیں لیکن ان کے یہاں بھی جب اہمال سے مملو مندرجہ ذیل اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ابہام نے ایمائیت کی حدوں کو چھو لیا ہے۔

انگلی پکڑ کے چاند مرے ساتھ ہو لیا
مشرق میں جس کو ڈھونڈ رہا ہے سنپولیا

جب یار کی نگاہ نے فولاد کی سرنگ
شرما کے میری آنکھ سے منظر سکڑ گئے

چشمہ اور دستانے لانا
چکنی مچھلی ہرا سمندر
قصبے پہ چڑھ آیا سورج
کھڑک کھڈرک مٹی میں

یہ اشعار علامتی پیرایۂ اظہار میں شاعر نے اپنے ذاتی تجربات کے لیے کہے تھے لیکن جب تک شاعر کے فکری و ذہنی منظر و پس منظر کے در وا نہیں ہوتے ان کے مفہوم تک رسائی مشکل ہے۔ لیکن مظفرحنفی کے یہاں ابہام و اہمال کی ایسی شاعری نسبتاً بہت کم ہے۔ ان کی شاعری کا جو خاص وصف ہے وہ ان کی پیکر تراشی اور تجسیم کاری ہے۔ وہ لفظوں کے وسیلے سے تصورات کے پیکر بناتے چلے جاتے ہیں، اس سمعی، بصری، لمسی، متحرک اور مثالی پیکروں کا استعمال مظفرحنفی کی شاعری میں سطحی انداز میں نہیں بلکہ فنکارانہ انداز میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار

کچے کچے اپلوں سے آنچ نکلتی ہے
ترل ترل بہتی ہے نالی، رات ہوئی
ستارۂ سحری کا جگر جگر کرنا
وہ چاندنی کا کتھک ناچنا درختوں پر
خوشبوئیں سر پیٹ رہی ہیں
کھڑکی کھولو، کھڑکی کھولو
گھنگھرو جیسی رم جھم رم جھم بوندنیاں
بادل جھینا جھینا، مولا پانی دے

کچے کچے اپلوں سے آنچ نکلنا، نالی کا ترل ترل بہنا، ستارۂ سحری کا جگر جگر کرنا، چاندنی کا کتھک ناچنا، خوشبوؤں کا سر پیٹنا، رم جھم رم جھم بوندوں کا گھنگھروؤں کی طرح بجنا۔ ان تمام کیفیتوں میں سمعی پیکر، بصری پیکر، حرکی پیکر اور شامی پیکر شامل ہو کر شعری اظہار کو دو چند کرتے ہیں۔ انھوں نے لفظیاتی تکرار سے اشعار میں جو نغماتی موسیقیت پیدا کی ہے ان سے فن پر ان کی دسترس کا پتہ بھی چلتا ہے۔

چھتوں سے ستارے ٹپکنے لگے
ہری گھاس دیوار پر چڑھ گئی
چتوں نے اپنے کان کھڑے کر لیے ادھر
وحشی بگولہ ناچ رہا ہے پس غبار
تاروں کی موت گیر یہ شبنم پہ ٹل گئی
سورج کے قتل پر تو برستا رہا لہو
ہاتھ میں زیتون کی ڈالی ہے سر پر فاختہ
اندر اندر خون کی تلوار چلتی جائے گی

آنتوں سے پیر پیٹ کے اندر لپیٹنا
پھر سائرن کی چیخ پہ بستر لپیٹنا

(اور پھر) برسات میں چھتوں سے پانی کی بوندوں کو ستارے قرار دینا، دیواروں پر ہری گھاس کا چڑھ جانا، وحشی بگولے کا ناچ اور چتوں کے کان کھڑے ہو جانا، سورج کی موت پر آنکھوں سے لہو کا برسنا، ہاتھوں میں زیتون کی ڈال اور سر پر فاختہ ہونے کے باوجود خون کی تلوار کا چلنا، سائرن کی چیخ، آنتوں سے پیر پیٹ کر اندر لپیٹنا، جیسا علامتی منظرنامہ مظفرحنفی کی شاعری کو گنجلک نہیں بناتا بلکہ مفاہیم کی وسعتیں ہموار کرتا ہے اور جدید شاعری میں علامتوں کے استعمال میں سلیقہ مندی اور ترسیل و ابلاغ کی راہیں متعین کرتا ہے۔

جدید شاعری میں قدروں کی شکست و ریخت، تشکیک، مہاجرت، ذات کا اظہار، فرد کی گم گشتگی، لاسمتیت وغیرہ اہم موضوعات رہے ہیں۔ مظفرحنفی کے یہاں یہ موضوعات ان کے اپنے منفرد اسلوب میں ملتے ہیں۔

سرحدوں پر سر پٹکتی ہے مری لاسمتیت
وسعتِ ارض و سما مشکل مری آسان کر
پھر مکڑیاں سی رینگ رہی ہیں دماغ میں
ذہنوں سے آگہی کا اجالا نہ جائے گا
وہی میں دائرہ در دائرہ ہر سمت پھیلا ہوں
طلسم ذات بھی اک نقش ہے آئینہ بندی کا
مجھ کو ہونے کا یہ احساس نہ جینے دے گا
سوئی کی نوک پہ ہر سمت گھماتا ہے مجھے
کھلا کہ اپنی ہی قید میں ہوں
مرا بدن خود حصار نکلا

مظفرحنفی کی شاعری میں وہ بھی عناصر موجود ہیں جن سے جدید حسیت تشکیل پاتی ہے۔ ان کی شاعری میں موجودہ ماحول کی زمینی سچائیوں، زندگی کی تلخیوں، ناہمواریوں کے علاوہ عالمی مسائل و موضوعات اپنی مکمل حسیت، شعور، آگہی اور معنویت کے تمام در و بست کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ذات و کائنات کے تقاضے، اپنے مشینی عہد کے پیچیدہ مسائل سماجی معنویت کے موضوعات شاعری سے ان کے سچے تعلق اور دروں بینی سے وابستگی کی نشان دہی کرتے ہیں۔

مظفرحنفی کی شاعری میں جدید حسیت، سیاسی جبریت، سماجی ناانصافی، معاشرتی و معاشی اندوہگی، طنز و تمسخر کی چیخ بن جاتی ہے۔

یہ اضطراب یہ پارہ صفت شعور یہ خوف
مری صدی ہے مری خودنوشت میں داخل

اک آدھ چھینٹ ہو تو نیا دور بے قصور
یہ آستیں، خون سے تر کس طرح نہیں
تجھ پر اپنے گھر کی باتیں کیوں کر کھلتیں
جب دیکھا مریخ سے آگے دیکھا تو نے
آج ہر ایک ازم ہے ٹوٹے ہوئے طلسم سا
خوف زدہ معاشرہ، خوار ہے فرد ہر طرف
ماں کی چھاتی دودھ سے نم ہوگئی
دودھ کا ڈبہ نہیں دوکان میں

حنفی کے بے شمار اشعار میں فرد کی ذات، ذات کی گم گشتگی، غیر یقینیت، خوف زدگی، انسان کی بے بسی و لاچاری، سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی موضوعات کی ترجمانی ملتی ہے۔ تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات کے موضوعات جدید شاعری کی شاعری کا مقدر رہے ہیں۔ بے شمار شاعروں نے ان موضوعات پر اظہار کیا ہے۔ مظفر حنفی کی شعری حسیت میں ان مسائل پر جو احساس کی شدت ہے اس سے ان کی بیدار مغزی کا پتہ چلتا ہے۔

اب جو بٹوارہ ہوا تو مورتی بھگوان کی
بانٹ لی جائے گی دو ٹکڑے برابر کاٹ کر
ہاں سینہ سپر ہم تھے اندھیروں کے مقابل
چلتی رہی خورشید کی تلوار ہمیں پر
ہر اک درخت اختلاف میں رہا ہے پر
لکھا ہے تختیوں پہ نام موسم بہار کا
زمیں ہے تنگ مظفر مرے زمانے کی
سبھی بلاؤں نے ہندوستان کو دیکھا
شعر پر عائد ہوئے جغرافیائی دائرے
کوئی پرچہ اس طرف آئے نہ پاکستان جائے
شیوجی تانڈو ناچ گئے
وہ مند سے بلا نہیں

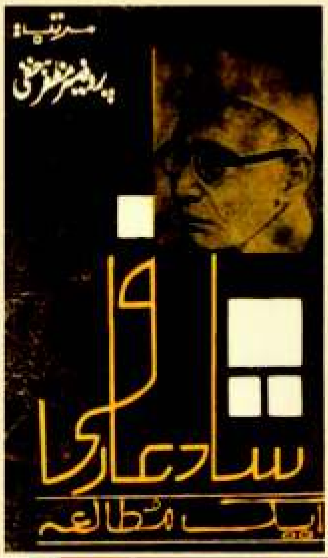

مظفر حنفی کی غزل متنوع موضوعات کی آماجگاہ رہی ہے۔ نئے شاعر کو تقسیم کا کرب، ہجرت کا کرب، محافظین کی جانبداری، کرفیو زدہ حالات، فسادات کا کرب ورثے میں ملا تھا جس سے انسانی قدروں اور رشتوں میں نئے نئے مسائل، پیچیدگیاں اور تشکیک و بے یقینی کے حالات پیدا کر دیے ان موضوعات کی ترجمانی مظفر حنفی کے اشعار میں جابجا ملتی ہے۔

ہم سائے کے اچھے نہیں آثار خبردار
دیوار سے کہنے لگی دیوار خبردار
ایک میرا دوست جس کا آخری دم تھا لہو
اور میں مجبور میرے پاس بھی کم تھا لہو
ہر سمت آگ، ہر سمت خاک
بستی میں اک سن سن چراغ
شہر میں اور سب خیریت ہے مگر
دن میں کرفیو رہا، سنسنی رات میں
رات اندھیری نگری میں کرفیو ہے
خوف چیخا، کواڑ کھولو نا
مکینوں کی فریاد جعلی سہی
مگر زخم دیوار و در میں بھی ہیں
صدائے بازگشت بھی نہ آئی میری چیخ پر
بگل بجا تو ہر طرف جوان ہی جوان تھے

مظفر حنفی کے کلام میں سماجی اور معاشرتی شعور کی سطح بہت سے جدید شاعروں سے ممیز ہے۔ عام شاعر کے یہاں ہزیمت اور احتجاج کا جو احساس نظر آتا ہے وہ موثر قوت نہیں رکھتا۔ مظفر حنفی کا احتجاج، آلام و کرب کا احساس اعلیٰ قدروں سے وابستہ ہے۔

یہ خنجر بھونکنا، بس توڑنا، دفتر جلا دینا
مری جانب سے بھی لوبان چٹکی بھر جلا دینا
پھر بسیں ٹولیوں میں جلا دی گئیں
دلہنیں ڈولیوں میں جلا دی گئیں
جتنی شامیں تھیں مہندی کے اس پیڑ پر
اب کے سب ہولیوں میں جلا دی گئیں
نوجوانوں کے سر در پہ کاٹے گئے
لڑکیاں کھولیوں میں جلا دی گئیں
برسر پیکار تھے ہم مشعل و خنجر سمیت
جل بجھے بستی کے سارے گھر ہمارے گھر سمیت
ریڈیو پہ سن کے خبریں اک فسادی شہر کی
گھر لرزتا ہے ہمارا صحن و بام و در سمیت
سوختہ شہر میں کیا قدر اکیلے گھر کی
آپ زحمت نہ کریں ہم ہی جلا لیتے ہیں

مظفر حنفی نے اپنے عہد کے کرب کو شعور کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور اپنے مشاہدے اور مطالعے کی شدت سے ان تمام مناظر کو شعری پیکر عطا کر دیے جو عصری مسائل کی صورت میں ان کے شعور کی حسیت کو مہمیز کرتے رہے۔

مظفر حنفی جدید حسیت کے ایک منفرد اور معتبر شاعر تھے۔ ان کا فنی رکھ رکھاؤ قادر الکلامی، ندرت، جدید اسلوب، مخصوص جدید لہجہ اور آفاقی شعور انھیں جدید شاعروں میں ممیز حیثیت عطا کرتا ہے اس مرحلے پر ان کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

عظمت سے ہٹ کے ندرت و جدت کو ناپیے
ہم اور چیز، غالب و میر و فراق اور

''دانا اور ناداں، دونوں پر ہنسنے کا حوصلہ، کبھی کچھ ہے۔ نہیں ہے تو وہ شے جسے شعر کے مزاج داں، ربودگی یا گم شدگی کہتے ہیں۔ نہ تو خود والہانہ کیفیت میں ڈوبتا ہے، نہ ہمیں ڈوبنے دیتا ہے اسے اپنی 'ترچھی پرواز' پر ناز ہے اور ہمیں اس کے یہاں یہی صفت خوب جچتی ہے... تصور کیجیے، میدانِ جنگ میں رات کا سناٹا ہے۔ پتہ کھڑکے تو گولی پڑے، اتنے میں سامنے چند گز کے فاصلے سے کوئی بانکا جوان خندق سے کھڑے قد اٹھتا اور بنکر Bunker کے اوپر 'لائٹر' جلاتا ٹہل ٹہل کر سگریٹ کے کش لینے لگتا ہے، گویا اپنی سرفروشانہ بے نیازی سے فریق مخالف کا منھ چڑا رہا ہے۔ اسے جلا رہا ہے اب یا تو وہ ایک گولی کی خوراک بنے گا یا اپنے پرایوں سب کو بوکھلا دے گا، مظفر حنفی دونوں پر کمر بستہ ہے، اس پر دونوں حالتیں گزری ہیں۔''

خلیق انجم کے لفظوں میں ان کی شاعری روایت اور بغاوت کے درمیان کی چیز ہے، وہ ماضی کا احترام کرتے ہیں اور ہر اس روایت کو اپناتے ہیں جو قابلِ قدر ہے، لیکن ان تمام روایتوں سے بغاوت کرتے ہیں جو ادب کو جمود، فرسودگی اور کھوکھلے پن سے آلودہ کرتی ہیں۔ شاعر اپنے عہد کی سماجی اور معاشی کشمکش کا بھرپور شعور رکھتا ہے۔ وہ تاریخ کی ان جابر قوتوں سے بھی آشنا ہے جو انسان سے خوشیاں چھین لیتی ہیں۔ شاعر کے پاس وہ بصیرت، حسیت اور قوتِ اظہار ہے جو اس کشمکش کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ خود حاصل کیے ہوئے تجربات کی عکاسی نے اس کی شاعری کے رنگ و روپ کو نکھارا ہے اور ایک ایسی تازگی دی ہے جو زبان و بیان کے قیود سے بلند ہے۔

■

Mohsin Jalganvi
306/DV Apartments
Salar Jung Colony, Tolichowki
Hyderabad- 500008 (Telangana)
Mob.: 7013380902,Email.: uwf.hyd@gmail.com

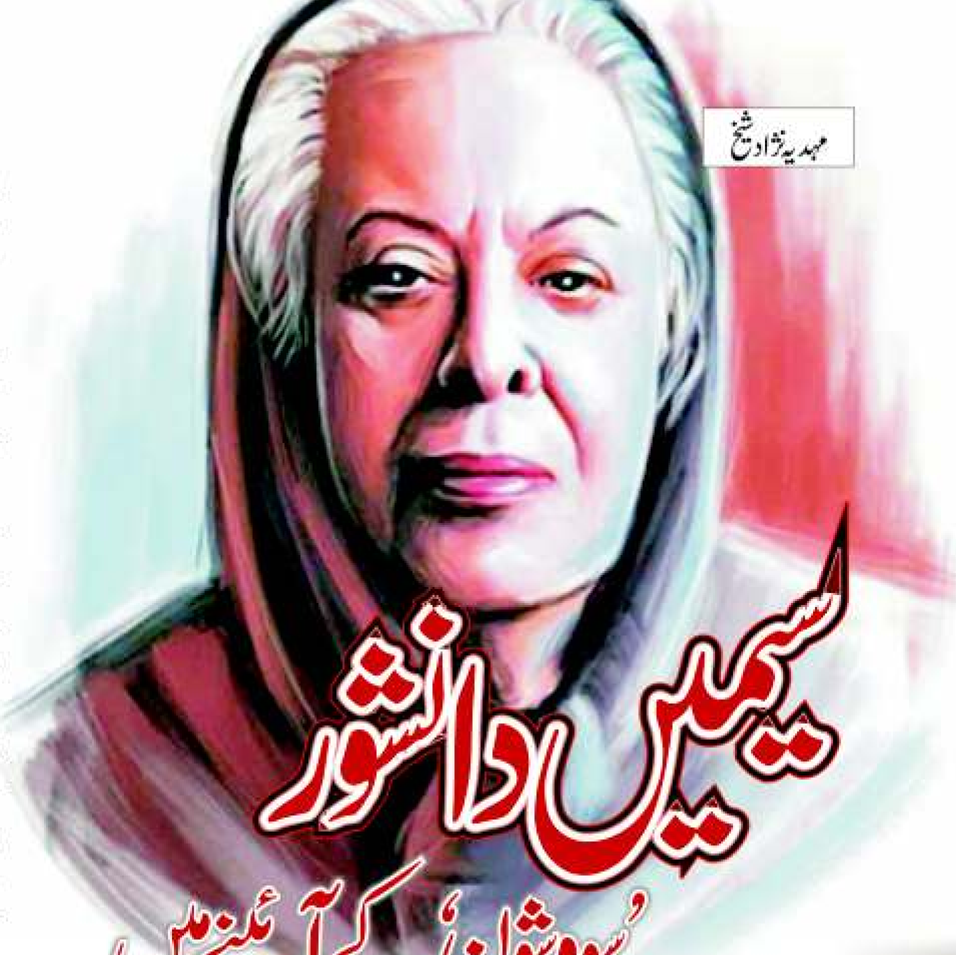

مہدیہ نژاد شیخ

سیمیں دانشور
'سووشون' کے آئینے میں

دنیائے فکشن کے عروج وترقی میں مرد وخواتین دونوں کا اہم رول رہا ہے، خواہ مغربی ادب ہو یا ایشیائی ادب۔ ادب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرد وعورت کے باہمی تعاون واشتراک سے ہی فکشن نے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ جبکہ ادبی کلامیہ (لٹریری ڈسکورس) میں بہت دنوں تک عورتوں کے بارے میں یا عورتوں کے ذریعے لکھی گئی تحریروں کو ثانوی حیثیت دی گئی، اسے یا تو نظر انداز کیا گیا یا پھر اسے قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آیا جب خواتین فکشن نگاروں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا لوہا منواتے ہوئے دنیائے ادب میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل ومشکلات، ان کی نفسیاتی اور جنسی پیچیدگیاں اور سماجی وسیاسی حیثیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں فکشن کے بنیادی کردار کی حیثیت عطا کی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس سے پہلے مرد فکشن نگار عورتوں کے مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع نہیں بناتے تھے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ عورتوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور ان کے دیگر مسائل کو اس حد تک بیان نہیں کر سکتے تھے جس حد تک ایک خاتون فکشن نگار کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ خواتین فکشن نگاروں نے صرف عورتوں کی زندگی اور ان کے مسائل تک ہی اپنے موضوع ومواد کو محدود نہیں رکھا بلکہ دنیا اور دنیا کے دیگر مسائل کو بھی اپنے فکشن کا موضوع بنا دیا۔

فارسی فکشن کی ترقی اور فروغ میں بھی جتنا مرد فنکاروں کا حصہ ہے اتنا ہی خواتین کا بھی ہے۔ سیمیں دانشور (متوفی 2012) جدید فارسی ادب کی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے فارسی فکشن نگاری کی جانب توجہ کی۔ اس طرح جہاں انھوں نے براہ راست فارسی فکشن کو عورت کے مسائل ومشکلات سے آشنا کیا وہیں انھوں نے خاتون فکشن نگاروں کے لیے فارسی ادبیات کا در وا کیا اور اسی کے ساتھ انھوں نے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کا ایک نیا معیار بھی عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی ادبیات کی تاریخ میں سیمیں دانشور نمایاں مقام ومرتبہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے جہاں ایک طرف چند اہم ناول لکھے ہیں تو دوسری طرف ان کے افسانے قارئین کے درمیان کافی مقبول ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے مغربی ادب کے کئی شہ پاروں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیمین دانشور کے حالات زندگی کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔

سیمیں دانشور 28 / اپریل 1912 میں شیراز میں پیدا ہوئیں۔ شیراز ابتدا سے ہی فارسی شعر وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان کی پرورش و پرداخت نہایت ہی علمی و ادبی گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد، محمد علی دانشور (متوفی 1941) جن کا لقب احیاء السلطنہ تھا شیراز کے ایک مشہور ومعروف طبیب تھے۔ ان کی والدہ، قمر السلطنہ حکمت، کو آرٹ سے حد درجہ دلچسپی تھی اور دنیائے مصوری میں ان کو بلند مقام حاصل تھا۔ سیمیں دانشور کی تعلیم (1927-1937) شیراز کے ایک اسکول، مہر آئین میں ہوئی جہاں فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور بچوں کو زیادہ تر انگریزی زبان میں ہی پڑھایا جاتا تھا جبکہ ایران میں انگریزی زبان کو اس وقت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ لہٰذا انگریزی زبان و ادب سے وہ اپنے بچپن میں ہی متعارف ہوگئی تھیں۔ 1938 میں ان کے والد نے اعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں تہران یونیورسٹی بھیجا جہاں انھوں نے فارسی زبان و ادب کو بطور مضمون ایم اے کے لیے انتخاب کیا۔ اس دور میں والدین کے لیے لڑکیوں کو گھر سے دور رکھ کر تعلیم دینا ایک نہایت ہی مشکل اور انقلابی قدم مانا جاتا تھا جو اس وقت تک ایرانی سماج میں رائج نہیں تھا۔ سیمیں دانشور اس معاملے میں بے حد خوش نصیب تھیں کہ ان کے والدین اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور علم دوست تھے۔ اس لیے انھوں نے بغیر کسی صنفی تفریق کے اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم سے روشناس کرایا۔

1941 کے بعد انھوں نے عملی طور پر صحافت اور ادب کے میدان میں قدم رکھا چنانچہ انھوں نے 1942 میں 'ریڈیو تہران' اور 1943 میں 'ایران' اخبار کے لیے مضامین لکھنا شروع کیا۔ 1950 میں وہ فارسی کے مشہور افسانہ نگار جلال آل احمد (متوفی 1969) سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ 1952 میں انھیں امریکہ کی جانب سے فل برائٹ (Fulbright) اسکالرشپ ملی اور وہ امریکہ چلی گئیں۔ جہاں انھوں نے دو سال رہ کر جمالیات (Aesthetics) کی تعلیم حاصل کی۔ وہیں انھوں نے کیلیفورنیا کے اسٹنفورڈ یونیورسٹی (Stanford University) میں ایک سال کے لیے افسانہ نویسی کی تربیت بھی حاصل کی۔ 1952 میں وہ ایران واپس آئیں جس کے بعد انھوں نے فارسی ادبی رسالہ 'نقش ونگار' کی ادارت کی ذمے داری سنبھالی، جس کے 7 شمارے شائع ہوئے۔ 1959 میں وہ بحیثیت لکچرر تہران یونیورسٹی سے منسلک ہوئیں۔ 8 مارچ 2012 کو وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں اور تہران میں ہی انھیں سپرد خاک کیا گیا۔

سیمیں دانشور کو فارسی ادب میں سب سے پہلی خاتون افسانہ نگار ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ 1948 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'آتشِ خاموش' (خاموش آگ) شائع ہوا جو کسی ایرانی خاتون کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا۔ 1961 میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'شہری چوں بہشت' (ایک شہر بہشت جیسا)، 1980 میں تیسرا مجموعہ 'بہ کی سلام کنم' (کسے سلام کروں) اور 1997 میں ان کا آخری افسانوی مجموعہ 'از پرندہ ہای مہاجر بپرس' (مہاجر پرندوں سے پوچھو) شائع ہوا۔ 1969 میں سیمیں دانشور کا شہرہ آفاق ناول 'سووشون' شائع ہوا۔ ان کے دیگر ناول 'جزیرہ سرگردانی' 1993 میں اور 'ساربان سرگردان' 2001 میں شائع ہوئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے کئی اہم مغربی ادب پاروں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جیسے انتون چخوف کی متعدد کہانیوں کا ترجمہ کرکے 'دشمنان' نامی مجموعے (تہران 1953) کی صورت میں پیش کیا۔ اسی طرح انتون چخوف کا ہی ڈرامہ 'The Cherry Orchard' کا فارسی ترجمہ 'باغ آلبالو' (تہران 1968) کے نام سے شائع کیا۔ علاوہ ازیں، الن پیٹون (Alan Paton) کے ناول 'Cry, the Beloved Country' کا ترجمہ 'بنال وطن' (تہران 1972) کے نام سے کیا۔ (مزید تفصیل کے لیے رجوع کریں: عبدالہی، ص 06-203)

جب ہم سیمیں دانشور کے فکشن کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں ایرانی معاشرہ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ بالخصوص انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں عورتوں کی صورت حال کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ وہ اپنے ملک کی صورت حال اور وہاں کی عورتوں کے دکھ درد اور مسائل سے بخوبی واقف تھیں۔ اسی لیے انھوں نے ان عورتوں کے احساسات و جذبات کی عکاسی اور ان کے معاشی و معاشرتی مسائل کو اپنے فکشن کا موضوع بنایا۔ ان کی تخلیقات میں اس عہد کے لوگوں کی تہذیب و روایات اور رسم و رواج کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ یہاں ہم سیمیں دانشور کے مشہور زمانہ ناول 'سووشون' کے حوالے سے ان کے فکر و فن کا جائزہ لیں گے۔

موضوع و اسلوب کے لحاظ سے سیمیں دانشور کی تخلیقات میں 'سووشون' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ 'سووشون' کا شمار فارسی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے ناولوں میں کیا جاتا ہے۔ لفظ 'سووشون' ایک شیرازی اصطلاح ہے جس کا معنی 'سوگ سیاوش' ہے۔ سیاوش شاہنامہ فردوسی کا وہ اساطیری کردار ہے جسے افراسیاب کے حکم سے ناحق مارا گیا۔ اسی کی یاد میں شیراز میں جو سوگ منایا جاتا ہے اسے 'سوگ سیاوش' کا نام دیا گیا ہے۔ سیمیں دانشور نے اپنے ناول میں سووشون کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے:

''زری از یوسف می پرسد: تو میدانی سو وشون چیست؟ یوسف می گوید: یک نوع عزاداری است..... یعنی سوگ سیاوش۔'' (دانشور، ص 272)

(ترجمہ: زری یوسف سے پوچھتی ہے: تمھیں پتا ہے سووشون کا کیا مطلب ہے؟ یوسف جواب دیتا ہے: ایک قسم کی عزاداری ہے۔ .... یعنی سوگ سیاوش۔)

یہ ناول مختلف ادبی اور فنی زاویوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں ہم اس ناول کی اہم ترین خصوصیتوں پر نظر ڈالیں گے۔ سب سے پہلے بات کریں گے موضوع و نقطہ نظر کی۔

موضوع و نقطہ نظر:

اس ناول میں سیمیں دانشور نے دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں ایران کے اجتماعی حالات و واقعات کی تصویر کشی کی ہے جس میں ایران کے جنوبی علاقے بالخصوص فارس کے پرآشوب ماحول اور عدم تحفظ کے اجتماعی احساس کی جانب اشارہ کیا ہے۔ جب پوری دنیا دوسری جنگ عظیم کی آگ میں جل رہی تھی اور ہر طرف قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا، انسانی زندگی کی کوئی اہمیت باقی نہ رہ گئی تھی اور اس وقت کا انسانی معاشرہ افراتفری کے ماحول سے جوجھ رہا تھا، ایران بھی اس ماحول سے خود کو الگ نہیں رکھ پایا۔ اتحادی قوتوں (Allied Forces) نے ایران کو اپنے قابو میں لے رکھا تھا جس کی وجہ سے وہاں کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام میں ابتری پھیل گئی تھی اور مختلف رجحانات وہاں تیزی سے جنم لینے لگے تھے۔ سیمیں دانشور نے ایران پر بیرونی قوتوں کا قبضہ اور اس کے منفی نتائج کا احاطہ اس ناول میں کیا ہے۔ سووشون سیاسی اور تاریخی ناول کے ساتھ ایک علامتی ناول بھی ہے۔ تاریخی اور سیاسی اس لیے کہ اس میں 1941 کے بعد ایران کے صوبہ فارس کو جن مصائب و مشکلات سے گزرنا پڑا اس کی کہانی بیان کی گئی ہے اور ناول نگار نے اس کے بیان میں علامتی اسلوب نگارش کو اختیار کیا ہے۔ حسن میر عابدینی نے اس ناول کے بارے میں یوں لکھا ہے:

''سووشون ایک علامتی اور سیاسی ناول ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ظاہری حصے میں زری اور اس کے خانوادہ پر گزرے ہوئے واقعات بیان ہوئے ہیں جو 1943 میں ہو رہے تھے۔ زری چاہتی ہے اپنے ملک ایران میں اپنے آپ کو اس دور کے آشوب، مصائب، بیماری، قحط اور موت سے بچائے لیکن جنگ اور دیگر مسائل سے ان کا گھر بھی دوچار ہوتا ہے۔ اس ناول میں علامتی حصے اور ظاہری حصے کو دیکھ سکتے ہیں۔ زری کا گھر پورے ایران کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے جبکہ زری ایران کی عورت اور یوسف ترقی پسند فکر کے حامل لوگوں کی تمثیل ہے۔ اور جن حالات سے ان کا خاندان اور گھر گزر رہا ہے پورا ایران و پورے ایران کی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔'' (میر عابدینی، ص 138)

سیمیں دانشور سیاسی و سماجی مسائل کو اپنے اس ناول میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے اور اس دور کی عورتوں کی بھی تصویر کشی کرتی ہیں۔ سووشون میں صنف نسوان کے جتنے بھی کردار ہیں وہ کسی نہ کسی اعتبار سے سماج میں صنف نازک پر ہونے والے ظلم و ستم کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح سیمیں دانشور اس دور کی عورتوں کی بے بسی، لاچارگی، مفلسی، ان کے صبر و تحمل اور ان کی نفسیاتی کشمکش کو دکھانے میں کامیاب ہوتی نظر آتی ہیں چنانچہ سید علی سراج اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''سب سے وسیع موضوع جو اس ناول میں بیان ہوا ہے عورتوں پر استحصال اور ظلم و ستم ہے۔ اس ناول کی تمام خواتین کردار– چاہے وہ زری ہی کیوں نہ ہو جو ایک تعلیم یافتہ اور مالدار خاتون ہے– خوف، توہم پرستی اور خانہ نشینی سے دوچار ہیں۔'' (سراج، ص 81)

پلاٹ:

جہاں تک اس ناول کے پلاٹ کا تعلق ہے تو ناول کے آغاز میں ہی دوسری جنگ عظیم کے دوران ایران کے سیاسی و سماجی حالات کا پتہ چل جاتا ہے۔ ایران اس وقت انگریزی طاقتوں کے قبضے میں تھا۔ جنگ اپنے ساتھ آشوب، بھکمری، قحط اور بیماری لائی تھی۔ یوسف ایک جوان زمیندار ہے جو اپنی بیوی (زری) اور بیوہ بہن (فاطمہ خانم) اور اپنے بچوں کے ساتھ فارس کے ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ اس کے گاؤں کا حاکم انگریزوں کی کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ اس علاقے کے بڑے بڑے زمیندار انگریزوں کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک چکے تھے اور ایرانی پیداوار کا زیادہ تر حصہ ملک سے باہر بھیجا جا رہا تھا جس کی وجہ سے وہاں کے غریب اور مفلس عوام قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے تھے۔

یوسف واحد ایسا زمیندار تھا جو انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھا اور ہر طرح سے مزدوروں کی حمایت کر رہا تھا۔ یوسف کا بھائی ابوالقاسم خان بھی انگریزوں کے ماتحت اور ان کی غلامی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اس ناول میں سیمیں دانشور نے زری نام کی ایک خاتون کو اہم کردار بنایا ہے اور اسی کی زندگی پر روشنی

ڈالتے ہوئے ہر قسم کے مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ زری اپنے گھر کو فتنے سے بچائے رکھنے کی سعی کرتی ہے۔ جب وہ اپنی آنکھوں سے شہر کو ٹائیفائیڈ اور عدم تحفظ کی وجہ سے لوگوں کی زندگیوں کو برباد ہوتے ہوئے دیکھتی ہے تو سہم جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں بھی وہ اپنے گھر کو سنبھالنا چاہتی ہے لیکن اس کا گھر بھی ان حالات و حادثات سے محفوظ نہیں رہ پاتا ہے۔ زری کے گھر میں بھی افراتفری اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب حاکم کی بیٹی کی شادی میں حاکم کی بیوی زری کے کان کی بالیوں کو ادھار لے کر لوٹاتی نہیں ہے۔ یہ وہی بالیاں ہیں جن کو یوسف نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ اس کے بعد حاکم ان کے بیٹے کے گھوڑے کو اپنی بیٹی کی خواہش کو پوری کرنے کے لیے چھین لیتا ہے اور آخر میں حاکم کے سپاہی اس کے شوہر کو قتل کر دیتے ہیں کیونکہ یوسف اپنی زمین کی پیداوار انگریزوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور اس کے برعکس دوسرے غریب مزدوروں کو کھانا پانی پہنچاتا ہے۔ یوسف کی موت کا زری کی شخصیت پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ ہی بدل کے رہ جاتا ہے اور وہ اپنے شوہر کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے مقابلہ آرائی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتی ہے۔ سیمیں دانشور نے زری کے اندر پیدا ہوئے انقلاب کو یوں بیان کیا ہے:

''نہ یک ستارہ، ہزار ستارہ در ذہنش روشن شد دیگر می دانست کہ از ہیچ کس و ہیچ چیز در این دنیا نخواہد ترسید''

(دانشور، ص 285)

(ترجمہ: ایک ستارہ نہیں، اس کے ذہن میں ہزار ستارے روشن ہوئے، اب اس کو پتہ تھا کہ اس دنیا میں کوئی شخص یا کسی چیز سے نہیں ڈرے گی۔)

کردار نگاری:

اس ناول میں مختلف قسم کے کردار موجود ہیں جن کی نہایت ہی باریک بینی کے ساتھ تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان میں سے ہر ایک سماج کے کسی نہ کسی خاص گروہ کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ناول میں دو کردار کلیدی ہیں: یوسف اور اس کی بیوی، زری۔

جہاں تک ضمنی کرداروں کا تعلق ہے ان میں عمہ خانم، عزت الدولہ، ابوالقاسم خان، مک ماہون، سرجنت زینگر، سودابہ خانم، خدیجہ، ملک رستم، ملک سہراب، مسٹر فتوحی، خسرو، خانم حکیم وغیرہ کا شمار ہوتا ہے جن کا ضمنی ہونے کے باوجود کہانی سے بہت گہرا ربط ہے۔

یوسف ایک ترقی پسند فکر کا حامل ہے جس کو بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوتا ہے اور وہ بڑی حد تک جدید عہد کی باریکیوں اور اس کے حقائق سے باخبر ہوتا ہے۔ اس کی سوچ و فکر سماج کے دوسرے افراد سے مختلف ہے۔ وہ پرامن بقائے باہم پر یقین رکھنے والا انسان ہے اور باہمی تعاون اور سماج میں عدل و انصاف کی حکمرانی کا خواب دیکھنے والا دردمند دل رکھتا ہے۔ وہ مجبوروں اور بے بسوں کا حامی ہے۔ ملک کی بھلائی اور خیر خواہی اس کی اولین ترجیحات میں سے ہے۔ وہ ہر قسم کی بدی اور شیطانی طاقت سے برسرپیکار ہے اور ان طاقتوں کے سامنے سر جھکانا اس کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اکیلا دو محاذوں پر دشمنوں سے نبرد آزما ہے۔ ایک طرف استعماری طاقتیں سرزمین ایران کی طرف پھن پھیلائے کھڑی ہوئی ہیں تو دوسرے محاذ پر اس کو اندرونی غداروں، بے ایمانوں اور ایمان فروشوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔

اس ناول میں دوسرا کلیدی کردار زری کا ہے جو ایک تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ وہ اس گاؤں کی وہ واحد خاتون ہے جو انگریزی زبان سے آشنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کو گاؤں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ناول کے ابتدائی حصے میں اس کو ایک نرم مزاج اور امن پسند انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا ہے اور زری اپنے ملک کی پر خطر صورت حال اور بدامن فضا کا مشاہدہ کرتی ہے اس کے مزاج میں نرمی کی جگہ سختی اور ٹھہراؤ کی جگہ انقلابی کروٹیں جنم لینے لگتی ہیں چنانچہ وہ اپنے شوہر کی موت پر احتجاج اور مظاہرے کو اپنی جنگ کا وسیلہ بناتی ہے۔

زبان و بیان:

سیمیں دانشور کی زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ اس میں پختگی اور شفافیت کے ساتھ ساتھ روانگی کا بھرپور دخل ہے۔ اسی طرح ان کی زبان ابہام اور پیچیدگی سے مکمل طور پر پاک ہے۔ جیسا کہ مشہور ایرانی نقاد داریوش صبور ان کے طرز نگارش پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''سیمیں دانشور کی نثر بے تکلف، رواں، صاف، عام بول چال سے نزدیک اور پیچیدگی سے بالکل محفوظ ہے'' (صبور، ص 429)

سیمیں دانشور کے ناول میں اصل کردار عورت ہے اور کہانی کی پیشکش بھی عورتوں کے ہی فکری زاویے سے کی گئی ہے اسی وجہ سے اس میں عورتوں کی روزمرہ کی بات چیت کا انداز، ان کی بول چال کا سلیقہ، اٹھنے بیٹھنے کی روش اور عورتوں کی زندگی کے مخفی احوال نہایت ہی سادگی اور لطافت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں عورتوں کے درمیان گفتگو کی رائج اصطلاحیں اس ناول میں جگہ جگہ موجود ہیں جیسے: 'لچک بہ سر'۔ یہ اس ضعیف عورت سے کنایہ ہے جس کی مرد اساس معاشرے میں کوئی قدر اور مقام نہیں ہے۔

''خدایا چرا مرا لچک بہ سر آفریدی؟ اگر مرد بودم نشان میدادم کہ مردانگی یعنی چہ؟'' (دانشور، ص 250)

(ترجمہ: اے اللہ مجھے لڑکی کیوں بنایا؟ اگر میں مرد ہوتی تو سب کو دکھا دیتی کہ مردانگی کیا ہوتی ہے؟)

اس طرح کے سیکڑوں محاورے اور مثالیں ناول میں ملتی ہیں جو اس کے حسن و جمال میں اور بھی اضافہ کرتی ہیں۔

الغرض سیمیں دانشور جدید فارسی ادب کی خواتین فکشن نگاروں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے فکشن کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب ایران میں یہ بات معمول کے خلاف سمجھی جاتی تھی کہ کوئی خاتون افسانہ یا ناول لکھ کر چھپوائے۔ وہ پہلی ایرانی خاتون تھیں جنھوں نے خواتین کے لیے فکشن کے میدان کی راہ ہموار کی۔ یہ ان کی بلند فکر اور دور اندیش نگاہوں کا ہی نتیجہ تھا کہ اپنے سماج میں عورتوں کی حالت زار کو بھانپنے اور سمجھنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کرتے ہوئے فکشن نگاری کو اپنا آلہ کار بنا کر عورتوں کے سماجی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور نفسیاتی حقوق دلوانے کے لیے میدان عمل میں اتر پڑیں۔ مذکورہ ناول 'سووشون' بھی ان کی اصلاحی کاوشوں کا ایک بہترین ماحصل ہے اور ایک ایسا ادبی شاہکار ہے جس میں ایک طرف فنی رعایت اور ادبی حسن و کمال کی جلوہ نمائی پائی جاتی ہے تو دوسری جانب ایسے حساس ترین سماجی اور سیاسی پہلوؤں اور مسائل کو پیش کیا گیا ہے کہ قاری نہ صرف فنی و ادبی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ سماج کی مخفی حقیقتوں اور پوشیدہ سچائیوں سے بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ روبرو ہوتا ہے۔ یہ غیر معمولی فنی اور اصلاحی امتزاج 'سووشون' کو ایک جامع ترین فنی شہ پارے کی حیثیت عطا کرتا ہے۔

کتابیات:

- عبدالہی، مہناز، 'سالشمار سیمیں دانشور' مشمولہ ادبی رسالہ بخارا، شمارہ 75، فروردین- تیر 1389ھ ش
- دانشور، سیمیں، سووشون، تہران: انتشارات خوارزمی، 1349ھ ش
- میر عابدینی، حسن، ''تاریخ نویس دل آدمی' مشمولہ بر ساحل جزیرہ سرگردانی (یادنامہ سیمیں دانشور)، مرتب: علی دہباشی، تہران: انتشارات سخن، 1383ھ ش
- صبور، داریوش، از کاروان حلہ: دیداری با نثر معاصر فارسی، تہران: انتشارات سخن 1384ھ ش
- سراج، سید علی، گفتمان زنانہ: روند تکوین گفتمان زنانہ در آثار نویسندگان زن ایرانی، تہران: انتشارات روشنگران و مطالعات زنان، 1394ھ ش

■

Mahdiya Nazad Shaikh
Ph.D Urdu Scholar, JNU
New Delhi - 110067

نگار

ناول ’ہمسایہ ہا‘

احمد محمود، کا شمار ممتاز ایرانی داستان نویسوں اور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں میں داستان یک شہر، زمین سوختہ، مدار صفر درجہ، آدم زندہ، درخت انجیر معابد کے علاوہ ہمسایہ ہا کافی مقبول و معروف ہیں۔

احمد محمود کے دوسرے ناول:

داستان یک شہر: یہ ناول سب سے پہلے مطبع امیر کبیر سے شائع ہوا اور پھر انتشارات معین سے شائع ہوا۔ یہ ناول ’ہمسایہ ہا‘ کا تکملہ ہے۔ خالد ایک ایسا کردار ہے جو احمد محمود کے دوسرے داستان ہمسایہ ہا میں بھی راوی داستان کی شکل میں نظر آتا ہے اس داستان میں بھی اس کا کردار بعینہ وہی ہے۔ خالد بھی تحریک میں شامل ہونے کی وجہ سے قید و بند سے دوچار ہوتا ہے۔ رہائی کے بعد چند لوگوں کے ساتھ اسے بندر لنگہ کی طرف جلاوطن کر دیا جاتا ہے ان واقعات کی کڑیاں ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول اصلاً احمد محمود کی اپنی سرگذشت ہے۔ اس لیے کہ احمد محمود نے بھی جلاوطنی کے ایام بندر لنگہ میں ہی گذارے تھے۔

زمین سوختہ: یہ ناول پہلے پہل مطبع ’نشرنو‘ سے پھر اسی سال تقریباً 22 ہزار کی تعداد میں از سر نو انتشارات ’معین‘ سے شائع ہوا۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ناول ایران و عراق کے مابین جنگ کے آغاز میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات پر مشتمل ہے جو جنوبی ایران یعنی خوزستان شہر میں وقوع پذیر ہوا۔ اس ناول میں مرکزی کردار خالد کے بھائی کا ہے۔ راوی کا خاندان اہواز میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ ابھی موسم گرما اپنے آخری مرحلے میں ہے۔ لوگ موسم بہار کے آغاز اور مدارس و اسکول کے کھلنے کے منتظر ہیں کہ اسی دوران عراقی افواج کے حملے کی خبر گردش کرنے لگتی ہے اور جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ لوگ شہر چھوڑ کر دوسرے شہروں میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ زیر زمین بنکروں میں پناہ لیتے ہیں۔ راوی اپنے دو بھائیوں کے ساتھ شہر میں ہی رہ جاتا ہے۔ ایک بھائی خالد عراقی بمباری میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس صدمے کے اثر سے دوسرا بھائی شاہد دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ احمد محمود نے اس ناول میں ایران پر عراق کے حملے سے پیدا ہونے والی تباہی و ویرانی اور سماج پر اس کے اثرات کا منظر پیش کیا ہے۔ خود احمد محمود نے بھی اپنے بھائی کو اسی جنگ میں کھویا تھا۔

مدار صفر درجہ: یہ ناول تین جلد اور 1782 صفحات پر مشتمل ہے جو انتشارات ’معین‘ سے شائع ہوا۔ یہ ناول 1971 سے 1978 کے درمیان رونما ہونے والے واقعات پر محیط ہے۔ اس داستان کا مرکزی کردار جو’باران‘ کے نام سے موسوم ہے، حالات سے مجبور ہو کر سیاست میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ ناول گوناگوں مسائل اور موضوعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، جیسے شاہ کے مخالف قوتوں کا اکٹھا ہونا، اصلاح اراضی، اقتصادی رابطے اور اس کے اثرات، دانشمند اور روشن فکر افراد کا ٹکراؤ، ساواک کی سازشیں اور کوششیں وغیرہ۔ احمد محمود نے اس کے ذریعے ایران کے جنوبی خطے کے لوگوں کے مسائل سے قاری کو واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

آدم زندہ: یہ ناول انتشارات ’معین‘ تہران سے شائع ہوا۔ اصلاً اس کا مصنف ممدوح بن عاطل ابو نزال ایک عرب ہے اسی لیے اس ناول میں مذکور واقعات تیسری دنیا یعنی عرب سے تعلق رکھتے ہیں اور احمد محمود نے اسے عربی سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

درخت انجیر معابد: یہ احمد محمود کا آخری ناول ہے جو دو جلدوں میں انتشارات ’معین‘ سے 2000 میں شائع ہوا۔ اس ناول کو سال کا بہترین ناول قرار دیا گیا اور ’ہوشنگ گلشیری‘ انعام سے نوازا گیا۔ یہ ناول شرفا کے ایک خانوادہ کی گویا مختصر تاریخ ہے۔ اس ناول میں احمد محمود نے لوگوں میں رائج خرافات و معتقدات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ احمد محمود کا ایک اہم ناول ’ہم سایہ ہا‘ ہے۔

جدید فارسی ادب میں ان کے ناولوں میں ایک ناول ہمسائے بیحد مقبول ہے۔ یہ ناول 1974 میں شائع ہوا۔ اس ناول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ احمد محمود کی جلاوطنی کے زمانے میں بندر لنگہ میں معرض تحریر میں آیا۔ احمد محمود نے اس ناول میں گوناگوں شخصیات اور مختلف طبقات کو جمع کر کے ایک ایسے سماج کو تخلیق کرنے کوشش کی ہے جس کی تعمیر میں سبھی کا حصہ ہے۔ احمد محمود خود بھی اس داستان کا ایک حصہ ہیں لیکن انھوں نے خود کو اس داستان کے مرکزی کردار خالد کی شخصیت میں خود کو مخفی رکھا ہوا ہے۔

اس ناول کے اکثر کردار سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سے دوچار نظر آتے ہیں یعنی احمد محمود نے ان کرداروں کی زبان حال سے اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل اور مشکلات کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ اس میں وقوع پذیر حوادث و واقعات کا تعلق اہواز کے ایک محلہ فقیر نشین میں کرایہ پر زندگی بسر کر رہے سات خاندان سے ہے۔ تقریباً سبھی خاندان ایک یا دو روم میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ شہر کے بڑے میدان، میدان مجسمہ، میدان زندان، محلے اور خطہ جنوب کے مخصوص بازار، ایندھن فروش، کتاب فروش مجاہد، پمپ ہاؤس، اینٹ بھٹے کی دوکان، پٹرول پلانٹ اور امان آقا کی دو قہوہ کی دوکان وغیرہ۔ اس کے علاوہ بچوں کا کھیلنا کودنا، لوگوں کے گھروں کا شیشہ توڑ دینا، گھروں میں جھانکنا، دکانداروں کی چوری اور کبوتر بازی وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ اس ناول میں ملتا ہے جس سے اس علاقے میں بسنے والے لوگوں کے احوال، عادات، رہن، سہن وغیرہ سے اچھی طرح واقفیت ہوتی ہے۔ نوجوان دریا میں تیرتے ہیں اور مچھلیاں پکڑتے ہیں، بڑے بوڑھے چائے خانے پر بیٹھ کر سیاسی موضوعات جیسے پلیس یا تیل کی صنعت کے قومی ہونے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ شہر کا حال یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے سے آشنا ہے کوئی کسی کے لیے اجنبی نہیں ہے۔

کرایہ داروں کے گھروں میں الگ سے مطبخ اور حمام موجود نہیں ہے۔ لوگ اسی ایک روم میں کھانا پکاتے ہیں، شام میں اسی گھر میں جھاڑو لگاتے ہیں، صفائی کرتے ہیں اور چٹائی بچھا کر اسی پر کھانا کھاتے ہیں۔ رات میں چند لوگ مچھردانی لگا کر احاطے میں سو جاتے ہیں۔ مکان کے قریب قریب بنے ہونے کی وجہ سے ہر آدمی اپنے

پڑوسی کے گھر بنی ہوئی غذا کو خوشبو سے ہی پہچان لیتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں آسانی سے آتے جاتے ہیں۔ ملا احمد جو بچوں کو پڑھاتے ہیں ان کے آنے سے پہلے بہت سے لوگ گھروں کی صفائی کرتے ہیں۔

اس ناول میں دو قسم کے قہوہ خانے کا ذکر ہے جو ایک دوسرے سے متفاوت ہیں۔ ایک امان آقا اور مرشد کا قہوہ خانہ جہاں تیل کے کارخانے میں کام کرنے والے مزدور، ڈرائیور اور عام لوگ آتے ہیں۔ دوسرا قہوہ خانہ شکوفہ ہے جہاں تعلیم یافتہ، اساتذہ اور اچھے لوگ جمع ہوتے ہیں۔

اس ناول میں لوگوں کے مختلف پیشوں کا بھی ذکر ملتا ہے جس میں کچھ تو سرکاری ہیں جیسے دندان ساز، سارجنٹ، انسپکٹر، پولیس، وکیل۔ استاد، تیل کارخانے میں کام کرنے والے وغیرہ یہ لوگ عام لوگوں کے زمرے میں نہیں آتے ہیں اور کچھ پرائیوٹ ہیں جیسے، لوہار، قہوہ خانے کا مالک، باورچی، ڈرائیور، گیرج دلال، حجام، ملا اور کمہار وغیرہ۔ یہ سات گھرانے سماج کے پسماندہ خاندان میں شمار ہوتے ہیں۔ کبھی ان میں اختلافات بھی واقع ہوتے ہیں لیکن اکثر اوقات یہ لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں یہاں تک کہ اکثر مواقع پر ایک دوسرے کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے رہتے ہیں اور مدد کرتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار خالد نام کا ایک نوجوان ہے جو اپنے والدین اور اپنی بہن کے ساتھ ایک بڑے سے پرانی چہاردیواری میں زندگی بسر کرتا ہے۔ ان گھروں میں عام لوگوں کے ساتھ سیاسی اور حکومتی افراد جیسے پولیس افسران اور جاسوس وغیرہ بھی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خالد پندرہ سال کا ایک نوجوان ہے اور بالغ ہونے کے قریب ہے۔ اس کی زندگی بچپن سے فقر و بیکاری میں گزرتی ہے۔ اسی درمیان اس کی آشنائی آمان آقا اور اس کی بیوی بلور خانم سے ہوجاتی ہے اور وہ امان آقا کی قہوہ کی دوکان سے وابستہ ہوجاتا ہے، جہاں وہ سیاسی مسائل اور پٹرولیم کی صنعت سے متعلق ہنگاموں سے آگاہ ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سیاست میں داخل ہوجاتا ہے۔ اسی درمیان اس کی آشنائی سیہ چشم نامی ایک لڑکی سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اس دوران سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رہتی ہیں جس کی وجہ سے اسے گرفتار ہونا پڑتا ہے۔ قید سے آزادی کے بعد وہ مزید جوش اور سرگرمی کے ساتھ پٹرولیم کی صنعت کو قومی کرنے کی تحریک میں شامل ہوجاتا ہے اور سیاست دانوں کے شانہ بشانہ جنگ لڑتا ہے لیکن حکومت کا ماننا ہے کہ یہ تحریک ناسمجھی پر مبنی ہے اور ملک کو نقصان پہنچانے والی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے چونکہ ابھی ہمارے اندر یہ استعداد نہیں ہے کہ تیل نکالنے کے لیے ضروری آلات اور مشین وغیرہ بناسکیں۔ ہمارے پاس انجینئر نہیں ہیں۔ ہمارا تو حال یہ ہے کہ اگر ایک مٹی کی صراحی یا گھڑا بناتے ہیں تو اس میں کئی جگہ سے پانی رسنے لگتا ہے۔ چونکہ ہمارا اقتصادی ڈھانچہ تیل کی صنعت پر ہی ٹکا ہوا ہے اس لیے اگر اس کو قومی کردیا گیا تو ہم برباد ہوجائیں گے۔ چنانچہ انگریزوں کو باہر نکالنے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔ انگریزوں کو نکالنے سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ہم سے تیل خریدیں ہی نا تو پھر ہم کیا کریں گے وغیرہ۔

داستان 'ہمسایہ ہا' ایک ایسے شخص کی زبان سے بیان ہوتا ہے جو پندرہ سال کا ایک نوجوان ہے جو ان سات کرایہ پر زندگی بسر کرنے والے خاندان کا ایک فرد ہے۔ ناول کا موضوع سماجی واقتصادی مشکلات، افسروں اور عہدہ داروں کا سلوک، نوجوانوں کے اندر پھیلی جنسی بے راہ روی اور نشہ آور اشیا کا عادی ہونا ہے۔

جنوبی ایران میں غیرملکی افراد کی موجودگی اور افسروں کی من مانی نے ماحول اتنا زیادہ خراب کردیا تھا کہ ہر ایک شخص ایک انجانے خوف میں زندگی بسر کررہا تھا۔ بغاوت کے الزام میں سیاسی افراد کے علاوہ عوام بھی جیلوں کی نذر کیے جارہے تھے۔ احمد محمود نے بھی قید و بند کی صعوبتیں اور اذیتیں سہیں۔ اسی لیے اس ناول میں ان حالات کی عکاسی اور جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اس ناول میں خالد خود احمد محمود کی ذات ہے جو اپنے حالات خالد کی زبان سے بیان کررہا ہے۔

اس جنگ میں شامل ناول کے دوسرے کردار جیسے شفق، پندار، ناصرابدی، منوچ سیاہ، قاضی اور رستم آفندی بھی ہیں جو اس جنگ میں متحد ہوکر بہادری سے لڑرہے ہیں یہاں تک کہ قیدخانے میں بھوک ہڑتال کررہے ہیں تاکہ تیل کی صنعت قومی ہوجائے۔

اس کے علاوہ ناول کا پلاٹ، جذباتیت اور کشش سے پر ہے، گرمی کے زمانے میں ان گھروں کے سارے افراد احاطے میں جمع ہوجاتے ہیں تاکہ گرمی کی شدت سے نجات پائیں۔ اس ناول میں خواج توفیق کے افیون کی شدید بو اور پھر ان کی عذرخواہی ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح عمو بندر کی فجر کی اذان کی آواز، اور ایک اہم آواز جو اس ناول میں بار بار سنائی دیتی ہے وہ بلور خانم کے چیخ و پکار کی آواز ہے جس سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔

گرچہ اس ناول کے اکثر کردار سیاسی ہیں لیکن یہ احمد محمود کا ہنر ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے دبے کچلے افراد جیسے عورتیں کہ معاشرے کے ایک اہم فرد ہونے کے باوجود ان کے حالات بد سے بدتر ہیں جو مقام ان کو ملنا چاہیے وہ نہیں دیا جارہا ہے۔ غربت اور ظلم وستم کا اثر سب سے زیادہ ان پر ہی پڑتا ہے۔ ان سب مسائل ومشکلات کی بھی اس ناول میں نشان دہی کی ہے۔ یہ ناول ایک سیاسی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ اس میں انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں وقوع پذیر ہونے والے سیاسی حادثات اور واقعات کا ذکر بہت ہی تفصیل سے ملتا ہے۔

اس ناول میں حکومت کے فیصلے اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے اس لیے حکومت نے شائع ہونے کی اجازت نہیں دی لہٰذا احمد محمود نے لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے اخبار کا سہارا لیا۔ خود احمد محمود کے ناول کا مرکزی کردار 'خالد' اور اس کے ساتھی 'شفق' اور 'پندار' جو سیاسی مخالفین میں تھے ایک گروہ تشکیل دیتے ہیں اور روزنامہ 'نہج البلاغہ' کے ذریعے لوگوں کی بھلائی و بیداری کا کام انجام دیتے ہیں۔ احمد محمود نے سماج کے اندر موجود خوبیوں اور بدیوں کی نشاندہی کی ہے اور اپنی آپ بیتی کو اس ناول میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ احمد محمود نے اس ناول میں ایران کے جنوبی خطے کے لوگوں کے خواہ دیہات کے رہنے والے ہوں یا شہر کے سب کے درد ورنج، فقر وتنگی اور مختلف مصائب وپریشانیوں کو بیان کرنے کے ساتھ لوگوں کے اندر پھیلی ہوئی خرافات، غلط اعتقادات، جہالت، بیماری اور لوگوں کی زندگی کے مختلف جہات سے بھی آشنائی بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ صرف خالد کی زندگی کی داستان نہیں ہے بلکہ اس دور کے لوگوں کی ایک حقیقی تصویر ہے۔ احمد محمود ایک بڑے رائٹر ہیں کئی سارے ناول لکھے ہیں لیکن ان کو شہرت اسی ناول کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ ناول ہمسایہ ہا ایرانی داستانوں کی فہرست میں ایک بے بہا کارنامہ شمار ہوتا ہے۔

منابع:

1. دستغیب، عبدالعلی، نقد آثار احمد محمود، چاپ اول، تہران: معین، 1999ش
2. محمود، احمد، ہمسایہ ہا
3. ترکمانی، وجیہہ وکبیری پوران، بررسی شخصیت زنان در 5 رمان احمد محمود، بہارستان سخن، 2011
4. اسحاقیان، جواد، داستان شناخت ایران نقد و بررسی آثار احمد محمود، تہران 2012
5. زینالی، پروین، رئالیسم سوسیالیتی در دو رمان ہمسایہ ہا و داستان یک شہر، احمد محمود، فصلنامہ علمی پژوہشی زبان وادب فارسی 2017
6. جلالی، فیروز نوری، باران بر زمین سوختہ، نقد رمانہای احمد محمود، چاپ اول، تہران 2007

Nigar
Turkaman Gate, New Delhi - 110006
Mob.: 9999875687
Email.: Nigar.du@yahoo.com

قمر حیدر

ہندوستان میں فارسی لغت نگاری

ایک تعارف

دنیا کی کسی بھی زبان کو جاننے اور پہچاننے کے لیے اس کے الفاظ وقواعد سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے، انھیں الفاظ ومحاوروں کو ابجد کی ترتیب کی رعایت کے ساتھ کتابی شکل میں جمع کر دینا لغت نویسی کہلاتا ہے اور ترتیب شدہ مجموعے کو لغت، فرہنگ، ڈکشنری اور شبد کوش کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لغت میں درحقیقت روزمرہ استعمال ہونے والے الفاظ، محاورات کی تشریح اور ضرب الامثال کی توجیہ وتوضیح درج ہوتی ہے۔ لفظ کس زبان کا ہے اس کی اصل کیا ہے، اس کی قواعدی نوعیت کیا ہے یہ ساری چیزیں لغت میں مذکور ہوتی ہیں۔

اس مقام پر یہ بات ذہن نشین کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لغات اور دائرۃ المعارف میں کچھ بنیادی فرق ہوتے ہیں، ان میں اہم ترین فرق یہ ہے کہ لغات میں بنیادی طور پر لغت ومعنی کو مدنظر رکھا جاتا ہے جبکہ دائرۃ المعارف میں مختلف موضوعات پر اجمالی معلومات درج کی جاتی ہیں۔

لغت نویسی نہایت ہی صبر آزما، وقت طلب اور طاقت فرسا فن ہے جس کا تعلق لسانیات اور علم زبان سے ہے اس کے لیے وسیع معلومات، الفاظ کا ذخیرہ، اس کے طریقہ استعمال سے آگہی، معنی، تلفظ واملا سے واقفیت وغیرہ درکار ہوتی ہے، نیز زمانے کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلیوں سے کسی حد تک آشنائی بھی ضروری ہے۔

کتب لغات کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لغت کی کتابیں مختلف النوع ہوتی ہیں، کچھ ایسی لغات ہوتی ہیں جس میں صرف اسی زبان کے الفاظ کے معنی محل استعمال اور طریقہ استعمال کو بیان کیا جاتا ہے، عموماً اردو فارسی لغات میں حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے کلمات والفاظ کی تشریح وتوضیح درج ہوتی ہے۔

کچھ لغات ایسی بھی نظر آتی ہیں جس میں دو زبانوں کا استعمال ہوتا ہے مثلاً اردو سے عربی یا عربی سے اردو، یا فارسی سے عربی وعربی سے فارسی میں الفاظ کی تشریح وتوضیح نیز معنی وغیرہ درج کیا جاتا ہے۔

بعض لغت میں کئی کئی زبانوں کا استعمال ہوتا ہے، الفاظ کے معنی وطریقہ استعمال کو چند زبانوں میں بیان کیا جاتا ہے، دور حاضر میں اس قسم کی لغات زیادہ مرسوم ہیں، ہر زبان کی لغت چند مختلف زبانوں میں ترتیب پا رہی ہے۔

لغت کی ایک قسم عصر حاضر میں یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ کسی علم یا موضوع سے متعلق کلمات واصطلاحات کی تشریح وتوضیح سے مختص ہیں مثلاً سائنسی علوم سے متعلق لغات، علم نجوم یا حکمت وفلسفے کی اصطلاحات پر مشتمل لغت۔

ہندوستان میں فارسی لغات کی تدوین:

فارسی زبان اپنی قدامت کے اعتبار سے متعدد ادوار سے گذری ہے اور ہر دور پچھلے دور کے بہ نسبت زیادہ ہی تابناک رہا ہے چونکہ کسی بھی زبان کو بہتر طریقے سے سمجھنے کا ایک ذریعہ لغات ہیں بلکہ ادبی منابع میں سے ہے اس لیے ہر دور میں ادبا ودانشوروں نے اس پر خاطر خواہ توجہ دی ہے، فارسی لغت نویسی کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے درمیانی مراحل سے فارسی لغت نویسی کا آغاز ہو چکا تھا، چنانچہ ڈاکٹر معین اپنی لغت فرہنگ معین کے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں:

ایسے شواہد دستیاب ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ لغت نویسی کا آغاز پانچویں صدی ہجری کے وسط میں ہو چکا تھا ممکن ہے اس سے پہلے بھی یہ کام ہوا ہو لیکن حوادث تاریخی کے ہاتھوں ضائع وتباہ ہو گیا اور اس کے اثرات نہیں ملتے ہیں۔ (مقدمہ فرہنگ معین)

فارسی زبان کی قدیم ترین لغت کے عنوان سے دو اہم نام قابل ذکر ہیں (1) فرہنگ پہلویک (2) فرہنگ

اویم۔ ان دونوں لغات کا تعلق فارسی میانہ سے تھا لیکن باقاعدہ فارسی لغات کی تدوین کا کام بظاہر پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوا اس صدی کی دو اہم کتابیں قابل ذکر ہیں۔ (1) رسالہ ابوحفص سغدی (2) تفاسیر لغۃ الفرس مؤلفہ شرف الزمان قطران بن منصور ارموی۔ پانچویں صدی کے مشہور شاعر تھے، سردست یہ دونوں کتابیں نایاب ہیں (فرہنگ فارسی معین، ص 39)

اس سلسلے میں قدیم ترین کتاب جو دستیاب ہے۔ فرہنگ اسدی یا لغت فرس اسدی مؤلفہ اسدی طوسی ہے۔ اس کے بعد ایک عرصہ دراز تک اس قسم کی کتابیں ترتیب نہیں دی گئیں یہاں تک کہ آٹھویں صدی میں شمس الدین محمد ہندوشاہ کے ذریعے صحاح الفرس لکھی گئی اس کے بعد متعدد لغات اسی صدی میں معرض وجود میں آئیں۔

ساتویں صدی ہجری میں شبہ جزیرہ ہند میں لغت نویسی کا آغاز ہوا کیونکہ ایرانیوں سے راہ ورسم بڑھے اور ایرانی تمدن کو ہندوستان میں رونق حاصل ہوئی، بڑھتے بڑھتے فارسی زبان ایران کے بعد ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی اور رائج زبان قرار پائی، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ تمام سلاطین و ہندوستانی راجاؤں نے فارسی زبان سے بخوبی آشنائی حاصل کرلیا، چوتھی صدی عیسوی سے ہندوستانی حکام سے ساسانیوں کے خاص روابط ومراسم تھے (فرہنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، مولفہ ڈاکٹر شہریار نقوی)

تاریخی حقائق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں نے فرہنگ نویسی اور لغت نگاری میں کوتاہی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کا شکوہ عظیم لغت نگار ڈاکٹر محمد معین کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

چونکہ ایرانیوں کی مادری زبان تھی لہذا انھوں نے لغت نگاری کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی جیسے عرب نے عربی لغت نگاری میں تساہلی سے کام لیا تھا مگر چونکہ عربی زبان ایرانیوں کی مذہبی زبان تھی لہذا ایرانیوں نے عربی لغت تدوین کرنے کا بیڑا اٹھایا...... ایرانیوں کی اسی عدم توجہی کے باعث ہندوستانی دانشوروں نے چونکہ ان کی سرکاری زبان فارسی تھی لہذا فارسی لغات کی تدوین کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے تالیف کا عمل شروع کیا گرچہ ان کا یہ اقدام قابل تحسین ہے لیکن چونکہ اہل زبان نہ تھے لہذا غلطیاں بھی بہت نظر آتی ہیں۔

(مقدمہ لغتنامہ علی اکبر دھخدا، ص 41)

ہندو پاک کے دانشوروں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے جلال الدین ہمائی رقمطراز ہیں: پرانے ہندوستان کے دانشوروں نے لغت نگاری کے حوالے سے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ایرانیوں سے کہیں زیادہ ہیں...... یہ خدمات ویسے ہی ہیں جیسے عربی زبان کی ایرانیوں نے خدمت کیا تھا۔ (فرہنگ نویسی در ہند و پاکستان مولفہ ڈاکٹر شہریار نقوی، ص 11)

قدیم ہندوستان میں مورخین کے بیان کے مطابق ساتویں صدی ہجری سے لغت نویسی کا باقاعدہ آغاز ہوگیا تھا اور مسلسل اس تعلق سے دانشوروں نے خدمات انجام دیں لیکن اس سلسلے کا سب سے زرین دور گیارہویں صدی کو کہا جاسکتا ہے جس میں یہ کام بام عروج پر پہنچا۔

ہندوستان میں لغت نگاری کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1. **ساتویں صدی سے نویں صدی ہجری تک:** اس دور میں لغت نگار دانشوروں نے الفاظ جمع کرنے پر زیادہ توجہ اور جدیت سے کام لیا اور یہ کوشش کرتے تھے کہ ہر نئی لغت مواد کے اعتبار سے پرانی لغت سے جدا و ممتاز رہے، اس دور کے مولفین چونکہ شعر سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے لہذا شاہد مثال کے طور پر اشعار زیادہ درج کیا ہے۔
2. **مغلیہ دور سے تیرہویں صدی تک:** اس دور میں لغت نگاری میں اک نیا طریقہ پیدا ہوا، الفاظ کی جمع آوری کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید پر بھی توجہ مبذول کی گئی، چنانچہ اس دور میں فارسی کو کافی حد تک ارتقا حاصل ہوا۔
3. **دور جدید یعنی چودہویں صدی ہجری:** اس دور میں چونکہ مغلیہ سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہوگئی تھیں اور ہندوستان پر انگلستان کا قبضہ بڑھتا جا رہا تھا سیاسی اتھل پتھل نے مسلمانوں کے تمدن، زبان اور فارسی ادب کو بھی متاثر کردیا کیونکہ انگریز فارسی کے بجائے اپنی زبان رائج کرنا چاہتے تھے لیکن یہ کوشش مکمل طور پر کامیاب نہ ہوسکی مسلمانوں نے اپنی زبان وتمدن کو انگریزوں کے عفریتی پنجوں سے بچالیا جس کے نتیجے میں متعدد زبانوں کا ایک مجموعہ اردو کے نام سے سامنے آیا۔ (فرہنگ نویسی در ہند وپاکستان مولفہ ڈاکٹر شہریار نقوی، ص 24)

ہندوستان میں پہلی لغت جو فارسی زبان میں لکھی گئی وہ فرہنگ قواس ہے جس کو علاء الدین محمد شاہ کے درباری شاعر مولانا محمد فخر الدین مبارک شاہ غزنوی معروف بہ کماگر یا قواس نے تالیف کیا تھا یہ کتاب نو سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے جو بھوپال کی حمیدیہ لائبریری میں موجود ہے یہ نسخہ مولانا نظام الدین فرماندار احمد آباد گجرات کے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے۔

(نامہ فرہنگستان، ج 1، شمارہ 60، مقدمہ برہان قاطع، ص 74)

مجلّہ آئینہ میراث، ص 106 پر علیم اشرف خان کا یہ جملہ اس کی تائید کرتا ہے: ہندوستان کے مشہور دانشور قاضی عبد الودود کے بقول ہندوستان میں تالیف ہونے والی قدیم ترین فارسی لغت 'فرہنگ فخر قواس' ہے لیکن ابھی ماضی قریب میں پروفیسر نذیر احمد نے ایک نئی لغت کا انکشاف کیا ہے جو اس سے بھی زیادہ قدیمی ہے جس کا نام 'فرہنگ قواس' ہے۔

(روزنامہ اطلاعات 16 مرداد، سال 1392)

ہم یہاں پر چند اہم قدیم ترین کتب لغت کے اسما درج کر رہے ہیں: فرہنگ قواسی مولفہ محمد فخر الدین مبارک شاہ، دستور الافاضل مولفہ مولانا رفیع دہلوی، بحر الفضائل مولفہ مولانا فضل الدین محمد بن قوام، مؤید الفضلا مولفہ مولانا محمد ابن لاد، ادات الفضلا مولفہ قاضی بدرالدین دہلوی، مجموع اللغات مولفہ ابوالفضل، فرہنگ جہانگیری مولفہ جمال حسین انجو، برہان قاطع مولفہ محمد حسین برہان تبریزی، فرہنگ رشیدی مولفہ عبدالرشید تقوی، لغات عالم گیر فاضل محمد دہلوی، سراج اللغات سراج الدین علی خان آرزو، چراغ ہدایت سراج الدین علی خان آرزو۔

چند فارسی لغات کا تعارف:

ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا رواج صدیوں پرانا ہے، فارسی زبان کے رائج ہونے کے بعد لغت نویسی کی ضرورت کے پیش نظر ہندوستانی دانشوروں نے نہایت تن دہی سے اس کام کو انجام دیا، سلاطین ہند کی ادب نوازی اور علم پرور طبیعت نے دل کھول کر ایسے افراد کی حمایت واعانت کی جس کے نتیجے میں آسودہ خاطر ہوکر بڑے وسیع پیمانے پر یہ کام انجام پایا اور لغات کی ایک طویل فہرست فارسی ادب کی کتابوں میں ملتی ہے، ہر ایک کتاب کے جداگانہ تعارف کے لیے پوری ایک کتاب ناکافی ہوگی مگر مضمون کی افادیت کے پیش نظر کچھ کتب کا اجمالی تعارف ہدیہ قارئین کرام کیا جارہا ہے۔

1. **بہار عجم:** دوسرے دور میں ہندوستان میں تالیف ہونے والی یہ لغت لالہ ٹیک چند بہار نے مرتب کیا تھا اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تقریباً دس ہزار مفردات، مرکبات ومثالوں کو درج کیا ہے اور اکثر معنی بیان کرنے میں اشعار سے استفادہ کیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بعض امثال، کنایات اور فارسی عبارات ایسی ہیں جو اس سے قبل کی لغات میں مذکور نہیں ہیں۔

مقدمہ میں لالہ ٹیک چند نے تحریر کیا ہے: یہ ذخیرہ ہے لغت واصطلاحات کا جس کو مروجہ کتب، معتبر شروح متقدمین کے دیوان ومثنویات سے حاصل کیا ہے۔

(پژوہشنامہ علوم انسانی، ص 28)

شاید اسی تحقیق وجستجو کا نتیجہ تھا کہ یہ لغت بعد کے لغت نویس دانشوروں کے لیے عظیم سرچشمہ علم قرار پائی جس کے سبب مولف کی زندگی میں ہی متعدد مرتبہ طبع ہوئی۔ مولف آصف اللغات بہار عجم کی جامعیت کے حوالے سے بیان کرتے ہیں: متعدد مفردات اور بہت سے مرکبات درج کیا ہے ،اکثر الفاظ میں متقدمین ومتاخرین سے متعدد اسناد ذکر کیے ہیں جس سے مرکبات میں تازگی نظر آتی ہے...اس کی جامعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے اساتذہ فن کے کلام یکجا کر دیا ہے۔

(آصف اللغات، ج 1، ص 5)

اس کتاب کی عظمت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تکمیل تدوین سے لے کر ہمیشہ یہ کتاب ادبی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی، متاخرین نے اس کتاب سے بھر پور استفادہ کیا ہے، فرہنگ آنند راج، لغتنامہ دہخدا، فرہنگ نفیسی ،فرہنگ معین جیسی عظیم کتابوں میں بہت سے مفردات ومرکبات کی تشریح کو من وعن نقل کر دیا گیا ہے۔

سراج اللغات: سراج الدین علی خان آرزو نے تالیف کیا ہے ،ہندوستان میں فارسی لغت نگاری کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے، انھیں نے سب سے پہلے زبان شناسی کے فارمولے اور فارسی وسنسکرت زبان کے درمیان کے روابط کو واضح کیا اور نہایت اہم اقدامات کیے۔

آپ نے دو کتابیں علم لغت میں تالیف کیا تھا۔ (1) چراغ ہدایت (2) سراج اللغات ،اول الذکر کتاب مختصر مگر دوسری کتاب محمد شاہ کے دور میں 1147ھ میں تالیف کیا۔

ڈاکٹر شہریار نقوی تحریر کرتے ہیں: سراج اللغات باوجودیکہ اہم وعظیم اور نہایت قیمتی لغت تھی مگر کبھی طبع نہیں ہو سکی کہا جاتا ہے کہ کرناٹک کے ایک نواب کے دور میں طبع ہوئی تھی مگر اس کا کوئی نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔

(فرہنگ نویسی در ہند و پاکستان، ص 112)

اس لغت میں مولف نے ثقافتی مباحث کے ساتھ ساتھ اعلام جغرافیائی اور تاریخی بھی درج کیے ہیں۔

فرہنگ آنند راج: مولفہ محمد بادشاہ فرزند غلام محی الدین، یہ کتاب آنند نامی بادشاہ کی تشویق پر ترتیب پائی تھی اس میں اس دور میں استعمال ہونے والے عربی، فارسی، ترکی، مغلی اور ہندی الفاظ درج ہیں ،کتاب کی تدوین میں گذشتہ مصنفین کے تجربات وطریقوں سے خوب استفادہ کیا ہے۔

الفاظ کا تلفظ، قواعدی مباحث، مختلف معانی کو جدا جدا لکھنا، معنی مجازی وکنایہ کی تشخیص ،عروض وبدیع کی اصطلاحات کا اندراج اس کی اہم خصوصیات ہیں۔

یہ لغت تیس ابواب پر مشتمل ہے،اس کتاب میں الف ممدودہ اور ہمزہ کے درمیان کا امتیاز نظر نہیں آتا ہے، مولف نے الفاظ فارسی کے ریشہ واصل کے بیان پر زیادہ توجہ دیا ہے مگر بعض مقامات پر اصل بیان کرنے میں سہو کے مرتکب ہوگئے ہیں اور علمی مباحث سے گریز کرتے ہوئے صرف گمان پر بھروسہ کیا ہے۔

فرہنگ جہانگیری: 1017ھ میں تالیف ہوئی جو ایک بہترین وجامع ترین لغت ہے،مصنف جمال الدین حسین انجو اکبر بادشاہ کے دربار کے امرا میں سے تھے ،اس میں ترین لغات سے استفادہ کیا گیا ہے،اور بعض الفاظ ومفردات جو خود ان کی تحقیق کا نتیجے ہیں درج ہیں۔ وہ خود بیان کرتے ہیں: میں نے بعض ایسے کلمات بھی درج کیے ہیں جس کا وجود دیگر کتب لغت میں نہیں ملتا ہے اس کے لیے تحقیق کی ضرورت تھی کہ ان مناطق میں بسنے والے ادبا سے استفسار کیا جائے۔

لغت کی ترتیب پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ ہر کلمہ کے دوسرے حرف کو باب اور پہلے حرف کو فصل کا عنوان دیا ہے اسی وجہ سے اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں کی جاتی ہے

(فارسی زبان در ہند (www.fa.wikipedia.org/wiki/)

فرہنگ رشیدی: عبد الرشید حسینی سندھ کے رہنے والے تھے انھوں نے فارسی کلمات ومفردات کے بارے میں اچھی تحقیق پیش کیا ہے وہ خود تحریر کرتے ہیں:

چونکہ میں نے دو عظیم لغت کا مطالعہ کیا 'فرہنگ جہانگیری' و'سروری' دونوں میں ایسے امور نظر آئے جن سے اجتناب ضروری تھا۔ (1) دونوں لغت میں بے جا تفصیل، بے حاصل عبارات کی تکرار اور غیر ضروری اشعار کی کثرت سے پر ہیں۔ (2) بعض الفاظ کی تصحیح، اعراب کی وضاحت، معنی کی تنقیح کما حقہ نہیں کی گئی ہے جو ضروری تھی۔ (3) اغلاط واشتباہات کی زیادتی۔

(فرہنگ نویسی در ہند و پاکستان، ص 102)

برہان قاطع: مولفہ محمد حسین متخلص بہ برہان، 1062ھ میں ترتیب حروف تہجی کی رعایت کے ساتھ تدوین عمل میں آئی ہے،اس کتاب کو مصنف نے گولکنڈہ کے بادشاہ سلطان عبد اللہ قطب شاہ کے نام سے معنون کیا ہے،اس لغت کو خوب شہرت ملی اور کئی مرتبہ طبع ہوئی۔

قاطع برہان: 1278ھ میں اسد اللہ خان غالب نے برہان قاطع کی تصحیح کے عنوان سے ترتیب دیا تھا، دراصل غدر کے ایام میں جب غالب خانہ نشینی پر مجبور ہوگئے تو ان کے پاس صرف برہان قاطع نامی کتاب تھی لہذا اسی کے مطالعے میں مصروف ہوگئے اور دوران مطالعہ جہاں کہیں بھی برہان قاطع کے مندرجات سے اختلاف کرتے تھے یا جہاں کہیں بھی اعتراض نظر آتا اس کی اصلاح کی غرض سے حاشیہ نویسی شروع کر دیا اور بغیر کسی لغت کے سہارے ذاتی معلومات کی بنیاد پر ایک سو انیس غلطی کی نشاندہی کیا۔

منابع

1. آصف اللغات۔
2. پژوہش نامہ علوم انسانی
3. روزنامہ اطلاعات
4. فرہنگ معین
5. فرہنگ نویسی در ہند و پاکستان
6. مقدمہ لغتنامہ دہخدا
7. مقدمہ برہان قاطع
8. مجلّہ آئینہ میراث
9. نامہ فرہنگستان
10. زبان فارسی در ہند www.fa.m.wikipedia.org/wiki

Qamar Haider
46 E, Barhamputra Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.: 9910786441

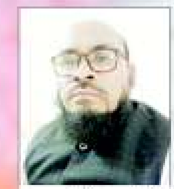
محمد جمیل اختر جلیلی ندوی

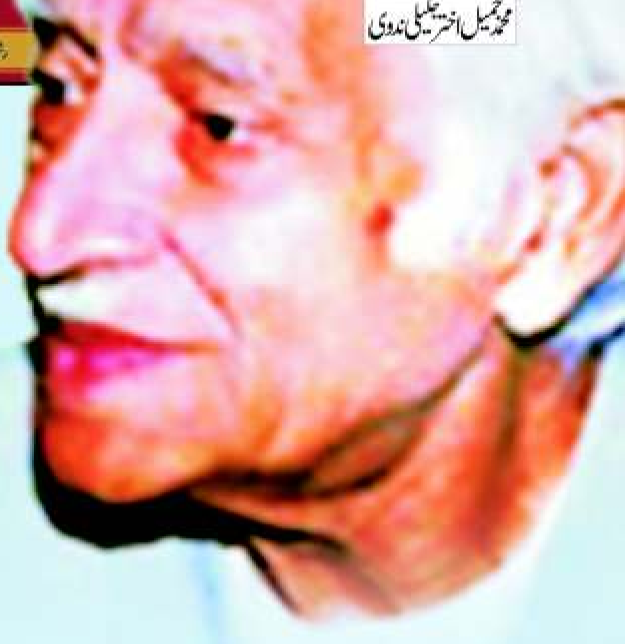

رشید اختر ندوی اور ان کی ناول نگاری

ندوۃ العلما کسی ادارے کا نام نہیں؛ بلکہ یہ ایک ہمہ گیر علمی، ادبی، دینی، اصلاحی اور تعلیمی تحریک کا نام ہے، جس کا قیام 1894 میں لکھنؤ میں ہوا۔

بانی ندوہ مولانا محمد علی مونگیریؒ کے نظام تعلیم و تدریس خاکہ میں یہ بات درج تھی کہ دارالعلوم میں جن علوم وفنون پرخاص توجہ دی جائے گی، ان میں تاریخ وادب بھی ہے؛ چنانچہ جب ہم وہاں کے فارغین کی فہرست پرنظرڈالتے ہیں توعلوم شرعیہ پردسترس کے ساتھ ساتھ احسان وسلوک، تاریخ وفلسفہ اور ادب وصحافت پربھی دستگاہ رکھنے والوں کے نام پاتے ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی، عبدالرحمن کاشغری ندوی، عبدالسلام قدوائی ندوی، شاہ معین الدین ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، ابوالجلال ندوی، ریاست علی ندوی، سید ابوظفر ندوی، مسعود عالم ندوی، رئیس احمد جعفری ندوی، محمد ناظم ندوی، ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، پروفیسر محمد اجتبا ندوی، ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، مولانا رابع حسنی ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی ندوی، سید رضوان علی ندوی، سید ضیاء الحسن ندوی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی اور مولانا نذر الحفیظ ندوی وغیرہم ادبا، مؤرخین اور صحافیوں کی اس طویل فہرست میں شامل ہیں، اسی طویل فہرست کا ایک نمایاں نام 'رشید اختر ندوی' بھی ہے۔

رشید اختر ندوی کی پیدائش 13/جنوری 1918 کو دہلی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم دہلی میں ہی ہوئی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلما کا رخ کیا اور وہاں سے سند فضیلت حاصل کی، ندوہ سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی اے کیا، وہ خود لکھتے ہیں:

''اسے ایک پاکستانی مصنف کا خط ہندوستانی بھائیوں کے نام تصور کرلیجیے یا ایک اس شخص کا ایک طویل سلام بنام وطن سابق قرار دیجیے، جس کا خمیر ہندوستان کی پاکیزگی سے اٹھا، جو دہلی میں پیدا ہوا، جس نے دہلی ولکھنؤ میں تعلیم پائی اور جو بمبئی (ممبئی) کے ماحول میں زندگی کی سچی مسرتوں اور کامرانیوں سے آشنا ہوا'' (تشنگی، دیباچہ، ص:7)

دہلی، لاہور اور پشاور کے متعدد روزناموں کے نیوز ایڈیٹر اور چیف ایڈیٹر رہے، 1973 میں ادارۂ معارف ملی (اسلام آباد) کے سکریٹری مقرر ہوئے، 21/جولائی 1992 میں مری (پاکستان) میں وفات پائی اور مرکزی قبرستان اسلام آباد میں تدفین عمل میں آئی۔ (وفیات اہل قلم، از: ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ، ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان 2008، وکیپیڈیا: رشید اختر ندوی)

رشید اختر ندوی عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے، مولوی ضرور تھے؛ لیکن نرے مولوی نہیں تھے، وہ ندوی ضرور تھے؛ لیکن ندوی سے بڑھ کر بھی تھے، ہمارے برصغیر کے مولویانہ معاشرہ میں دو میدان کافی مبغوض رہے ہیں، ایک سیاست کا میدان اور دوسرا پردۂ سیمیں کا میدان، رشید اختر ندوی کشت زار پردۂ سیمیں کے کیچڑ سے بھی لت پت ہوئے ہیں، جس کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

فلمی دنیابھی ایک عجیب دنیاھے اور میں نے ڈیڑھ سال یہاں رہ کربہت کچھ سیکھا اوربہت کچھ پایاھے ، یہاں کی ھرچیزھماری دنیاسے مختلف ھے ، کردار، اخلاق، سمجھ بوجھ اور یہاں تک که چھرے مھرے اورکبھی کبھی تومجھے بعض آدمیوں کودیکھ کر ایسا محسوس ھوا، جیسے یه آدمی کسی اورآدم کی اولادھیں، یہاں کاھرآدمی ایک بڑا فرعون ھے، مطلق العنان اور خود مختار فرعون، میراجی توبہت چاھاکه ان فرعونوں کے فلمی چھرے تیارکروں؛ مگر دماغ نے دل کی یه بات رد کردی اوربہت سی باتوں سے ڈرادیا.

’’فلمی دنیا بھی ایک عجیب دنیا ہے اور میں نے ڈیڑھ سال یہاں رہ کر بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ پایا ہے، یہاں کی ہر چیز ہماری دنیا سے مختلف ہے، کردار، اخلاق، سمجھ بوجھ اور یہاں تک کہ چہرے مہرے اور کبھی کبھی تو مجھے بعض آدمیوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا، جیسے یہ آدمی کسی اور آدم کی اولاد ہیں، یہاں کا ہر آدمی ایک بڑا فرعون ہے، مطلق العنان اور خودمختار فرعون، میرا جی تو بہت چاہا کہ ان فرعونوں کے قلمی چہرے تیار کروں؛ مگر دماغ نے دل کی یہ بات رد کردی اور بہت سی باتوں سے ڈرا دیا۔(نسرین، یک حرف، ص 6-5)

وہ بیک وقت کئی میدانوں کے شہسوار تھے، وہ ایک کامیاب مؤرخ بھی تھے، ایک اچھے صحافی بھی تھے، عمدہ مترجم بھی تھے اور ایک مایہ ناز ادیب بھی، ترجمہ نگاری کے شاہکار کے طور پر ہم ’تزک بابری‘ اور ’ہمایوں نامہ‘ کو پیش کرسکتے ہیں، ان دونوں کو انھوں نے فارسی سے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔

تاریخ نگاری میں سوانحی تاریخ رشید اختر ندوی کی حد درجہ پسندیدہ قسم تھی، جس کی ابتدا سیرت سے ہوتی ہے، ’محمد رسول اللہ‘ سیرت پر ان کی ایک منفرد کاوش کہی جاسکتی ہے؛ لیکن اس کے بعض مندرجات پر اعتراض ہونے؛ بلکہ اس کی وجہ سے ’گستاخ رسول‘ کے لقب سے ملقب کرکے مقدمہ درج کیے جانے کی وجہ سے اس میں حک واضافہ کرکے ’محمد سرور دو عالمؐ‘ کے نام سے اسے دوبارہ شائع کیا گیا، خلافت راشدہ، عمر بن عبدالعزیز، محمد بن ابی عامر، صلاح الدین ایوبی، حیدر علی، اورنگ زیب، اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

تاریخ کے ساتھ ساتھ چمنستانِ ادب کو بھی انھوں نے وردو یاسمین اور سوسن ونسرین سے مالامال کرنے کی

بھرپور کوشش کی ہے اور انھوں نے تقریباً دو درجن کے قریب تاریخی، معاشرتی، نفسیاتی اور رومانی ناول لکھے، وہ جس طرح ایک کامیاب تاریخ نویس تھے، اسی طرح ایک کامیاب ناول نگار بھی اور جس طرح ان کی تاریخ نویسی نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، اسی طرح ان کے ناولوں نے بھی لوگوں کو اپنی طرف کھینچا، اور اس زور سے کھینچا کہ ایک ایک ناول کو ایک سال کے عرصے میں متعدد بار پریس کی زیارت سے شرف یاب ہونا پڑا، رشید اختر ندوی کے قلم کی طاقت نے نہ صرف یہ کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کے دل موہ لیے؛ بلکہ اہل قلم نے بھی خوب سراہا۔

ان کے ناولوں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے، جو ان کے ناشر نے ’عرض ناشر‘ کے طور پر دوسرے اور تیسرے ناول پر تبصرہ کیا ہے، ظہیر صاحب ان کے دوسرے ناول ’سوز دروں‘ پر لکھتے ہیں: ’’مولانا رشید اختر ندوی کا پہلا ناول ’ساز شکستہ‘ توقع سے زیادہ مقبول ہوا، جمہور نے تو اسے پسند ہی کیا؛ لیکن ملک کے مستند اہل قلم نے بھی ساز شکستہ کو سراہا اور اسی کو مصنف کا ایک ادبی شاہ کار بتایا، ’سوز دروں‘ مصنف کا دوسرا ناول ہے، جو پہلے ناول کی اشاعت کے بہت تھوڑے دن بعد چھپا اور ملک میں اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ موصوف کا یہ ناول کاغذ کی اس گرانی اور قحط کے دور میں دوبارہ شائع کیا جارہا ہے‘‘ (سوز دروں، عرض ناشر، ص 4)

’سودائی‘ کے ’عرض ناشر‘ میں لکھا ہے کہ: ’’یہ رشید اختر ندوی کا تیسرا ناول ہے، رشید اختر کے ناول ’ساز شکستہ‘ کا موضوع اتنا اچھوتا اور طرز بیان اس قدر دلچسپ تھا کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو مصنف سے غیر معمولی دلچسپی ہوگئی، مصنف کے دوسرے ناول ’سوز دروں‘ سے یہ دلچسپی اور بھی بڑھ گئی اور ہم سے تقاضے پر تقاضے ہونے لگے کہ مصنف کا کوئی اور ناول جلد سے جلد چھاپیں، مصنف نے یہ ناول سودائی لکھا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ ایک سال کے اندر اندر ہمیں اسے دوبارہ چھاپنا پڑا اور اب یہ پانچویں بار چھپ رہا (یہ 1949 کی بات ہے)، مصنف کے پہلے دونوں ناول چوتھی چوتھی بار چھپے ہیں اور اردو کہانی کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ کسی ناول نویس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہو‘‘۔

(سودائی، عرض ناشر ظہیر، ص 4)

ناشر کی اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ناول نگار اپنی ناول نگاری کے فن میں کمال درجہ کو پہنچے ہوئے تھے؛ چنانچہ انھوں نے جب اپنا پہلا ناول ’ساز شکستہ‘ اردو کے نامور شاعر، صحافی اور افسانہ نگار عبدالمجید سالک

وہ بیک وقت کئی میدانوں کے شہسوار تھے، وہ ایک کامیاب مؤرخ بھی تھے، ایک اچھے صحافی بھی تھے، عمدہ مترجم بھی تھے اور ایک مایہ ناز ادیب بھی، ترجمہ نگاری کے شاہکار کے طور پر ہم ’تزک بابری‘ اور ’ہمایوں نامہ‘ کو پیش کرسکتے ہیں، ان دونوں کو انھوں نے فارسی سے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔

کے پاس مقدمہ کے لیے بھیجا تو انھوں نے اس طرح اظہار خیال کیا: ’’مولانا رشید اختر ندوی نے جب اپنے اس افسانے کا مسودہ مجھے مقدمہ کی تحریر کے لیے دیا تو میں نے اپنے دل میں یہ نیت کرلی کہ اگر افسانہ معیاری اعتبار سے پست ہوا تو اس عزت واحترام کے باوجود، جو مولانا کے فضل وکمال کے متعلق میرے دل میں جاگزیں ہے، میں مقدمہ لکھنے سے صاف انکار کردوں گا؛ لیکن افسانے کو سرسری نظر سے دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ مصنف صرف ندوۃ العلما کا مولوی ہی نہیں؛ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے اور اس تحریر میں کامیاب افسانہ نگاری کے تمام عناصر موجود ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگرچہ اس افسانے کا پس منظر رومانوی ناولوں کی طرح ایک نواب کا خاندان اور کشمیر کے مناظر ہیں؛ لیکن نقطۂ نگاہ کافی ترقی پسند ہے اور مولانا کے نزدیک افسانہ خالص تفریحی صنف ادب نہیں؛ بلکہ سماج کی بعض دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑنا بھی اس کے مقاصد میں شامل ہے‘‘

(ساز شکستہ، ص 6)

مولانا کے ناولوں کی مقبولیت عوام خواص میں اتنی کیوں تھی؟ اس کو واضح کرتے ہوئے ظہیر صاحب لکھتے ہیں: ’’مولانا رشید اختر ندوی کے برسوں کے صحافتی اور تصنیفی تجربے نے آپ کی نگاہ کو دوربین بنا دیا ہے، ان کا ادبی مطالعہ بہت وسیع ہے اور زندگی کا مطالعہ اس سے بھی زیادہ وسیع، انسانی نفسیات، گناہ وثواب کی کشمکش، ہوس ومحبت کی دبی ہوئی خواہشیں، سچے عشق کی پاکبازیاں اور غلط راہ پر پڑ کر اس کی بے عنوانیاں ان مسائل کو بیان کرنے میں مولانا کو بڑا عبور حاصل ہے، مولانا بہت صاف زبان لکھتے ہیں، ان کے ناول کے کرداروں کے مقالات زندہ اشخاص کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جو وہ ہمارے سامنے کرتے نظر آتے ہیں‘‘۔ (سوز دروں، عرض ناشر، ص 4)

رشید اختر ندوی کی ناول نگاری اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے پورے اترتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ان کے مولوی اور مؤرخ ہونے کی وجہ سے ناول اپنی سطح سے کچھ نیچے گر گئے ہوں، ان کے ناولوں میں جو بھی قصہ، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظرکشی اور نقطۂ نظر ہیں، سب اپنی جگہ پرفکٹ ہیں، عبدالمجید سالک اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''افسانے کے سب سے زیادہ اہم اجزا اس کے کردار ہیں اور جب سے ادب کی یہ صنف پیدا ہوئی ہے، اس وقت سے آج تک اس کی تنقید کا ایک نمایاں معیار یہ رہا ہے کہ مصنف نے جن کرداروں کا تعارف کرایا ہے، وہ کیسے ہیں؟ آیا حقیقی زندگی میں ایسے کردار پائے جاتے ہیں؟ آیا مصنف کے ذہن میں ان کرداروں کی خصوصیات منظم ومنضبط طریق پر موجود ہیں؟ اور آیا افسانے میں اس نے ان سب کو پوری طرح نباہ دیا ہے یا نہیں؟ اس افسانے کے پڑھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ نواب ہو، یا نجمی، سلمیٰ ہو یا للی، سب کے سب کردار جیتے جاگتے انسانوں کے ہیں اور جن طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی خصوصیات کی نمائندگی بوجہ اتم کرتے ہیں'' (سازشکستہ، ص 7)

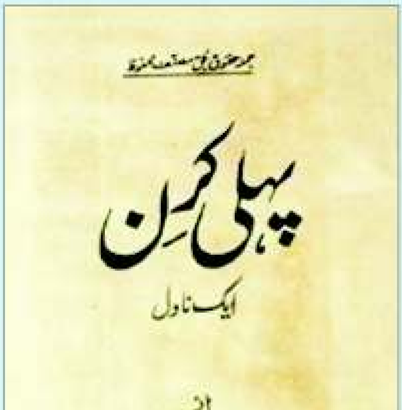

رشید اختر ندوی کا پہلا ناول 'سازشکستہ' جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے شروع ہونے والی کہانی ہے، جہاں سلیم اور نواب زادہ محمود کی ملاقات ہوتی ہے، جیل انگریزوں سے بغاوت کے جرم کی سزا کے طور ہوئی ہے، دونوں میں گرچہ دولت وثروت کے لحاظ سے فرق مراتب ہے؛ لیکن جیل کی فضا میں چونکہ اس کا لحاظ نہیں، جس کی وجہ سے دونوں میں خوب دوستی ہو جاتی ہے، جو وہاں سے باہر آنے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے؛ بلکہ یہ دوستی گھریلو تعلقات میں بدل جاتی ہے؛ لیکن پھر دولت اپنی اوقات بتا ہی دیتی ہے، ساحر نے ٹھیک ہی کہا ہے: ''ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر، ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق''، یہاں بھی سلیم کی غربت کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور ان تمام احسانات کو بھلا دیا جاتا ہے، جو سلیم نے نواب زادہ محمود صاحب پر کی تھیں اور جن کی بدولت نواب صاحب معاشرہ اور اپنے ہم پلہ لوگوں میں باوقار اور ایک مصنف کی حیثیت سے معروف تھے، پھر یہ مذاق بھی اس اخلاص اور احسان کے بدلے میں تھا، جو سلیم نواب صاحب کی چھوٹی بہن سلمیٰ پر کرنا چاہتے تھے، 'سازشکستہ' کا آخری حصہ پڑھیے اور ان تمام چیزوں کو درد اور کسک کے ساتھ چشم تصور سے محسوس کیجیے، جو سلیم نے محسوس کیا تھا:

''مجھے صحیح نہیں معلوم کہ نوجوان کتنی دیر بعد واپس لوٹے؛ لیکن یہ یاد ہے کہ جب وہ نکلے تو ان کے پیچھے نواب زادہ اکرام بھاگ رہے تھے، اکرام کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ اسے نوجوان پر داغنا چاہتا تھا؛ لیکن مجھے عین سامنے پاکر وہ اپنے ارادہ میں ناکام رہا اور نوجوان صاحب بھاگ نکلے، یہ داستان عام ہوگئی اور نواب صاحب کے کانوں تک بھی جا پہنچی، وہ بڑے پریشان ہوئے، انتہائی پریشان، ان کی پریشانی میں نجمی کے شوہر نے سلیمان مرزا کا قصہ کہہ کر اور اضافہ کر دیا، انھوں نے سلمیٰ پر شاید عمر میں پہلی بار ہاتھ اٹھایا اور اتنا مارا کہ سلمیٰ بے ہوش ہوگئی، دوسرے دن یہ ساری داستان سلمیٰ نے مجھ سے کہی، وہ زار وقطار رو رہی تھی، اس کی خوبصورت آنکھیں روتے روتے سرخ ہو چکی تھیں، وہ کہہ رہی تھی اب میں بدنام ہوگئی، میری زندگی تباہ کر دی گئی، مجھ سے اب کون بیاہ کرے گا؟ میں نے دیکھا سلمیٰ زندگی کی خوشی بیاہ میں سمجھتی ہے، سماج کے ظاہری بندھن میں بندھ کر وہ مطمئن ہو جائے گی تو میرے دل میں ایک لہر پیدا ہوئی، عمر میں پہلی بار اور غیر محسوس طور پر زبان پر یہ الفاظ آگئے:

''سلمیٰ! تم سے میں شادی کروں گا؛ لیکن اس وقت، جب کوئی اور شادی نہ کرے''۔

سلمیٰ کے آنسو رک گئے اور بولی:

''آپ سچ کہتے ہیں؟''۔

میں نے کہا:

''سچ، بالکل سچ''۔

''تو نواب صاحب سے پھر کہیے گا؟''۔

سلمیٰ یہ کہہ کر خوش خوش چلی گئی، میں نے سلمیٰ سے یہ بات کہہ تو دی؛ لیکن بعد میں سوچا کہ نواب صاحب کے حضور میں ایک سائل کی حیثیت سے میں کیسے جا سکوں گا؟ اور آخر مجھے جانا ہی پڑا، اظہار مدعا پر نواب صاحب نے پیشانی پر بل ڈال کر میری طرف دیکھا، میں سمجھا وہ مجھے نگل جانا چاہتے ہیں اور سچ مچ ان کی خواہش یہی تھی، اس کا انھوں نے اظہار بھی کر دیا، بولے:

''تم نے آج میرے سینے میں چھری چبھو دی، تم نے نہیں سوچا میرا اور تمھارا معیار زندگی کتنا مختلف ہے، سلمیٰ میری بہن ہے، ایک بڑے نواب کی بہن، اس کے لیے موٹر چاہیے اور اعلیٰ درجے کا مکان بھی، اس کے لیے اچھے سے اچھے لباس اور کھانے کی ضرورت ہے اور تم ایک معمولی اخبار نویس ہو، محض دال روٹی پر گزر کرنے والے''۔

دفعتاً ان کی آواز تیز ہوگئی اور فرمانے لگے:

''اب تم نے یہ بات کہہ دی، مجھے تم بہت عزیز ہو؛ لیکن اس کی کیا ضمانت کہ میری بہن کی زندگی تمہارے ساتھ اچھی کٹے گی، نہ رہنے کو مکان، نہ موٹر اور نہ کوئی اور جائداد، آخر آپ کس برتے میری بہن سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کو یہ کہتے شرم نہ آئی''۔

اس کے بعد حضور نواب صاحب بہت کچھ بکتے رہے، ایسی ایسی باتیں ان کی زبان سے نکلیں، جنھیں میری غیرت کبھی سن نہ پائی تھی؛ مگر میں سنتا رہا اور جب وہ انتہائی رذالت پر اتر آئے تو میں نہ رہ سکا اور کہہ اٹھا:

''نواب صاحب! یہ میری نہیں، سلمیٰ کی خواہش ہے اور اس لیے ہے کہ اسے ڈر ہے کہ شاید دنیا میں کوئی سوداگر اس داغ دار موتی کو خریدنا نہ چاہے''۔

نواب صاحب کا غصہ کچھ دھیما ہوا؛ مگر صرف تھوڑی دیر کے لیے، وہ ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے بولے:

''تم اس کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہو، یہ تم لوگوں کی فطرت ہے، رذیل اور کمینی فطرت؛ مگر تمھیں نہیں معلوم دولت ہر عیب کو دھو سکتی ہے اور سلمیٰ کا یہ عیب بھی دولت دھو دے گی''۔

میں نے نواب صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا اور مجھے ایسے آثار نظر آئے کہ مجھے یقین ہوگیا کہ دولت سچ مچ ہر عیب دھو دیتی ہے، یہ غربت ہی ہے، جس میں نیکی بھی عیب دکھائی دیتی ہے اور جب غربت داغ دار ہو جاتی ہے تو اسے کوئی نہیں دھو سکتا، میں نے سلمیٰ سے ہمدردی کرنی چاہی تھی، اس کی زندگی کو خوش رکھنا چاہا تھا اور اخلاص اور سچی محبت کے سرمایہ پر بھروسہ کیا تھا، یہ میری بھول تھی، بہت بڑی بھول، دنیا اخلاص کو نہیں دیکھتی، اس کی نگاہ ظاہر پر پڑتی ہے اور یہ اس کی پرانی ریت ہے، ناقابل تبدیل ریت''۔ (سازشکستہ، ص 157-160)

ناول کے اس آخری حصے سے آپ کو قصہ، پلاٹ، کردارنگاری، مکالمہ نگاری، منظرکشی اور نقطۂ نظر ساری چیزیں معلوم ہوگئی ہوں گی اور آپ نے رشید اختر ندوی کے اس پہلے ناول سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ ان کے قلم میں بہترین ناول نگاری کا جوہر موجود ہے، ساتھ میں یہ بھی دیکھا ہوگا کہ سلاست وروانی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان نہایت سہل اور آسان ہے، نہ تعقید لفظی ہے اور نا ہی تعقید معنوی، نیز رنج وغم اور حزن والم کا تلاطم خیز، بے کراں اور اتھاہ سمندر بھی پائے گا، جو ان کے ناولوں کی عمومی خصوصیات میں سے ہے۔

بعض حضرات نے رشید اختر ندوی پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ ان کے ناول مقصدیت سے خالی ہوتے ہیں؛ لیکن یہ بات عقل وقیاس سے بعید ہے؛ کیونکہ ایک مصنف جب کچھ لکھتا ہے تو اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ مقصد ہوتا ہے، اگر کسی تحریر کے پیچھے مقصد نہ ہو تو وہ تحریر مقبول بھی نہیں ہوگی، جبکہ پیچھے یہ بات بتائی جاچکی ہے کہ رشید اختر کے ناول مقبول ہوئے ہیں؛ بلکہ ایک ایک ناول کو چند ہی سالوں کے اندر پانچ پانچ مرتبہ بھی چھاپنے کی نوبت آئی ہے۔

رشید اختر ندوی کا ایک ناول 'نسرین' کے نام سے ہے، یہ ایک معاشرتی ناول ہے، وہ خود اس ناول کی تحریر کا مقصد واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہوسکتا ہے میرے اس ناول سے ان نوجوان لڑکیوں کو کچھ روشنی ملے، جو فلمی دنیا میں آنے کے لیے تڑپ رہی ہیں اور خدا کرے اس لائن میں وہ اس طرح نہ آئیں، جیسے کہ یہاں اکثر لڑکیاں لائی جاتی ہیں... اور یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے اور میں نے اس موضوع کو کیوں ناول کی صورت دی ہے؟ محض اس لیے کہ ہمارے وطن کا معاشرتی نظام انتہائی ناپاک اور مکروہ ہے اور ضرورت ہے کہ اس نظام کو بدل دیا جائے اور جب تک یہ نظام نہیں بدلے گا، اس وقت تک ہزار نسرین، ہزار بیگم ساڑی اور ہزار ثروت جاہیں اس ہندوستان کے ہر گلی اور ہر کوچے میں ماری ماری پھرتی نظر آئیں گی اور انھیں ہر گھڑی اور ہر آن ہزار دھوکے دیے جاتے رہیں گے'' (نسرین، ص7)

ان کا ایک شاندار ناول 'تشنگی' ہے، تین سو تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس کے پڑھنے کے بعد ان کے بقیہ ناولوں کو پڑھنے کی تشنگی دوچند ہوجاتی ہے، یہ ناول خود بھی تشنگی کو بڑھاتا رہتا ہے اور جب تک قاری ختم نہیں کرلیتا، اس وقت تک اضطرابی کیفیت سے دوچار رہتا ہے، اور بقول نعمان منظور: ''یہ ناول اردو ناول نگاری میں اس مقام پر جلوہ گر ہوا، جب کہ اردو ناول نگاری

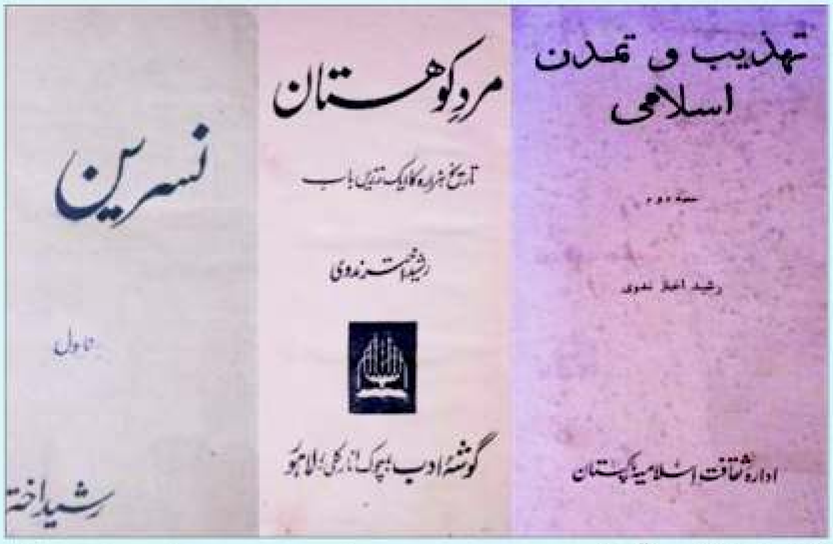

گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔''

(https://dunya.com.pk/index.phd/special-feature/2014-05-22/9198)

اس ناول کے لکھنے کا اصل مقصد کیا ہے؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے خود مصنف اس کے دیباچے میں لکھتا ہے: ''یہ ''تشنگی''، جس کے پہلے حرف سے لے کر آخر حرف تک ہر حرف میرے لیے تشنگی، بھوکی روح کا سچا ترجمان ہے، مجھے اپنے سارے ناولوں میں سب سے زیادہ پیارا ہے...... یہ ناول اس وقت کی تصنیف ہے، جب ہندوستان غلام تھا اور انگریزوں کے جابر وظالم پنجے نے ہندوستانیوں کے گلے گھونٹ رکھے تھے، اس وقت میری روح ایک ایسے سماج اور ایک ایسے نظام کے لیے تڑپی، جس میں آدمی نہ ہندو ہوتا نہ مسلمان، نہ پارسی ہوتا نہ عیسائی، اس ناول کا ہیرو محسن، اس ناول کی ہیروئن میری اور اجیت، سب ہی ننگے، بھوکے اور محتاج تھے، سب کا مذہب ننگے آدم کا مذہب تھا، سب کے نام گو مختلف تھے؛ مگر سب کا عقیدہ ایک تھا، آدمی صرف آدمی رہے اور آدمی رہ کر ہی اپنا منصب پہچانے، اگر 'تشنگی' کے پڑھنے والے ان 'آدمیوں' کی تشنہ روحوں کو سمجھ لیں، جو اس ناول کے اندر بھاگتے وگرتے اور سوچتے ہیں تو رشید اختر ندوی، اس کا تشنہ روح مصنف بڑا سکون پائے گا۔'' (تشنگی، دیباچہ، ص8)

رشید اختر ندوی کا یہ ناول ملک کی آزادی سے پہلے کا ہے، جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے؛ لیکن اس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس کے کردار آج کے چلتے پھرتے نمونے ہیں۔

تاہم یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہر مصنف کی طرح ان کے بھی بعض ناولوں کے کردار میں کچھ جھول بھی ہے اور یہ مصنف کے لیے عیب کی بات نہیں؛ کیونکہ مصنف انسان ہے اور انسان ہونے کے ناطے ایسا ہونا فطری بات ہے، دنیا کے کسی بھی مصنف کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی تمام تصنیفات گرفت اور مواخذہ سے باہر ہیں؛ چنانچہ ان کے ایک ناول 'بادوباراں' پر تبصرہ کرتے ہوئے مس حبیب اللہ خاں، لالہ موسیٰ اسٹیشن ایک خط میں ان کو لکھتی ہیں: 'بادوباراں' میں جنگلی قوم کی سردار عورت کا کردار کہانی کی پختگی میں کمی پیدا کرتا ہے، اگر اس کے بدلے میں منور کو کسی اور قسم کی تکلیف پہنچتی تو 'بادوباراں'، 'سوزدروں' سے بھی سبقت لے جاتا۔'' (پہلی کرن، ص415)

خلاصہ یہ کہ مولانا رشید اختر ندوی ایک اردو کے سچے خادم، ادیب، مؤرخ، قابل اور اچھے ناول نگار تھے؛ لیکن افسوس کہ ان کی ادبی خدمات کا جس طرح تعارف ہونا چاہیے، اس طرح تعارف نہیں پیش کیا جاسکا، وجہ خواہ کچھ بھی ہو (یوں بھی اپنی بعض تحریروں کی وجہ سے وہ معتوب ہوئے تھے؛ بلکہ ان پر مقدمہ بھی دائر کیا گیا تھا؛ لیکن قبل از وقت ضمانت مل گئی تھی)، اور نئی نسل تو شاید ہی ان کی ادبی خدمات سے واقف ہو، ان پر کام کرنے کی ضرورت ہے، اللہ کسی کو پیدا کرے، آمین!

جی چاہ رہا ہے کہ یہاں پر رشید اختر ندوی کے ناولوں کے نام بھی درج کردوں؛ تاکہ پڑھنے والے پڑھیں اور محظوظ ولطف اندوز ہوں، سیکھنے والے سیکھیں اور ادب حاصل کریں اور جائزہ لینے والے جائزہ لیں اور جانچیں پرکھیں اور ادبی دنیا میں ان کا جو مقام ومرتبہ ہونا چاہیے، ان کو وہ دلانے کی کوشش کریں، نام یہ ہیں: سازشکست، سوزدروں، سودائی، یروشلم، حیدرعلی، غرناطہ، یہ جہاں اور ہے، تشنگی، یلغار، نسرین، نشان راہ، کانٹوں کی سیج، تلخیاں، بادوباراں، نشیمن، گل رخ، ایک پہلی، پندرہ اگست، مردکوہستان، محمد بن ابی عامر، پہلی کرن، نسیم (ہرجائی)۔

■

Md Jamil Akhtar Jaleeli Nadwi
Vill + P,O: Pochari
Distt: Dhanbad - 828306 (Jharkhand)
Mob: 08292017888, 9576971884

جگر اور ان کی عشقیہ شاعری

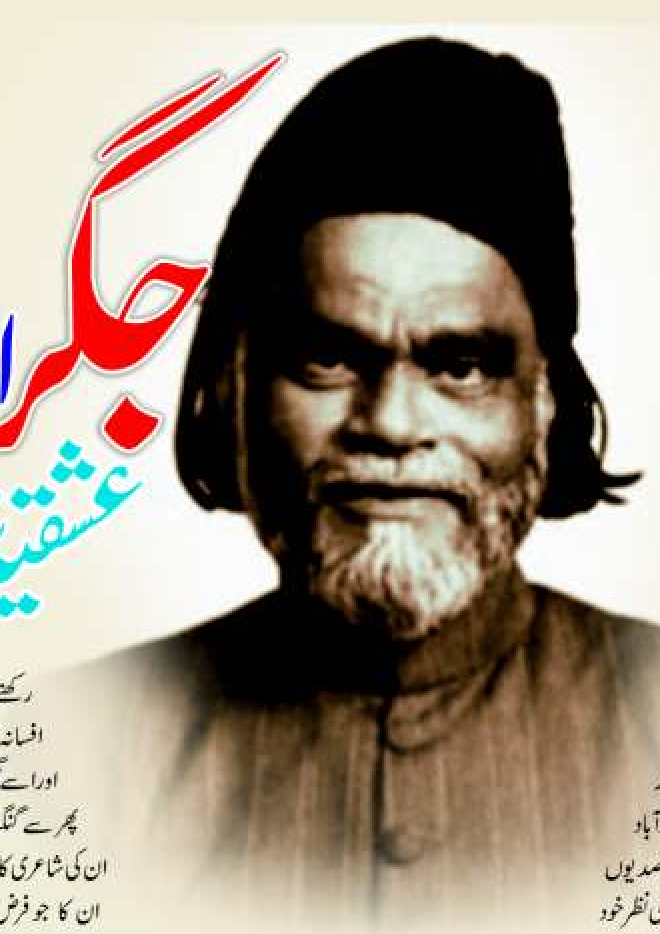

ندیم احمد

جگر مرادآبادی (6 اپریل 1890 - 9 ستمبر 1960) جدید اردو شعرا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کا اصل نام محمد علی سکندر تھا اور جگر تخلص کرتے تھے۔ جگر کی پیدائش 1890 کو مرادآباد کے ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو ادب کی شمع کئی صدیوں سے روشن کیے ہوئے تھا۔ ان کے والد مولوی علی نظر خود اچھے شاعر تھے۔ گھر کے اسی ادبی ماحول نے جگر کے ذہن کو شاعری کی طرف راغب کیا مگر یہ بھی عجب حقیقت ہے کہ وہ خاندانی ورثے کے تحت شاعر نہیں بنے بلکہ ان کے اندر کا شاعر ان کی اپنی فطرت اور بے ساختگی سے پر طبیعت کی وجہ سے وجود میں آیا۔ جگر زیادہ تعلیم تو نہ حاصل کر سکے۔ مگر زندگی سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ جگر نے شاعری کی ابتدا محض 13 برس کی عمر میں ہی کر دی تھی۔ پہلے والد صاحب سے اصلاح لیتے تھے پھر داغ کو استاد بنالیا۔ داغ کے انتقال کے بعد امیر اللہ تسلیم کی شاگردی اختیار کرلی کچھ عرصے بعد جب تسلیم کا بھی انتقال ہوگیا تو اصغر گونڈوی سے ترغیب حاصل کر کے شاعری کے معنوی پہلوؤں کی تلاش میں سرگرداں نظر آئے۔ اصغر گونڈوی سے ان کو بے حد عقیدت تھی۔ جذباتی لگاؤ کچھ اسی قدر تھا کہ جگر نے اپنی شریک حیات کو صرف اسی لیے طلاق دے دی تاکہ اصغر ان سے نکاح کر سکیں۔ اصغر کی موت کے بعد جگر نے دوبارہ اپنی پہلی بیوی سے نکاح کرلیا۔

جگر کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ وہ تلاش معاش میں اسٹیشنوں پر چشمے بیچا کرتے تھے۔ اس مشکل اور تکلیف دہ زندگی کے باوجود بھی جگر نے اپنے ذہن ودل کو مسرت وخوشی کے ساتھ کشادہ رکھا اور غم واندوہ کو اپنی شخصیت پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ ہمیشہ خوش دلی، انکساری اور خوش جمعی کے ساتھ لوگوں سے پیش آتے رہے اور اپنی محسنی کے باعث دوستوں کے درمیان گفتگو کا ہمیشہ مرکز بنے رہے۔ ان تمام اچھائیوں کے باوجود ان میں مے کشی کی بری لت بھی تھی، وہ اکثر نشے میں اپنا آپا تک کھو بیٹھتے تھے۔ اسی شراب نوشی کی وجہ سے ان کی زوجہ نے ان سے ترک تعلق تک کر ڈالا تھا۔ ان کی شاعری میں شراب نوشی اور اس کے نشے کا عکس جا بجا نظر آتا ہے۔

مجھے اٹھانے کو آیا ہے واعظ ناداں
جو اٹھ سکے تو مرا ساغر شراب اٹھا
کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں، تو اپنی کتاب اٹھا

جگر کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ داغ جگر 1921 شعلہ تر 1923 اور آتش گل 1958۔ آتش گل کے لیے انھیں 1959 میں ساہتیہ اکادمی دہلی نے انعام سے نوازا تھا۔

جگر مرادآبادی دور جدید کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے اردو غزل کی روایت کو نئی بلندی عطا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اردو غزل پر اس زمانے میں ہو رہی تنقید سے بے فکر جگر نے غزل کو اپنا شیوہ شاعری بنایا اور یہ جگر کا ہی کمال ہے کہ انھوں نے غزل کے معنی کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کی مقبولیت کو برقرار رکھنے یا پھر اضافہ کرنے کی غرض سے افسانہ محبت کو ہی اپنی غزلوں میں ترجیح دی اور اسے گلی کوچوں میں عوام الناس کے ذریعہ پھر سے گنگنانے کو مجبور کر دیا۔ وہ خود کہتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مقصد 'پیغام محبت' ہے۔

ان کا جو فرض ہے ارباب سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جگر کی غزلیں اپنے حقیقی معنوں میں محبت کی گفتگو ہی ہیں۔ ان میں محبت کے رنگ وڈھنگ اور جذبات واحساسات کو کچھ اس طور سے سمیٹا گیا ہے کہ ان کے مطالعے کے بعد کوئی بھی شخص محبت کی حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے اور جس کا دل اس محبت کی وجہ سے ٹوٹ چکا ہے اسے ایک ایسا زاویہ نظر بھی مل سکتا ہے کہ بہت جلد اس کے دل کو قرار پہنچا سکے۔ جگر نے محبت کی ہر کیفیت کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے وہ محبوب ومعشوق کی ہر فطرت سے واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کو پڑھ کر ہر عاشق کو یہ اپنا ہی قصہ معلوم ہوتا ہے۔

جگر کو یہ کامیابی اس لیے حاصل ہوئی کہ وہ عشق کے ہر نفسیاتی پہلو سے آشنائی رکھتے ہیں اور اپنے پاک ارادوں کے زیر نظر انھوں نے عشق کو بھی پاکباز بنادیا ہے۔ اسی امر کے ضمن میں وہ عشق کی عظمت میں چار چاند لگاتے ہوئے اس کے تمام راستوں کو بھی روشن کر دینے کے قائل ہیں۔

آگے قدم بڑھائیں جنھیں سوجھتا نہیں
روشن چراغ راہ کیے جا رہا ہوں میں

جگر کی غزلوں میں عشق کے گرفتار وپرستار لوگوں کی کیفیت، الجھنیں، دشواریاں اور پریشانیاں کھل کر عیاں ہوتی ہیں مگر جگر ان سے بچنے، ڈرنے، یا گھبرانے کی نصیحت نہیں دیتے بلکہ وہ حوصلے اور نئی امید کے ساتھ عشق

کے دامن کو تھام کر محبوب کو حاصل کر لینے کی حکایت پیش کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا محور ویسے تو صرف عشق ہے مگر ان کے بیان کردہ عشق سے جڑے موضوعات، معاملات کبھی بھی قاری کو گراں نہیں گزرتے بلکہ اسے عشق کرنے اور عشق سے لطف اندوز ہونے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

کوئی حد نہیں محبت کی فسانے کی
سناتا جا رہا ہے جی کو جتنا یاد ہوتا ہے
ہے انھیں دھوکوں سے دل کی زندگی
جو حسیں دھوکا ہو کھانا چاہیے
ان سے ملنے کو تو کیا کہیے جگر
خود سے ملنے کو تو زمانہ چاہیے
دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی فنا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد
محبت میں کیا کیا مقام آ رہے ہیں
کہ منزل پہ ہیں اور چلے جا رہے ہیں
یہ کہہ کہہ کے ہم دل کو بہلا رہے ہیں
وہ اب چل چکے ہیں وہ اب آ رہے ہیں
تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں
ہاں، مجھی کو خراب ہونا تھا

جگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتے کہ محبت درد، بے چینی دینے والی شے ہے۔

وہ دل سے یوں گزرتے ہیں آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں پہچانی نہیں جاتی
محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

جگر عشق میں دل کے لٹ جانے کا بیان ایک حسین واقعے سے کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی عشق میں لٹ جانے کی صلاح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق میں لٹ جانے کا کچھ اور ہی مزا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

نظر ملا کے میرے پاس آ کے لوٹ لیا
نظر ہٹی تھی کہ پھر مسکرا کے لوٹ لیا
بڑے وہ آئے دل وجاں کے لوٹنے والے
نظر سے چھیڑ دیا گدگدا کے لوٹ لیا

دوسری طرف جگر لوگوں کو آگاہ بھی کرتے ہیں کہ عشق کرنا ایک پیچیدہ عمل ہے۔ جس میں لوگ برباد ہو جاتے ہیں مگر اسے آسان سمجھنے کی غلطی بھی لوگ اکثر کیا کرتے ہیں۔

اک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے
یہ عشق نہیں ہے آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جگر کے نزدیک عشق مسرت حاصل کرنے کی شے نہیں ہے بلکہ سب کچھ گنوا دینے کا نام ہی عشق ہے۔ عشق میں فائدہ تلاش کرنا نا مناسب ہے عشق میں محرومی، مجبوری اور ناکامی کا عنصر بکثرت موجود ہوتا ہے اور بیشتر لوگوں کو یہی میسر بھی آتا ہے مگر ان مشکلات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود لکھتے ہیں۔

مر کے بھی کب تک نگاہِ شوق کو رسوا کریں
زندگی تم کو کہاں پھینک آئیں، آخر کیا کریں؟
ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو، ہم کیا کریں

جگر کے اندر کا شاعر انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ منزل جاناں کے خلاف اپنے قدم روک لیں۔ بلکہ وہ انھیں آگے بڑھنے کی ہمیشہ ترغیب دیتا ہے۔ چاہے اس کے لیے انھیں اپنی جان ہی کیوں نہ دے دینی پڑے۔

پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزل جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھ کو ہوش نہیں
کبھی ان مدبھری آنکھوں سے پیا تھا اک جام
آج تک ہوش نہیں، ہوش نہیں، ہوش نہیں

جگر کے چند اشعار زندگی کی تلخ حقائق کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں جن سے ہمیں سماجی آگہی کے برطرف زندگی بسر کرنے اور عمل کرنے کی ترغیب ملتی ہے اور کہیں کہیں تو ان کا انداز فلسفیانہ بھی ہو جاتا ہے۔

زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ
موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ نہیں ہوتا

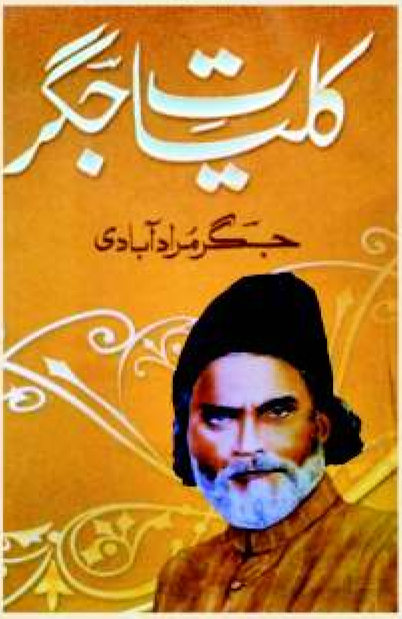

ورنہ کیا تھا، صرف ترکیبِ عناصر کے سوا
خاص کچھ بیتا بیوں کا نام انساں ہو گیا
ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
زمانہ خود ہم سے ہے، زمانے سے ہم نہیں
آدمی کے پاس سب کچھ ہے جگر
ایک تنہا آدمیت کے سوا

حالانکہ جگر نے اپنی غزلوں میں مروجہ تراکیب واستعارات کا ہی استعمال کیا ہے مگر ان کی انفرادیت کو مسلّم کرنے والی شے ان کی بے باکانہ اور بے ساختانہ انداز ہے۔ وہ قدیم روایتوں کے پاسدار رہے مگر انھوں نے ان روایتوں کو سمیٹ کر اپنی ذہنی، کاوش جداگانہ انداز اور اپنے واضح نقطہ نظر کی بنا پر اردو غزل کو اور بھی مقبول بنانے کی سمت پیش رفت کی۔

جگر کی غزلوں پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں سماجی بیداری کے عناصر بہت کم ہیں مگر پھر بھی جگر کی شاعری میں کچھ نہ کچھ تو ایسا ہے کہ بقول فراق ''جگر سے زیادہ مقبول اردو شاعر اس صدی میں کوئی نہ ہوا۔'' جگر نے صرف معاملاتِ عشق کو ہی اپنی غزلوں کا محور بنایا مگر تغزل اور ترنم کی فراوانی سے وہ صنفِ غزل گوئی کو معراجِ کمال تک پہنچانے میں کامیاب رہے ساتھ ہی انھوں نے غزل کی قدیم روایت کے چراغ کو بھی دوبارہ روشن کیا جس کی روشنی 19 ویں اور 20 ویں صدی میں اس پر عائد ہونے والے الزامات وطنزیات کی بنا پر کہیں مدھم ہو گئی تھی۔ آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جگر کی غزلیں عشقیہ جذبات سے لبریز وہ گوہر پارے ہیں جن کی موسیقیت اور آہنگ پر اردو شاعری کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ انھوں نے قدیم وجدید شاعری کا ایک ایسا حسین امتزاج پیدا کیا ہے جس میں مضامین کا تنوع تو نہیں ہے مگر شائستگی، شگفتگی، نغمگی اور تازہ کاری کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ جگر کا والہانہ انداز ان کی شاعری کو کمزور نہیں بناتا بلکہ اسے اور توانائی بخشتا ہے۔ جگر کی غزلوں کی بے ساختگی اور بے باکی اس امر کی دلیل ہے کہ جگر نے اپنے جگر کی بات کو ہی الفاظ کا جامہ منفرد انداز میں پہنایا جو ان کی شاعری کا جزوِ اعظم ہے جس کی چمک ہمیشہ قائم رہے گی اور ان کی شاعری میں نمایاں رندی، سرمستی وشادابی ہمیں ہمیشہ جگر کی غزلوں کو پڑھنے اور انھیں سمجھنے کے لیے مجبور کرتی رہے گی۔

■

Dr. Nadeem Ahmed
C-36/5, Lane No-2, R.K.Marg, Chauhan Banger
Delhi-110053
Mob.9136162160
Email: nadeemahmad_126@yahoo.co.in

راحت اندوری

منفرد لہجے کا شاعر

محمد نوشاد عالم

اردو شعروادب اور خاص کر مشاعروں کی دنیا میں راحت اندوری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اردو غزل کے مشہور ومعروف شاعر ہیں اور گذشتہ پچاس سالوں میں انھوں نے اردو شعروادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

شیخ راحت اللہ اندوری بہ معروف راحت اندوری یکم جنوری 1950 کو شہر اندور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد اودھ یونیورسٹی لکھنؤ سے ایم اے (اردو) امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ تحقیق کے لیے برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال کو منتخب کیا، اور 'اردو کی ترویج واشاعت میں مشاعروں کا حصہ' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اسلامیہ کریمیہ کالج (آئی کے) کے شعبۂ اردو سے منسلک ہوگئے، اور بحیثیت اردو لکچرر ملازمت کی ابتدا کی اور درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے رہے، لیکن بعض مصروفیات کی وجہ سے ملازمت ترک کرنی پڑی۔

راحت اندوری کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے شاعری کی ابتدا کی۔ چونکہ شہر اندور میں مشاعروں اور محافل کا رواج بہت قدیم ہے، لہٰذا راحت اندوری بھی رفتہ رفتہ نشستوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے، اور پہلی بار 1968 میں انھوں نے ایک مشاعرے میں اپنی غزل پڑھی، جسے کافی پسند کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا، دور حاضر میں وہ ایک عالمی شہرت یافتہ شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اب تک ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آکر داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے مجموعوں میں دھوپ دھوپ، ناراض، رُت (دیوناگری)، سفر میں رہے، میرے بعد (دیوناگری)، پانچواں درویش اور 'گن فیکون' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

راحت اندوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا کی طرح زندگی کی تلخیوں، کربناکیوں اور عصری مسائل جیسے موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں سماج میں پھیلی ناانصافی، انسانی رشتوں کی ناقدری، زندگی کی بے ثباتی، فسادات وغیرہ جیسے مسائل نظر آتے ہیں۔ دوسرے شعرا کی بہ نسبت راحت اندوری کا لب ولہجہ زیادہ باغیانہ نظر آتا ہے۔ زبان میں نشتریت اور کھرا پن ہے، جس کی وجہ سے ان کے اشعار ہمارے دلوں میں نشتر بن کر پیوست ہوجاتے ہیں۔

راحت اندوری کی شاعری دراصل معاشرے میں ہورہی ناانصافیوں، زندگی کی تلخیوں، بے یقینی، خوف وہراس اور فسادات وغیرہ کا منظرنامہ ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کو قاری کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری اسے اپنا ہی تجربہ ومشاہدہ سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وہ ساری خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے راحت اندوری کی غزلیں عوامی سطح سے لے کر علمی وادبی حلقوں میں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

کالج کے سب لڑکے چپ ہیں کاغذ کی اک ناؤ لیے
چاروں طرف دریا کی صورت پھیلی ہوئی ہے بے کاری

خریدے ہیں مرے بچوں نے فاقے
میں سڑکوں پر مقدر بیچتا ہوں

ڈاکٹر شہپر رسول ان کی شاعری کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''وہ جب اقدار کی شکست وریخت، زندگی کے مصنوعی پن، تہذیب کے تنزل، طنز وتشکیک اور نارسائی یعنی آج کے عہد کے منظرنامے کو اپنی غزل کا منظرنامہ بناتے ہیں تو آئینہ، پتھر، پیاس، سمندر، روشنی اور تاریکی جیسے الفاظ ان کی شاعری کی کلید بن جاتے ہیں۔ اس طرح زیست کی نہ صرف مختلف سطحیں اور سمتیں سامنے آتی ہیں، بلکہ انسانی تہذیب معیاروں میں سمائے ہوئے تضاد کی معنی خیز پردہ دری بھی ہوئی ہے۔''

راحت اندوری کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی ان سچائیوں، حقیقتوں، تصادمات، واقعات وحالات اور کشمکش کو پیش کرتے ہیں، جو لوگ اپنی مفاد کے لیے دوسروں کی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔ ان کی غزلوں میں پوری انسانیت کا درد چھپا ہوا ہے۔

یہ بوڑھی قبر تمھیں کچھ نہیں بتائے گی
مجھے تلاش کرو دوستو یہیں ہوں میں

محبتوں کا سبق دے رہا ہے دنیا کو
جو عید اپنے سگے بھائی سے نہیں ملتا

راحت اندوری کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہیں جو قاری وسامع کے ذہن ودل، فہم وادراک کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں، اور انھیں سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں حق وباطل کا تصادم بھی ہے اور فرسودہ رسم ورواج سے انحراف بھی۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا مزاج، آہنگ اور لب ولہجہ عطا کیا ہے، جو پوری

طرح ان کا اپنا ہے۔انھوں نے غزل کو محدود دائروں سے نکال کر وسیع تر امکانات سے روشناس کرایا۔وہ ماحول اور انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ ومشاہدہ رکھتے ہیں۔

خبر نہیں کہ ہوا کس طرف اڑا لے جائے
ہماری نسل بکھرتا ہوا برادہ ہے

شاخ پر جتنے تھے پھل کوئی چرا کرلے گیا
اور ہم اخلاق کے پابند گنتے رہ گئے

بکھر گیا ہوں میں املی کی پتیوں کی طرح
اب اور لے کے کہاں تک غرور جائے گا

راحت اندوری اپنی شاعری کے ذریعے وہ سارے نقوش ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں ان کا عہد کروٹیں لیتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں عہد حاضر کے قوم کی صورت حال کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے،اور اس قوم کی ذلت وخواری اور پستی کے اسباب وعوامل کی نشاندہی اپنی شاعری کے ذریعے بخوبی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جس نے تہذیب کی شکست وریخت کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہو،ان کے یہاں ماضی کی نوحہ گیری نہیں بلکہ ماضی کو سمجھنے کی بصیرت ملتی ہے۔

بے حسی، مردہ دلی، رقص، شرابیں، نغمے
بس انھیں راہوں سے قوموں پہ زوال آتے ہیں

طاق میں بیٹھا ہوا بوڑھا کبوتر رو دیا
جس میں ڈیرا تھا اسی مسجد میں تالے پڑ گئے

یہی پرانے کھنڈر ہیں ہماری تہذیبیں
یہیں پہ بوڑھے کبوتر ہیں اور یہیں شہباز

راحت اندوری دور حاضر کے مشاعروں کے بے حد مقبول اور کامیاب شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل،عہد حاضر کے سیاسی وسماجی حالات اور عام آدمی کے دکھ درد کی ترجمانی ملتی ہے۔انھوں نے سماج کی بے حسی کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے کلام میں طنز کی سبک رولہریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا لہجہ تیکھا ہے،جبکہ ان کے شعری مزاج میں صاف گوئی، بے خوفی اور بے باکی پائی جاتی ہے،جو ایک سچے فن کار کی پہچان ہوتی ہے۔

میرے احباب کو جس وقت بھی فرصت ہوگی
اور تو کچھ نہیں ہوگا،مری غیبت ہوگی

بیٹھے ہوئے ہیں قیمتی صوفوں پر بھیڑیے
جنگل کے لوگ شہر میں آباد ہوگئے

جنگ میں کاغذی افراد سے کیا ہوتا ہے
ہمتیں لڑتی ہیں تعداد سے کیا ہوتا ہے

راحت اندوری کی شاعری کی زبان عام فہم اور سلیس ہے۔محاورے کا استعمال جابہ جا نظر آتا ہے۔انھوں نے عوام وخواص دونوں کے معیار کو سامنے رکھ کر اشعار کہے ہیں۔ زبان وبیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ اس میں پرکاری کا عنصر بھی موجود ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قومی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے ہر اہم واقعات وحادثات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔بحیثیت ایک مصور،فن کار،شاعر،نغمہ نگار،دانشور اور مفکر وہ اپنی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ان کی شاعری تجربات ومشاہدات کی سنگلاخ وادیوں سے ہوکر گزرتی ہے۔

شام ہوتی ہے تو پلکوں پہ سجاتا ہے مجھے
وہ چراغوں کی طرح اور جلاتا ہے مجھے

روایتوں کی صفیں توڑ کر بڑھو ورنہ
جو تم سے آگے ہیں وہ راستہ نہیں دیں گے

میں اپنی لاش لیے پھر رہا ہوں کاندھے پہ
یہاں زمین کی قیمت بہت زیادہ ہے

انھوں نے کم وبیش ہر صنف سخن میں کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی،لیکن بحیثیت غزل گو شاعر کے ان کو امتیاز حاصل ہے۔ دور حاضر کی نئی غزل میں ان کی شاعری کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔انھوں نے لہجے کی نئی سمت اور فکر کے اچھوتے زاویے کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

پرانے داؤں پر ہر دن نئے آنسو لگاتا ہے
وہ اب بھی اک پھٹے رومال پر خوشبو لگاتا ہے

میں کالی رات کے تیزاب سے سورج بناتا ہوں
میری چادر میں یہ پیوند اک جگنو لگاتا ہے

مجھے زمین کی گہرائیوں نے داب لیا
میں چاہتا تھا مرے سر پہ آسمان رہے

راحت اندوری نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر شاعری میں تجریدی آرٹ کے نمونے پیش کیے ہیں۔انھوں نے غزل کے مروجہ اصطلاحوں،تلمیحات اور استعاروں سے گریز کیا ہے۔ان کی انفرادیت ان کی امیجری ہے،وہ لفظوں کے ذریعے اس طرح تصویر کھینچتے ہیں کہ اس کا عکس دکھائی دینے لگتا ہے۔

فرشتے رنگ برساتے ہیں،موسم رقص کرتے ہیں
جب اڑتے بادلوں میں ہم تیری صورت بناتے ہیں

روز تاروں کو نمائش میں خلل پڑتا ہے
چاند پاگل ہے اندھیرے میں نکل پڑتا ہے

راحت اندوری نے اپنی شاعری میں 'سورج' اور 'پرندہ' کو ایک استعارہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ان کے مجموعۂ کلام میں ایسے سیکڑوں اشعار مل جائیں گے،جن میں سورج اور پرندہ بحیثیت استعارہ پیش کیا گیا ہے۔یہ دونوں استعارے معنی خیز ہیں۔سورج روشنی کا استعارہ ہے،جبکہ پرندہ پرواز کی علامت ہے۔ان کی شاعری میں سورج کہیں قدرت خداوندی کا استعارہ بنتا ہے،تو کہیں راحت اندوری کی جدوجہد بھری زندگی کا استعارہ بنتا ہے،تو کہیں انگریزی قوم کے لیے استعمال ہوا ہے،تو کہیں تہذیبوں کے نشیب وفراز اور قوموں کے عروج وزوال کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔اشعار دیکھیں۔

دھوپ اور چھاؤں کے مالک مرے بوڑھے سورج
میرے سائے کو مرے قد کے برابر کردے

ابھی سورج صدا دے کر گیا ہے
خدا کے واسطے بیدار ہوجا

پھول جیسے مخملیں تلوؤں میں چھالے پڑ گئے
گورے سورج نے ہزاروں جسم کالے کردیے

کئی دن سے نہیں ڈوبا یہ سورج
ہتھیلی پر مری چھالا پڑا ہے

اپنی تعبیر کے چکر میں میرا جاگتا خواب
اور سورج کی طرح گھر سے نکل پڑتا ہے

مختصر طور پر کہہ سکتے ہیں کہ راحت اندوری کا شمار دور حاضر کے ان مشہور ومعروف شعرا میں ہوتا ہے،جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے پوری اردو دنیا پر حکومت کی ہے۔ وہ ایک بے باک اور نڈر شاعر ہیں اور انھوں نے زندگی میں کوئی سمجھوتہ نہیں سیکھا۔انھوں نے اپنی شاعری میں سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کی شاعری میں روایت کا احترام، ترقی پسند اور جدید میلانات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ راحت اندوری نے غزل کی فکری سوچ کو جس سیدھے سادے،منفرد اور پروقار انداز سے پیش کیا ہے،اسے دور حاضر کا آئینہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

■

Mohd. Naushad Alam
Naional Translation Mission
Central Institute of Indian languages,
Manasgangotry, Hunsur Road

عابد پشاوری کی غزل گوئی

محمد رفیع

اردو ادب کی دنیا میں وقتاً فوقتاً ایسی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے اپنی علمی صلاحیت اور فنی بصیرت کے طفیل اپنے اکابرین سے بھی اپنے فن کا لوہا منوایا۔ ان ہی ہستیوں میں سے ایک ہستی کا نام ہے 'عابد پشاوری' جن کا اصلی نام 'شیام لال کالڑا' ہے لیکن ادبی حلقوں میں اپنے قلمی نام 'عابد پشاوری' کے نام سے ہی مقبول و معروف ہیں۔

عابد پشاوری 22 دسمبر 1937 کو مغربی پاکستان کے صوبہ سرحد یعنی پشاور کے قصبہ ڈیرہ اسماعیل خان کے مقام پر ایشور داس کالڑا کے گھر پیدا ہوئے۔ اور ان کی وفات 26 جنوری 1999 کو جموں میں ہوئی۔ عابد پشاوری ایسی شخصیت کا نام ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں اردو ادب میں انھیں اہم مقام حاصل ہے۔ ادب میں ان کی شہرت ان کی تحقیقی خدمات کے سبب ہے۔ 'تحقیق' ان کا خاص میدان رہا ہے، ان کا تعلق محققین کی اس نسل سے رہا ہے جو ہماری دانش گاہوں سے وابستہ رہے ہیں۔ تحقیق کے میدان میں بہت ہی قلیل عرصے میں انھوں نے اپنے لیے ایک الگ مقام محفوظ کرلیا، اپنی تحقیقی صلاحیت کو بروئے کار لاکر ادبی تحقیق میں انھوں نے کئی اہم اضافے کیے اور اپنی تحقیقی کاوشوں سے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ ان کی زیادہ تر نثری تصانیف کلاسکی ادب کے تحقیقی زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔ اردو تحقیق کو انھوں نے ایک معیار اور ایک وقار عطا کیا جسے اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ تحقیق کے میدان میں جہاں انھیں ابدی حیات ملی وہیں دوسری طرف ان کی شخصیت کے کئی پہلو توجہ کے محتاج ہی نظر آتے ہیں جن میں ان کا 'بحیثیت شاعر ہونا' سرفہرست ہے۔

عابد بنیادی طور پر ایک شاعر ہی تھے اور ادب سے ان کی دلچسپی کا باعث ان کی شاعری ہی تھی کیونکہ تحقیقی میدان میں قدم رکھنے سے قبل عابد پشاوری نے شاعری میں ہی طبع آزمائی کی تھی اور وافر مقدار میں اپنا کلام بھی یادگار چھوڑا تھا لیکن بحیثیت شاعر ان کی شخصیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی کہ جس کے عابد حقدار تھے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

اول تو یہ کہ عابد پشاوری کی ادب میں شہرت ان کی تحقیقی کاوشوں کے طفیل پروان چڑھی۔ جب انہوں نے سنہ 1962 میں تحقیق کے میدان میں قدم رکھا تو اپنی محنت، لگن اور دلجوئی سے اپنے تحقیقی کام میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ تحقیق کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور پھر ان کی تحقیق سے جو نتائج برآمد ہوئے ان سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے اور یوں ان کی شناخت بطور محقق ہی زیادہ نمایاں رہی جس کی وجہ سے ان کی شعری خدمات ان کی تحقیقی خدمات کے نیچے دب سی گئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ ادبی دنیا میں بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ عابد پشاوری شاعر بھی تھے۔ دوم یہ کہ عابد پشاوری کا کلام پہلے پہل ماہنامہ تخلیق، صدا بہار، روزنامہ ہند سماچار، نوائے ادب ممبئی، شاعر ممبئی میں چھپتا تو ضرور تھا لیکن بہت ہی کم مقدار میں چھپتا تھا۔ جس کی حیثیت نا کے برابر ہوتی تھی۔ یعنی کہ ان کا کلام بروقت چھپتا نہیں تھا۔ سوم یہ کہ ان کا کلام ان کی حیات میں منظر عام پر نہ آسکا اور اردو دنیا ایک لمبے عرصے تک ایک ایسے شاعر سے ناآشنا رہی جس کی شاعری میں میر جیسے قدآور شاعر کی سادہ کلامی، شیریں بیانی، روانی، شگفتگی اور جدت ادا کی گونج سنائی دیتی ہے۔ چہارم یہ کہ عابد کی طبیعت میں لاابالی پن تھا۔ شہرت کی انھیں بھوک نہیں تھی۔ گمنام رہنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ اپنی شاعری کی واہ واہ سے انھیں کوئی غرض نہیں تھی۔ محض دل کے غبار کو کم کرنے کے لیے غموں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے عابد گاہے گاہے شاعری کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عابد کہتے ہیں۔

کبھی الہام ہوتا ہے تو عابد شعر کہتا ہوں
نہیں تو مدتوں ہاں مدتوں خاموش رہتا ہوں

لیکن افسوس کہ ان کی شاعری کو وہ پذیرائی حاصل نہ ہوسکی جس کی کہ وہ حقدار تھی۔ راقم نے دوران تحقیق بسیار تلاش کے بعد انیس ایسے مضامین حاصل کیے جو عابد پشاوری کی شخصیت اور فن کو محیط ہیں۔ ان مضامین میں سے صرف سات مضامین ایسے ہیں جن میں سرسری طور پر عابد پشاوری کی شاعرانہ خدمات کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں جن کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ واقعی بحیثیت شاعر عابد پشاوری کی شخصیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔

اب جب کہ ان کا کلام کلیات کی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے اور شائد اب وہ وقت دور نہیں کہ جب ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا جائے گا اور ان کی یہ پیشن گوئی سچ ثابت ہوگی۔

نشاں ہوگا کلام جاوداں جب ہم نہیں ہوں گے
ہماری بات تو ہوگی یہاں جب ہم نہیں ہوں گے

(اختر جمیل، کلیات عابد پشاوری حصہ اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2015، ص 133)

عابد پشاوری کی شاعری تجربات و مشاہدات کی منزل سے گذر کر صفحۂ قرطاس کی زینت بنتی ہے۔ ان کی شاعری ان کے دل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی ہی زبانی۔

ایک ایک شعر حاصل صد تجربات ہے
میں جو بھی کہہ رہا ہوں میرے دل کی بات ہے

عابد پشاوری کی شاعری میں ہمیں ایک مخصوص سادگی نظر آتی ہے۔ ان کی شعری تراکیب اتنی سیدھی سادی ہوتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آسان اور کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی جس کا احساس انھیں خود بھی تھا۔ چنانچہ عابد گویا ہیں۔

''شعر کہیں گے سیدھے سادے
سیدھی سادی بات کریں گے''

عابد پشاوری نے مختلف النوع اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جس میں غزل، نظم، دوہا، قطعہ، رباعی وغیرہ شامل ہیں۔ جہاں تک ان کی غزل گوئی کا تعلق ہے تو جب ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ابتدا سے آخر تک عابد نے غزل ہی کہی ہے۔

جب ہم عابد کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ عابد پشاوری کی غزلیہ شاعری پر قدیم شعرا کا خاصا اثر ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری کلاسکی رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ زبان و بیان کی حد تک بھی عابد کلاسکی شعرا کے ہی پیرو نظر آتے ہیں۔ جن میں میر، غالب، مومن، داغ، امیر وغیرہ کی طرز خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ ان کی غزلوں میں میر کا سوز و گداز، شیرینی، روانی و شگفتگی، اور مومن کی طرز ادا کا پرتو واضح طور پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ عابد کے نزدیک شاعری کے لیے شرط بھی کچھ اسی قبیل کی ہے۔

فکر مومن گداز میر تقی
شرط ہے شعر و شاعری کے لیے

عابد کے طرز بیان کا رنگ دہلوی ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

ہیں وطن سے تو پشاوری ہم
دہلوی ہیں ہم اپنے بیان سے

روایتی غزل کی پاسداری کے ساتھ ساتھ ان کی غزل میں داخلیت کا عنصر بھی غالب نظر آتا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں عشق ہے، محبت ہے، حسن ہے، درد و کرب ہے گویا کہ ان کی غزلیہ شاعری میں وہ تمام جواہر موجود ہیں جن سے اردو کی کلاسکی غزل گوئی کی روایت عبارت ہے اور عابد کی غزلیہ شاعری میں میر کی شاعری کی طرز کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

عابد پشاوری کی غزلیہ شاعری سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے میر کے سوز و گداز کو، شیریں بیانی اور سلاست و روانی کو اپنی غزلیہ شاعری میں پیش کرنے کی ایک شعوری کوشش کی ہے جس میں عابد پشاوری کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی غزلیہ شاعری ہر دل عزیز معلوم ہوتی ہے چنانچہ عابد گویا ہیں۔

''ذرا عنوان بدل کر سب وہی افسانہ کہتے ہیں
ہر اک لب پر ہماری داستان معلوم ہوتی ہے''

عابد پشاوری بھی اپنے رنگ خاص سے خوب واقف تھے۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ واقعی عابد نے میر کی طرز پر شاعری کی ہے اور اس طرز کو پانا بھی ہر کسی کے بس کا کام نہیں تھا۔ لہٰذا عابد پشاوری اس طرز خاص پر نازاں معلوم ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو اپنے وقت کا میر گردانتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں اپنے وقت کا ہوں میر اے عابد خدا شاہد
بہت مجبور ہو کر دل سے کی ہے شاعری میں نے''

''مجھے بھی میر ہی سمجھو گے اے عابد
اگر میں چھوڑ گیا اپنے بعد کلام اپنا''

درج بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عابد پشاوری نے میر کے رنگ شاعری سے اپنی غزلیہ شاعری کو مزین کیا ہے اور واقعی میر کا سا حزن و ملال، غم و اندوہ، دل زدگی، دل گرفتگی، مایوسی و ناامیدی، یاسیت، درد و کرب، ان کی غزلوں کے شعری آہنگ میں گھل کر نمایاں ہوتا ہے اور ان کے اشعار دل و ذہن کی دنیا میں ایک محشر برپا کر دیتے ہیں اور یوں عابد اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔

عابد پشاوری کے ہاں ہمیں میر، غالب، مومن، جگر، امیر وغیرہ قد آور شعرا کی زمینوں میں بھی غزلیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جا رہی ہے جو غالب کی زمین میں ہے۔

''دیکھنا عمر گذر جائے نہ بے کاریوں ہی
مشکلیں کتنی ہی دیکھی ہیں بشر ہونے تک''

عابد کی غزلوں میں مومن کی سی نازک بیانی، مضمون آفرینی اور چھوٹی چھوٹی بحروں کا استعمال بھی ملتا ہے اور عابد نے مومن کی طرز پر ہی اپنے تخلص کو بھی معنی کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں اس قبیل کے چند اشعار

''ہو تو مشغول عبادت ہمہ تن اے عابد
زادِ راہ کر لے بہم حکم سفر ہونے تک''

''سب دکھاوے فضول ہیں عابد
دل میں چپکے سے بندگی کر لی''

عابد نے اپنی غزلیات سے ایک منفرد لہجے، مخصوص اسلوب، طرز فکر، لفظوں کے انتخاب کی وجہ سے اور غزل کو ایک ایسی جہت عطا کی کہ ان کی غزلیہ شاعری میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری ہو رہی ہے یا نثر نگاری اور یہی وہ چیز بھی ہے جو انھیں ممتاز حیثیت بھی بخشتی ہے اور انھیں بھی اس طرز خاص پر بڑا ناز تھا چنانچہ عابد کہہ اٹھتے ہیں

''میرے اشعار بھی ہیں نثر جیسے
یہ طرز آساں بھی دشوار بھی ہے''

عابد کی غزلیں مشکل تشبیہات و استعارات، اور مشکل الفاظ و محاورات سے پاک معلوم ہوتی ہیں۔ الفاظ کے انتخاب، نشست و برخاست میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں عام بول چال کی زبان کا استعمال ملتا ہے اور عابد نے تمام شعری وسائل کا سہارا لے کر اپنی اس طرز خاص کو واقعی پرکشش بنا دیا ہے۔ مضمون آفرینی، غور و فکر کے انداز، اور نازک خیالی نے بھی ان کی غزل کو ایک نکھار بخشا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں اگرچہ غنائیت کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں غنائیت ہے جو روح میں ایک تازگی کا احساس بھی بخشتی ہیں۔

عابد کی غزلیہ شاعری کے موضوعات وہی ہیں جو روایتی غزل کا طواف کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن عابد کے ساتھ خاص بات یہ ہے کہ عابد ان میں تاثر کی خوبی پیدا کر دیتے ہیں۔ جن سے ایک تازگی کا احساس بھی نمایاں ہوتا ہے۔

اردو غزل میں احترام آدمیت، انسانیت اور محبت و ہمدردی، الفت و خلوص و وفا شعاری، آپسی بھائی چارگی، امن آشتی کا درس ضرور ملتا ہے اور جنگ و جدل، بغض و عناد، انسان دشمنی کے خلاف نفرت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ عابد پشاوری نے بھی اپنی غزلوں میں کچھ اس طرح کے مضامین کو بیان کیا ہے۔ جن سے احترام آدمیت، امن و آشتی، محبت و ہمدردی کی خوشبو آتی ہے۔ ملاحظہ ہو چند اشعار

کب فرشتوں کو پیار ہے حاصل
آدمی کے نصیب کیا کہیے

عابد جو ہوں تو ہوں میں پرستار آدمی
بت گر کا آشنا ہوں نہ ہوں بت شکن کے ساتھ

عابد نے اپنی غزلیہ شاعری میں وہی کیفیات بیان کی ہیں جو کچھ ان کے دل پر گزری ہیں۔ اسی کو داخلیت بھی کہتے ہیں اور عابد اپنی روداد غم روتے روتے کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

ہوئی ختم عمر دوراں روتے روتے
بیاں ہو گئی داستاں روتے روتے
چلے مجھ سے جس دم وہ دامن چھڑا کر
میری بندھ گئیں ہچکیاں روتے روتے
ابھی تک نہیں آپ کا دل بھرا کیا
زمانہ ہوا مہرباں روتے روتے

عابد کی غزلیہ شاعری میں یہ خوبی ہے کہ یہ دل میں اتر جاتی ہے۔ انھوں نے اردو شعر و ادب کو ایک پہچان دی اور آج عابد پشاوری اردو شعر و ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ سلاست اور روانی کی وجہ سے ان کی غزلیں بہت جلدی دل کو بھا جاتی ہیں۔

ان کی غزلوں میں رومانیت بھی ہے، انسانی ذہن کی بہترین عکاسی بھی، درد و کرب بھی ہے، انسانی جذبات و احساسات کے ہمراہ، سوچ اور فکر کی خوبصورت عکاسی بھی ہے، رفاقت و قربت بھی ہے، فرقت و جدائی بھی ہے اور حسین واقع نگاری بھی ہے۔

تشبیہات و استعارات کا بھی موزوں استعمال ان کی غزلوں میں ملتا ہے، ان کی غزلیں فنی خوبیوں سے بھی مالا مال ہیں کہ جن میں روانی اور سلاست کی چاشنی بھی ہے۔ عابد پشاوری کی غزلیہ شاعری حسین اور لطیف انسانی جذبات کی بہترین ترجمان ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں اور حسین پیرائے میں لکھی گئی ان کی غزلیں اور پھر ان کا اسلوب کلام انھیں ہمعصر شعرا میں ممتاز حیثیت بخشتا ہے۔

■

Mohammad Rafi
118-E Subansir Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:9599633071

ورک شیٹ کو سجانا
Enhancing Worksheet

ایم ایس- ایکسل میں ورک شیٹ کو مختلف طریقے سے فارمیٹ کرنے کی ایسی سہولتیں موجود ہیں، جن کے ذریعے آپ کا کام زیادہ خوبصورت اور بااثر لگے گا۔ ان میں سے بہت سی سہولیات ایم ایس- ورڈ سے ملتی جلتی ہیں اور بقیہ بالکل نئی ہیں اور ایسی ہیں، جو صرف ورک شیٹوں پر ہی لاگو کی جاسکتی ہیں۔

ایکسل میں سیلوں کو خاص قسم کا ڈاٹا دکھانے کے لیے فارمیٹ کرنے کے بارے میں آپ باب-2 میں پڑھ چکے ہیں۔ دیگر تکنیکوں کے بارے میں یہاں بتایا جارہا ہے۔

کالموں کی چوڑائی بدلنا(Changing Column Width)

ورک شیٹ میں کسی کالم کی چوڑائی اس میں بھرے گئے ڈاٹا کے مطابق سیٹ کرنی ہوتی ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی سیل میں بھرا گیا ڈاٹا اس میں پورا نہیں آتا۔ اگر وہ ڈاٹا حرفی (Character) ہے، تو بقیہ ڈاٹا اگلے دائیں طرف کے سیلوں میں دکھائی دیتا ہے، جیسا کہ تصویر E-4.1 میں دکھایا گیا ہے۔ اگر دائیں طرف کے سیل خالی ہوں، تو اس میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی لیکن اگر وہ بھی بھرے ہوئے ہوں، تو بائیں طرف کے سیل میں ڈاٹا پورا دکھائی نہیں دے گا۔ ایسے میں اس کالم کی چوڑائی بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی سیل میں ایسا عدد ہے یا ایسا فارمولہ ہے، جس کا نتیجہ بہت بڑا عدد ہے، تو وہ عدد سیل میں دکھائی نہیں دے گا، بلکہ اس کے بدلے پورا سیل ہیش نشانات (############) سے بھرا ہوگا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس سیل کی چوڑائی بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی ضرورت کے مطابق کسی کالم کی چوڑائی گھٹانی بھی پڑ سکتی ہے۔

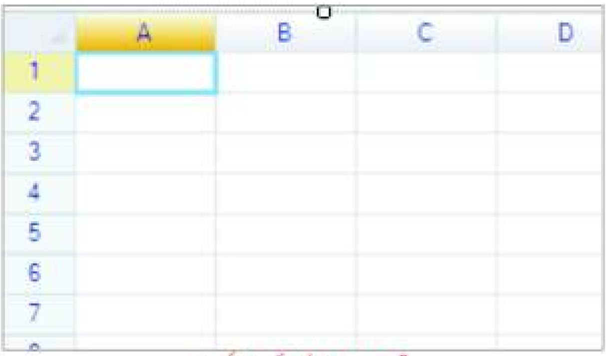

تصویر E-4.2: کالموں کی چوڑائی بدلنا

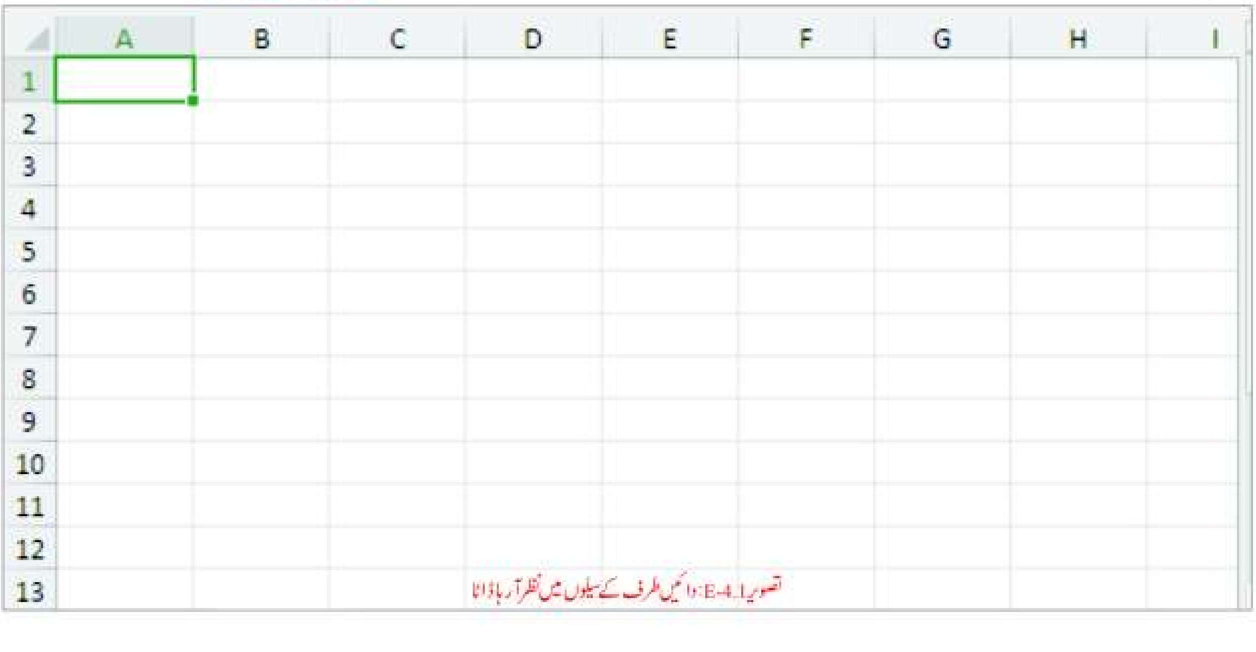

تصویر E-4.1: دائیں طرف کے سیلوں میں نظر آرہا ڈاٹا

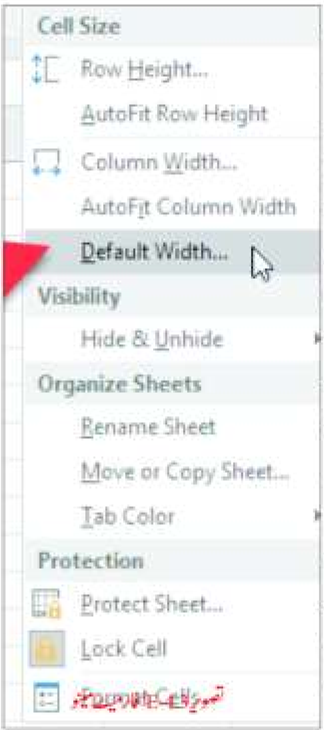

تصویر E-4.3: فارمیٹ مینو

ایکسل میں کسی کالم کی چوڑائی بدلنے کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم کالم کے نام (Label) کے دائیں کنارے پر ماؤس پوائنٹر لے جائیں۔ وہاں پہنچتے ہی وہ پوائنٹر ایک کھڑی موٹی لکیر میں بدل جائے گا، جس کے بیچ میں دونوں طرف اشارہ کرتا ہوا تیر کا نشان ہوگا۔ ایسی حالت میں ماؤس بٹن کو دبا کر پکڑ لیجیے اور اس کنارے کو کالم کی چوڑائی بڑھانے کے لیے دائیں طرف اور گھٹانے کے لیے بائیں طرف کھینچ کر لے جائیے اور مطلوبہ چوڑائی سیٹ کر کے چھوڑ دیجیے۔ اس سے پورے کالم کی چوڑائی اسی کے مطابق سیٹ ہوجائے گی۔ یہاں دھیان رکھنے کی بات یہ ہے کہ ایکسل میں ہم کسی اکیلے سیل کی چوڑائی نہیں بدل سکتے، بلکہ اس کے پورے کالم کی چوڑائی بدلنی ہوگی۔

اگر آپ کسی کالم کی چوڑائی اس کے سب سے لمبے مندرجات (ڈاٹا) کے مطابق سیٹ کرنا چاہتے ہیں تو اس کالم نام کے دائیں کنارے پر ڈبل کلک کیجیے۔ اس سے اس کالم کی چوڑائی اچھی طرح سیٹ ہوجائے گی، جیسا کہ تصویر E-4.2 میں دکھایا گیا ہے۔ آپ ایک ساتھ کئی کالموں کو چن کر ان میں سے کسی کے دائیں کنارے کو ڈبل کلک کر کے ان سب کی چوڑائی بھی اچھی طرح سیٹ کر سکتے ہیں۔

تصویر E-4.4: Column Width کا ڈائیلاگ باکس

کسی کالم (یا کالموں) کی چوڑائی بڑھانے کے لیے ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔ Home ٹیب کے Cells حصہ کے Format بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس سے تصویر E-4.3 کی طرح مینو کھلے گا۔ مینو میں ...Column Width ہدایت دیجیے۔ اس ہدایت کو دیتے ہی آپ کو کالم وڈتھ کا ڈائیلاگ باکس تصویر E-4.4 کی طرح حاصل ہوگا، جس میں کالم کی چوڑائی پوائنٹس (Points) میں دی جاتی ہے۔ اس ڈائیلاگ باکس میں مناسب چوڑائی سیٹ کر کے OK بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے چنے ہوئے کالموں کی چوڑائی اتنی ہی سیٹ کر دی جائے گی۔

قطاروں کی اونچائی (Changing Row Heights)

ایکسل میں عام طور پر کسی قطار کی اونچائی اس قطار کے کسی بھی سیل میں بھرے گئے سب سے موٹے نشان کے مطابق اپنے آپ بڑھالی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ خود بھی قطاروں کی اونچائی بدل سکتے ہیں۔ اس کے لیے ویسی ہی تکنیکوں کا استعمال کیا جاتا ہے، جو کالم کی چوڑائی بدلنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ جیسے ہی آپ ماؤس پوائنٹر کو کسی قطار نمبر کے نچلے کنارے پر لاتے ہیں، وہ ایک موٹی پڑی ہوئی لکیر میں بدل جاتا ہے، جس کے بیچ میں اوپر نیچے کی طرف اشارہ کرتا ہوا دونوں طرف کے تیر کا نشان ہوتا ہے۔ اس نشان کو آپ ماؤس سے پکڑ کر اوپر نیچے، کہیں بھی سیٹ کر کے اس قطار کی اونچائی بدل سکتے ہیں، جیسا کہ تصویر E-4.5 میں دکھایا گیا ہے۔

کسی چنی ہوئی قطار (یا قطاروں) کے نمبر کے نچلے کنارے پر ڈبل کلک کرنے پر اس کی اونچائی سب سے اچھی سیٹ ہوجاتی ہے۔

قطاروں کی اونچائی بدلنے کا کام آپ Row Height کے ڈائیلاگ کے ذریعے بھی کر سکتے ہیں۔ مطلوبہ قطار یا قطاروں کا انتخاب کر کے 'Format' مینو کے 'Row Height....' ہدایت کو کلک کرنے سے آپ کو تصویر E-4.6 کی طرح 'روہائٹ' کا ڈائیلاگ باکس حاصل ہوتا ہے، جس میں قطار کی اونچائی پوائنٹس (Points) میں دی جاتی ہے۔ اس ڈائیلاگ باکس میں موزوں اونچائی سیٹ کر کے OK بٹن کو کلک کیجیے، جس سے منتخبہ قطاروں کی اونچائی اتنی ہی سیٹ کر دی جائے گی۔

فونٹ سائز اور اسٹائل بدلنا (Changing Font Size and Style)

آپ کسی منتخبہ رینج میں بھرے ہوئے ٹیکسٹ یا ڈاٹا کا فونٹ، سائز اور اسٹائل ٹھیک اسی طرح بدل سکتے ہیں، جس طرح ایم ایس-ورڈ میں بدلا جاتا ہے۔ اس میں یا تو آپ Home ٹیب کے Font حصہ میں دیے گئے بٹنوں کا استعمال کر سکتے ہیں یا کی بورڈ کی شارٹ کٹ کنجیوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔

فونٹ چننے کے لیے Home ٹیب کے Font حصہ میں Font ڈراپ-ڈاؤن لسٹ کا استعمال کیا جاتا ہے اور ان کا سائز چننے کے لیے Font Size ڈراپ-ڈاؤن لسٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح اسٹائل بدلنے کے لیے 'Bold'، 'Italic' اور 'Underline' بٹنوں کا استعمال کر سکتے ہیں یا کی بورڈ میں ان کی جگہ پر بالترتیب Ctrl+B، Ctrl+I اور Ctrl+U شارٹ کٹ کنجیوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔

فارمیٹنگ کے زیادہ تر فونٹ سے متعلق آپشن Font حصہ میں موجود ہیں۔ اگر آپ مزید آپشن چاہتے ہیں تو سیلوں کو چن کر Cells حصہ کے Format مینو کے 'Format Cells' ہدایت سے ملنے والے ڈائیلاگ باکس میں 'Font' ٹیب شیٹ کا استعمال کرنا چاہیے، جو تصویر E-4.7 میں دکھائی گئی ہے۔

مشق E-3 (Exercise E-3):

ان کاموں کی مشق کرنے کے لیے مشق E-1 میں بنائی گئی ورک شیٹ کو کھول لیجیے اور درج ذیل کام کیجیے:

1. رینج B1:D2 میں بھرے اسکول کے نام کو چن کر فونٹ سائز 12 اور اسٹائل 'Bold' سیٹ کیجیے۔
2. سیل B4 کو چن کر فونٹ 'Arial Black'، سائز 14 اور اسٹائل 'Italic' سیٹ کیجیے۔
3. رینج B6: B7 کو چن کر اسٹائل 'Italic' کر دیجیے۔ یہی کام سیل F6 کے ساتھ بھی کیجیے۔

اس وقت آپ کی ورک شیٹ کا اوپری حصہ تصویر E-4.8 کی طرح دکھائی دے گا۔ دھیان دیجیے کہ کسی ٹیکسٹ کے فونٹ کا سائز بڑھانے پر اس قطار کی اونچائی اپنے آپ بڑھ جاتی ہے، جیسے یہاں قطار 1 اور 4 کی بڑھ گئی ہے۔ ■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس، F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

آج کے عالمی تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ

مرتب: شیخ عقیل احمد
صفحات: 467، قیمت: 240 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
مبصر: حقانی القاسمی، نئی دہلی

یہ کتاب قومی اردو کونسل نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ چھٹی عالمی اردو کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں عالمی تناظر میں اردو زبان کے مسائل و مباحث کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور زبان کی زمینی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں 'اردو ذریعہ تعلیم: ابتدائی تا ثانوی سطح' کو محور بنا کر گفتگو کی گئی ہے۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محمد اختر صدیقی، ڈاکٹر کے وی نکولن نے الگ الگ علاقوں میں اردو ذریعہ تعلیم کی صورت حال پر بحث کی ہے۔ مظفر شہ میری نے 'مشترکہ آندھرا پردیش میں اردو ذریعہ تعلیم کی صورت حال' پر کچھ اہم نکات پیش کیے جو قابل توجہ ہیں۔ ان کے مطابق اردو اساتذہ کے تربیتی کالج، انگریزی مواد کے ساتھ اردو کا انسلاک، اردو میڈیم اسکولوں میں انگریزی اور علاقائی زبانوں پر توجہ اور اردو ذریعہ تعلیم کو ای لرننگ سے جوڑا جانا، اردو میں سائنسی علوم کی تعلیم، نصابی کتابوں کی کمی کو دور کیا جانا اور اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کا جلد سے جلد پر کیا جانا اور طلبا کو اردو و انگریزی علاقائی زبانوں کے رسائل و جرائد کی فراہمی ضروری ہے۔ پروفیسر محمد اختر صدیقی نے 'اردو بہ حیثیت ایک ذریعہ تعلیم' میں ان اسباب پر روشنی ڈالی ہے جن کی بنا پر اردو کے ذریعہ تعلیم کی صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے۔ انھوں نے اردو میڈیم اسکولوں کی کمی، اردو پڑھانے والے اساتذہ کی کمی، اردو میڈیم اسکولوں کی گھٹتی ہوئی تعداد، اردو میڈیم اساتذہ کی عدم تربیت، نصابی کتب کی عدم فراہمی اور غیر تسلی بخش معیار تعلیم کو زوال کا سبب قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر کے وی نکولن نے 'کیرالہ کے پس منظر میں اردو اور اردو کی تعلیم' کا جائزہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کیرالہ میں 96 فیصد افراد کی مادری زبان ملیالم ہے اور اردو بولنے والوں کی تعداد 13499 ہے۔ ان کے مطابق اس وقت کیرالہ کے اسکولوں میں 1,11,000 اور 1700 کے قریب اساتذہ ہیں۔ یہاں کوئی اردو ذریعہ تعلیم اسکول نہیں ہے۔ یہاں ثانوی زبان کی حیثیت سے بچے اردو پڑھتے ہیں۔ اس کے باوجود یہاں مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو پڑھنے کی سہولت مہیا ہے۔ دس کالجوں اور تین یونیورسٹی میں اردو کورسز میں داخلہ لینے کی سہولت ہے۔ تین سرکاری کالجوں میں اردو اختیاری زبان کی وجہ سے باقی 7 کالجوں میں اردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ سری شنکراچاریہ سنسکرت یونیورسٹی میں اردو میں ایم اے، ایم، پی ایچ ڈی پروگرام ہیں اور کالی کٹ یونیورسٹی میں بی ایڈ وغیرہ کی سہولت ہے۔

دوسرے باب میں تحقیقی سطح پر اردو کی تعلیم کے حوالے سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر ابوذر عثمانی، ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم، پروفیسر احمد محفوظ اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے مقالات شامل کیے گئے ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے 'جامعات میں تدریس ادب کا تناظر' کے عنوان سے اپنے مضمون میں بہت سے اہم نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ موضوع کے ساتھ ساتھ نگراں کے انتخاب میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے اور ساتھ میں یہ بھی وضاحت کی ہے کہ جامعات سے وابستہ تمام اساتذہ مثالی اہلیت کے مالک نہیں ہوتے اس لیے جامعات کی تدریس کے لیے اساتذہ کے انتخاب میں ان کی استعداد کی صحیح چھان پھٹک ضروری ہے۔ ابوذر عثمانی نے 'تحقیقی سطح پر اردو کی تعلیم' کے حوالے سے تحقیق کے بنیادی لوازمات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ فضل اللہ مکرم نے 'موضوع تحقیق: مسائل و امکانات' میں تحقیقی عمل کے تین اہم دائرے،

محقق، موضوع اور نگراں کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اردو میں شخصیت اور فن کا چلن عام ہے حتیٰ کہ زندہ شخصیتوں پر بھی تحقیق ہورہی ہے۔ جبکہ آج کے عہد میں بین علومی موضوعات کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ بین لسانی موضوعات پر بھی کام کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے تحقیق میں جدید ٹکنالوجی کے استعمال کی لزومیت اور موضوعی تکرار سے اجتناب پر بھی بات کی ہے۔ احمد محفوظ نے 'اردو میں تحقیق کی صورت حال' پر ایک بہت اہم بات یہ لکھی ہے کہ جامعات کی سطح تک آنے سے پہلے اردو کے طلبا کے لیے قواعد زبان کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔ آفتاب احمد آفاقی نے 'تحقیقی سطح پر اردو کی تعلیم: مسائل اور حل' میں تحقیقی متن اور تصحیح متن پر زیادہ زور دیا ہے۔ انھوں نے اردو تحقیق کی صورت کو بہتر بنانے کے لیے چند معروضات بھی پیش کیں۔ ان کی رائے ہے کہ جن موضوعات پر تحقیقی کام ہو چکے ہیں اس کی ایک ڈائرکٹری ہندی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں تیار کی جائے اور اردو شعبوں کو مہیا کرائی جائے۔ انھوں نے ایک بڑی اہم بات یہ لکھی ہے کہ ''ابھی تک ہم حیات او رکارنامے اور علاقائی ادیبوں، شاعروں کی خدمات یا فرہنگ سازی کی حدود سے باہر نہ نکل سکے ہیں۔ ہمارے موضوعات، ہماری سماجی سیاسی یا عصری زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے'' اس مضمون میں آفاقی نے بہت سے اہم سوالات اٹھائے ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ہے 'اردو کی تعلیم میں مدارس کا کردار' اس باب میں مولانا غلام محمد وستانوی، پروفیسر قاضی حبیب احمد، ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، مفتی ارشد فاروقی، شاہ اجمل فاروق ندوی کی تحریریں ہیں۔ مولانا غلام محمد وستانوی نے 'مدارس اور اردو' شاعری اور نثر میں علما کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے مفتی عنایت علی کاکوروی، نواب قطب الدین دہلوی، مولانا محمد احسن نانوتوی اور دبستان دیوبند سے منسلک ادبی ذوق کے حامل علما میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا منظور نعمانی، مولانا رضوان القاسمی، مولانا سالم قاسمی، مولانا ولی رازی اور دبستان ندوہ سے وابستہ ادبی ذوق کے حامل علما میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین ندوی، سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر قاضی حبیب نے 'اردو کی تعلیم میں مدارس کا کردار' کے عنوان سے اپنے مقالے میں مدارس کا منظرنامہ، مدارس کی اہمیت، مدارس کا طرز تدریس، مدارس کے اقسام، اردو تلفظ اور املا، مدارس کی صحافت، اردو ادب کی تعمیر اور علمائے کرام، اردو تحریکیں اور مدارس پر روشنی ڈالی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں پچھلی دو صدیوں سے مدارس کا جو مثبت کردار رہا ہے اس کا اعتراف ضروری ہے۔ مشتاق احمد تجاروی نے 'اردو زبان اور مدارس اسلامیہ' کے حوالے سے بہت اچھی بات لکھی ہے کہ مدارس میں اردو ذریعہ تعلیم ضرور ہے مگر اردو زبان نصاب کا حصہ نہیں ہے۔ مدارس نے اردو زبان کو ترجموں کے ذریعے بھی فروغ دیا ہے اور دیگر ذرائع سے اردو زبان کی ترویج واشاعت کی ہے۔ انھوں نے ان ادیبوں کا بھی ذکر کیا ہے جو دینی مدارس کے فارغ ہیں اور جنھوں نے اردو میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ مفتی ارشد فاروقی نے 'اردو کی تعلیم میں مدارس کا کردار' میں اردو کی بقا میں مدارس کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ شاہ اجمل فاروق ندوی نے 'ہندوستانی تاریخ کی نصابی کتابیں اور دینی مدارس' کے عنوان سے اپنے مقالے میں ان نصابی کتابوں کا جائزہ پیش کیا ہے جو اہل مدارس نے نصابی ضرورت کے تحت تحریر کی ہیں ان میں مولانا سید ابوظفر ندوی کی مختصر تاریخ ہند، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ہندوستان کی کہانی، افضل حسین کی آئینہ تاریخ، محمد الیاس بھٹکلی ندوی کی تاریخ ہند وغیرہ شامل ہیں۔

چوتھے باب میں 'اردو: فائن آرٹس اینڈ انفوٹمنٹ' کے عنوان سے پروفیسر رمیش سی بھاردواج، پروفیسر نزہت کاظمی، سلیم عارف، راشد نیروا کی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ رمیش سی بھاردواج نے اردو کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''سارک ممالک کے عام لوگوں کے علاوہ اس کی اچھی خاصی تعداد خلیجی ممالک (سعودی عرب، کویت، دبئی، یو اے ای، قطر، عراق) اور دیگر خلیجی ممالک میں ہے۔'' انھوں نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ اردو ہی نے جنگ آزادی میں عوام کے درد کو، جدوجہد کو اور عام ہندوستانیوں کے خوابوں کو زبان دی اور یہ بھی بڑی اچھی لکھی ہے کہ 80 کی دہائی تک زیادہ تر ہندی فلموں میں اردو کے بے شمار الفاظ استعمال ہوتے تھے اور عوام ان لفظوں کو پسند بھی کرتے تھے۔ اس دور کی ہندی فلموں کے گانے کی خوبصورتی اردو الفاظ کی وجہ سے ہے۔'' پروفیسر نزہت کاظمی نے 'اردو زبان کے ذریعہ فن تعلیم فن تاریخ فن اور جمالیات کی پھیلتی دنیا کی چنوتیاں' کے عنوان سے اپنے مقالے میں امینہ آہوجہ، صادقین اور ایم ایف حسین کی خطاطی، مصوری پر اچھی گفتگو کی ہے۔ سلیم عارف نے 'اردو میں انفوٹمنٹ' میں یہ لکھا ہے'' آج اردو کا انفوٹمنٹ ڈیجیٹل دور میں لوگوں کی رضاکارانہ جدتوں سے بھرا پڑا ہے ہر روز ہزاروں اشعار روز صبح واٹس اپ کے ذریعے لوگوں کے فون پر پہنچتے ہیں اسی طرح بہت ساری انفارمیشن اور انٹرٹینمنٹ ہر روز یوٹیوب اور دوسری ویب سائٹ پر ڈالا جارہا ہے جسے آسانی سے مہیا کیا جارہا ہے۔'' راشد نیروا نے 'ماریشس میں اردو ڈرامے کا فروغ' کے عنوان سے مضمون تحریر کیا ہے انھوں نے عنایت حسین عیدن اور سید مظہر علی کا آزاد جھکا، محمود گوئو، محبوب انجورا، خیر النساء مہر علی اور قاسم ٹیمپل اور صابر گوڈ، ، فاروق رجل کا ذکر کیا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ماریشس میں اردو ڈرامے کا مستقبل تابناک نہ سہی مگر تاریک بھی نہیں۔

پانچواں باب 'مختلف ممالک میں اردو کی سماجی وتہذیبی صورت حال' سے متعلق ہے۔ اس میں ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا، ڈاکٹر ولی عالم شاہین، پروفیسر عقیل دانش، نصر ملک، ڈاکٹر احمد علی محمد عبدال، ڈاکٹر ذکائی قارداس، ڈاکٹر محمد غلام ربانی، شہزاد عبداللہ احمد، ماميا کین ساکو، پروفیسر علی بیات، ڈاکٹر محیا عبدالرحموا کے مقالے شامل ہیں۔ لدمیلا وسیلیوا نے اپنے مضمون میں ڈائسپرا کے حوالے سے بات کی ہے جس کی تشریح انھوں نے اس طرح کی ہے کہ وطن سے باہر ایک دیگر لسانی اور تہذیبی ماحول میں قیام پذیر عوام، قوم کا محدود حصہ جس نے اپنی زبان اور بنیادی طور پر قومی تہذیب اور روایات کو ترک نہیں کیا۔ ان کے بقول جنوبی ایشیا کے ڈائسپرا میں اردو رابطے کی زبان، ذریعہ ابلاغ اور تہذیبی ثقافتی وسیلہ ہے جس کا ذکر اردو کی نئی بستیوں کے نام سے کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مہجری ادیبوں کے نام بھی لکھے ہیں جن میں افتخار عارف، شاہین، افتخار نسیم، مقصود الٰہی شیخ، امجد مرزا اور دیگر نام ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مہجری اردو شاعری کے متنوع موضوعات میں ہجرت کا نیا تجربہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے بقول ہجرت کا یہ نیا تجربہ لسانی اور تہذیبی اجنبیت کے شدید احساس سے لبریز ہے جس میں وطن سے جغرافیائی دوری کا غم بھی بنا ہوا ہے۔ انھوں نے ڈائسپرا میں مہجری اردو ادب کے فروغ کی امید صرف نئے مہاجروں سے وابستہ کی ہے۔ ڈاکٹر ولی عالم شاہین نے 'کینیڈا میں اردو' کے عنوان سے اپنے مضمون میں کینیڈا کی مردم شماری کے اعتبار سے یہ واضح کیا ہے کہ کینیڈا میں اردو بولنے والوں کی سب سے بڑی آبادی ٹورنٹو میں ہے۔ کینیڈا کی اصل زبانیں انگریزی اور فرانسیسی ہیں۔ انھوں نے ان مصنفین کے نام لکھے ہیں جو کینیڈا میں

اردو کی شمع جلا رہے ہیں۔ ان میں عبدالقوی ضیا، حفظ الکبیر قریشی، رضاء الجبار، فاروق حسن، سید خورشید عالم، شاہد حسین رزاقی، اطہر رضوی، سید معین اشرف اور رخسانہ عزیز کے علاوہ شکیلہ رفیق، اشفاق حسین، عرفان ستار، کرامت غوری، تسلیم الٰہی زلفی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے یہاں سے شائع ہونے والے ادبی یا نیم ادبی جریدوں کے نام لکھے ہیں۔ پروفیسر عقیل دانش نے برطانیہ میں اردو کی صورت حال کے حوالے سے ہیلبری کالج کا ذکر کیا ہے جہاں 1806 سے ہی بڑے پیمانے پر اردو کی تدریس کا آغاز ہوا تھا۔ لندن یونیورسٹی کنگز کالج میں بھی اردو تدریس کا انتظام تھا۔ اسی زمانے میں پروفیسر جان پلٹ نے 1884 میں ہندی، اردو، ہندوستانی کے نام سے ایک لغت ترتیب دی تھی۔ ان کے مطابق اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں 1930 میں اردو زبان کا ایک بڑا شعبہ قائم ہوا۔ ڈاکٹر گراہم بیلی اس کے ریڈر تھے اور اسی اسکول سے پروفیسر رالف رسل جیسی شخصیت وابستہ تھی جنھوں نے اردو تدریس کو ایک نیا روپ دیا اور اسی ادارے سے ڈیوڈ میتھیوز بھی وابستہ رہے ہیں۔ پروفیسر عقیل دانش نے ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم کے تعلق سے بھی لکھا ہے کہ منشی عبدالکریم ملکہ وکٹوریہ کے انڈین ٹیوٹر تھے جن سے ملکہ نے اردو پڑھی اور ملکہ وکٹوریہ نے اپنے استاد کا آخر وقت تک بہت خیال رکھا اور انھیں سی آئی او جیسا برطانیہ کا اہم اعزاز بھی عطا کیا اور کہا جاتا ہے کہ ملکہ ہی نے بمرولی میں ان کے لیے ایک محل بھی بنوایا تھا۔ برطانیہ میں اردو تدریس، برطانیہ میں اردو صحافت، برطانیہ میں اردو نشریات، برطانیہ میں ادبی سرگرمیاں، ادبی تنظیمیں اور برطانیہ کے مختلف علاقوں، مثلاً گلاسگو، ایڈنبرا، بریڈفورڈ، مانچسٹر، لیورپول، بلیک برن، نوٹنگھم، ریڈنگ، برمنگھم وغیرہ میں ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے بہت اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ نصر ملک نے 'یورپ میں اردو کی بقا اور اردو زبان کی تعلیم و تدریس' کے حوالے سے اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر احمد محمد ابدال نے 'مصر میں اردو زبان و ادب کی حالیہ تعلیم اور تحقیق' پر مبسوط روشنی ڈالی ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی، عین شمس یونیورسٹی، اسکندریہ یونیورسٹی، منصورہ یونیورسٹی، طنطا یونیورسٹی اور ازہر یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کی تعلیم و تحقیق پر گفتگو کرتے ہوئے مصر میں اردو زبان کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی ہے اور چند نکات بھی پیش کیے ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ذکائی قارداس نے 'ترکی میں اردو زبان کی تعلیم' میں یہ لکھا ہے کہ یہاں اردو زبان کی تعلیم کا آغاز 1915 میں ہوا اور اس کے بانی عبدالجبار خیری ایک ہندوستانی تھے اور وہ ترکی میں اردو کے اولین پروفیسر تھے۔ انھوں نے عثمانی دارالفنون میں اردو زبان پڑھانے کا نظام شروع کیا۔ اس کے بعد سے استنبول یونیورسٹی، انقرہ یونیورسٹی اور کونیا یونیورسٹی میں بھی اردو زبان کی اعلیٰ سطح کی تعلیم کا آغاز ہوا اور وہاں یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی اور ایم اے کے مقالے بھی اساتذہ کی نگرانی میں لکھے جا رہے ہیں۔ انھوں نے پی ایچ ڈی اور ایم اے کے مقالوں کی تفصیل بھی پیش کی ہے جس کے مطابق سلمیٰ بینلی، خلیل طوقار، گلسرین ہالی جی، نوریہ بیلیک، جلال سوئیدان، دورموش بولگور، مقدر گونیلی، آسمان بیلین اوز جان، خاقان قویومجو، ذکائی قارداس، آرزو سورین وغیرہ نے بہت اہم موضوعات پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے۔ اس کے علاوہ ایم اے کی سطح پر بہت اہم عنوانات پر مقالے لکھے گئے۔ پی ایچ ڈی میں جدید اردو شاعری، سجاد حیدر یلدرم، علامہ اقبال، بابر، پروین شاکر، مولانا ابوالکلام آزاد پر اہم مقالے تحریر کیے گئے ہیں جو خوش آئند بات ہے اور ایم اے کی سطح پر بھی اردو غزل، مرزا غالب، حالی، محمد حسین آزاد، رفیع سودا، نذیر احمد، پریم چند، فیض احمد فیض وغیرہ کو موضوع بنایا گیا۔ غلام محمد ربانی نے 'بنگلہ دیش میں اردو زبان اور کلچر' کے حوالے سے اپنے مقالے میں بنگلہ دیش میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر ام سلمیٰ کا ایک اقتباس دیا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ بنگلہ دیش میں اردو کی ترویج و اشاعت میں کس طبقے کا اہم اور فعال کردار رہا ہے۔ ام سلمیٰ لکھتی ہیں کہ ''بنگال کے مسلمان عربی زبان کے بعد اردو کو مذہبی زبان سمجھتے تھے۔ سماج میں یہ رواج تھا کہ کوئی مولوی اس وقت تک کامل مولوی نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک اردو زبان نہ جانے اور اس میں بات چیت نہ کر سکے۔ اسی وجہ سے ہزاروں بنگالی ہر سال دیوبند اور دوسرے مذہبی مراکز میں عربی کے ساتھ اردو زبان بھی سیکھ لیتے تھے۔ چنانچہ ان مذہبی علما کا سماج کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے اردو زبان کی اشاعت میں ان کا گہرا کردار رہا ہے۔'' غلام ربانی نے ایک خاص بات یہ بھی لکھی ہے کہ ''اردو زبان ہندوستان کی طرح بنگلہ دیش میں سب سے زیادہ زندہ ہے مدارس میں۔ مدرسے میں اردو میں تقریر ہوتی ہے، امتحانات میں سوالات کے جواب اردو میں لکھتے ہیں۔'' شہزاد عبداللہ احمد نے 'مختلف ممالک میں اردو کی سماجی و تہذیبی صورت حال' پر بہت اختصار سے اردو کے فروغ میں ذی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے کردار پر روشنی ڈالی ہے اور اردو اسپیکنگ یونین کے کام کا بھی حوالہ دیا ہے جو ورکشاپ سمینار کا انعقاد کرتی رہتی ہے۔ 'جاپان میں اردو تدریس: صورت حال اور ہماری تجاویز' مامیا کین ساکو کا بہت وقیع مقالہ ہے۔ جس میں انھوں نے جاپان میں اردو تدریس کے حوالے سے یہ تحریر کیا ہے کہ ''وہاں اردو تدریس کی کوئی ایک سو دس سالہ تاریخ ہے اور ٹوکیو میں 1908 میں اردو کی تدریس کا آغاز ہوا۔ ٹوکیو اور اوکاسا دونوں یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے مگر جاپان میں اردو پڑھانے میں بڑی دشواریاں ہیں۔'' انھوں نے تقریباً تین اسباب لکھے ہیں جس میں مواد کی کمی، ماحول کی کمی، اردو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ وغیرہ کا حوالہ ہے۔'' ڈاکٹر علی بیات نے 'اردو پر فارسی کے اثرات: ایک جائزہ' کے عنوان سے اپنے مقالے میں فارسی کی دختر زیبا زبانِ اردو پر فارسی ایرانی ثقافت و ادبیات کے بالواسطہ اور بلاواسطہ اثرات کی نشاندہی کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ ''اردو کے شاعروں نے فارسی مضامین کے ساتھ فارسی تراکیب، ضرب الامثال اور محاوروں کو کہیں ترجمہ اور کہیں براہِ راست شعر کا حصہ بنایا ہے۔'' انھوں نے فارسی ادبیات سے فیض اٹھانے والوں میں ولی دکنی، میر تقی میر، سودا، حسرت موہانی وغیرہ کا ذکر کیا ہے جن کے یہاں محاورات اور تراکیب فارسی کے بکثرت ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے جدید شاعروں میں ن م راشد، فیض احمد فیض کا بھی حوالہ دیا ہے جنھوں نے فارسی سے استفادہ کیا ہے۔ غالب کے یہاں بھی بہت سی تلمیحات فارسی سے مستعار ہیں۔ ڈاکٹر محیا عبدالرحموا نے اردو زبان ازبکستان کے عنوان سے اپنے مضمون میں تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کی درس و تدریس کے تعلق سے یہ تحریر کیا ہے کہ ''جب 1947 میں یہاں شعبہ قائم ہوا تو اس کے اولین استاد روسی اور ہندوستانی تھے۔'' انھوں نے اردو کے تعلق سے تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں میں ازبکستان میں اردو کے پہلے اسکالر پروفیسر آزاد شاماتوف کا نام لکھا ہے جنھوں نے دکنیات پر بہت ہی وقیع کام کیا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر تاشمرزہ خالمرزائف بھی ہیں جنھوں نے اردو ازبیک ڈکشنری مرتب کی۔ رحمٰن بیروی محمد جانوف بھی اردو کے بڑے محقق ہیں جنھوں نے درسی کتابیں اور ٹیکسٹ بک تیار کیے۔ ڈاکٹر انصارالدین ابراہموف نے اردو ازبیک مشترک الفاظ کی لغت ترتیب دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو سے ازبیک میں ترجمہ کرنے والوں کے نام لکھے ہیں جن میں رحمان بیروی قابل ذکر ہیں کہ

انھوں نے غالب کی منتخب غزلوں کا 'شیدۂ' کے عنوان سے ازبکی میں ترجمہ کیا ہے۔اس کے علاوہ طاہر ابراہیموف نے بھی میرامن کی 'باغ و بہار' کو ازبکی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ازبیک اسکالر سعداللہ یولداشیف نے علامہ اقبال کی کچھ اردو اور فارسی نظموں کا ترجمہ دو تین ازبیک شعرا کی مدد سے کیا ہے۔

چھٹا باب 'ذرائع ابلاغ اور اردو' سے متعلق ہے جس میں ڈاکٹر مرینال چٹرجی، پروفیسر غیاث الرحمٰن سید، ڈاکٹر صابر گودڑ، عبدالسمیع بوبیرے، ڈاکٹر مرزا عبدالباقی بیگ کے مضامین شامل ہیں۔مرینال چٹرجی نے 'اڑیسہ میں اردو صحافت' میں وہاں سے نکلنے والے اہم اخبارات المنصور، مسلم گزٹ، اخبار نامہ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے وہاں اردو کے بڑھتے دائرے کے حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے۔انگریزی سے ترجمے کی وجہ سے شاید کچھ غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔غیاث الرحمٰن سید نے 'میڈیا اردو عالمی جائزہ' کے عنوان سے اپنے مقالے میں پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا وغیرہ کے حوالے سے بات کی ہے اور مبسوط انداز میں ان تمام اہم جرائد کی فہرست بھی دی ہے جو مختلف علاقوں سے شائع ہوتے رہے ہیں۔انھوں نے جہاں برطانیہ کے اردو اخبارات کا ذکر کیا ہے وہیں چین سے نکلنے والے اردو رسالہ 'نوائے دوستی' کا بھی نام لکھا ہے۔انھوں نے ٹیلی ویژن کے حوالے سے ڈی ڈی اردو، ڈی ڈی کشمیر نیشنل چینل، ڈی ڈی بھارتی، ڈی ڈی اتر پردیش، ڈی ڈی مدھیہ پردیش کا ذکر کیا ہے جہاں اردو کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ای ٹی وی اردو، زی سلام، منصف چینل، تہذیب ٹی وی وغیرہ کے علاوہ ریڈیو کے حوالے سے اردو سروس اور اردو مجلس بی بی سی، وائس آف امریکہ، ریڈیو آذربائیجان، ریڈیو ماریشس، ایس بی ایس اردو آسٹریلیا، ریڈیو چائنا، ریڈیو جاپان کی بابت لکھا ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پرنٹ ہو یا الیکٹرانک میڈیا اردو کا دائرہ محدود نہیں ہے۔ڈاکٹر صابر گودڑ نے 'ماریشس میں فروغ اردو اور ذرائع ابلاغ کا کردار' کے عنوان سے اپنے مضمون میں ان پروگراموں کا ذکر کیا جو ریڈیو اور ٹی وی پہ نشر ہوتے رہتے ہیں۔عبدالسمیع بوبیرے نے 'ماس میڈیا اور اردو' کے عنوان سے اپنے مضمون میں اردو صحافت کے حوالے سے بہت اختصار سے بحث کی ہے اور کچھ کمزوریوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ڈاکٹر مرزا عبدالباقی بیگ نے 'عوامی ذرائع ابلاغ اور اردو' کے عنوان سے اپنے مضمون میں ابلاغ کی مختلف شکلوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور مختلف ممالک کی اردو نشریات کا بھی بطور خاص ذکر کیا ہے۔ریڈیو اور ٹی وی دونوں میں جو اردو کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں ان پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔

ساتواں باب 'آئین اور دوسرے قوانین میں اردو کا مقام' کے عنوان سے ہے۔ اس میں پروفیسر ایم شبیر، خواجہ عبدالمنتقم، پروفیسر نزہت پروین خان، پروفیسر علی مہدی، محسن عالم بھٹ کی تحریریں شامل ہیں۔پروفیسر ایم شبیر نے 'عدل گستری کی زبان کے طور پر اردو اور اس کی آئینی حیثیت کے نفاذ کی وکالت' کے عنوان سے اپنے مضمون میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ''دور حاضر میں قانون کی جو اردو زبان ہم جانتے ہیں وہ بہت حد تک ناول نگار، نذیر احمد کا عطیہ ہے جنھوں نے تعزیرات ہند کا 1860 میں اردو ترجمہ کیا۔'' انھوں نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ ''انیسویں صدی کے وسط کے عدالتی فیصلوں میں شاعری کی جھلک ملتی ہے اور اردو میں یہ رجحان مرزا غالب کے یہاں سے آیا۔'' انھوں نے لکھا ہے کہ 1890 کے آخر میں جسٹس سید محمود نے اپنے تاریخی فیصلے میں اردو شاعری کا حوالہ دیا اور آج بھی ساحر اور فیض کے اشعار فیصلے لکھنے کے عمل کو انسانی احساس دیتے ہیں۔خواجہ عبدالمنتقم نے 'اردو کی آئینی اور قانونی حیثیت' کے عنوان سے بہت وقیع مضمون تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے اردو کی آئینی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ''ایک وہ دور تھا جب مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں ملک کے مختلف حصوں میں اردو کا بھرپور استعمال ہوتا تھا اور اردو پورے ملک میں مقبول عام زبان ہونے کے ساتھ ساتھ سرکاری کام کاج کی زبان بھی تھی۔آج بھی پولیس اور مالگزاری کے ریکارڈ میں اردو کے الفاظ باقاعدہ استعمال کیے جارہے ہیں جبکہ ہندی کو سرکاری درجہ حاصل ہو چکا ہے۔آج بھی عدالتوں میں مدعی، مدعا علیہ، جواب دعوے، جواب الجواب جیسی اصطلاحات کا استعمال ترک نہیں ہوا ہے۔پولیس ریکارڈ میں فرد مقبوضگی، آلہ جرم، پارچات خون آلود، فرد جامہ تلاشی، نقشۂ مرگ جیسے الفاظ دیوناگری رسم الخط میں ہی سہی آج بھی استعمال ہورہے ہیں۔اسی طرح مالگزاری کے ریکارڈ میں بیعنامہ، کرایہ نامہ، رہن نامہ، انتقال، جائداد، جمعبندی جیسے الفاظ باقاعدہ استعمال ہورہے ہیں اور ہوتے رہیں گے چونکہ اس ریکارڈ کی اس کے تلف ہونے تک اور یہاں تک کہ تلف ہونے کے بعد بھی ان کی نقول کی بغرض شہادت اہمیت باقی رہے گی اور ان دستاویزات کو ان کے اصل رسم الخط میں ہمیشہ ہمیشہ پیش کیا جاتا رہے گا۔''

پروفیسر نزہت پروین خان نے ''لسانی سیاست لسانی اقلیت اور آئین کے تحفظ میں اردو کا مقام' کے عنوان سے اپنے مقالے میں مختلف زبانوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے آئین کی ان دفعات کا ذکر کیا ہے جو لسانی اقلیتوں کو تحفظ عطا کرنے والی ہیں۔انھوں نے یہ حقیقت بھی لکھی ہے کہ ''اردو کے زوال کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ پاکستان چلا گیا اور اتر پردیش کے اردو میڈیم تعلیمی اداروں میں صرف پسماندہ مسلمان رہ گئے جبکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ بازاری طاقت بھی زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور اردو زبان کو بازار سے کسی طرح کی حمایت نہیں حاصل ہوسکی۔'' پروفیسر علی مہدی نے 'فروغ اردو آئینی اور قانونی نقطۂ نظر' کے عنوان سے اپنے مضمون میں یہ وضاحت کی ہے کہ برطانوی دور حکومت میں اردو کو ملک کے مرکزی اور شمالی حصے میں عدالتوں کی کارروائی لکھنے کے لیے مقامی زبان کا درجہ ملا۔اردو الفاظ عدالتی کارروائی میں آج تک استعمال ہورہے ہیں'' انھوں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے پر سخت ردعمل ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''دیگر مسلم ممالک میں اردو نہ تو قومی زبان ہے اور نہ ہی سرکاری زبان۔یہاں اسلام کے ماننے والے نہ تو اردو بولتے ہیں اور نہ ہی سمجھتے ہیں۔'' محسن بھٹ نے 'آئینی دفعات اردو کے تحفظ کی نئی حکمت عملی' کے عنوان سے اپنے مضمون میں کچھ سوالات پیش کیے ہیں اور آئین ہند کے تحت زبان کے کردار پر اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔

اس کتاب میں کلیدی خطبے کے طور پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ایک تحریر بھی شامل ہے جس میں اردو کے تحفظ و ترقی کے لیے کچھ تجاویز اور مشورے ہیں اور یقینی طور پر یہ ایسے نکات ہیں جن پر عمل کرکے اردو زبان کے فروغ کی راہیں آسان کی جاسکتی ہیں۔ کتاب میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا پیش لفظ بھی ہے جس میں انھوں نے اردو کے عالمی کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمیں سماج، سیاست اور معاش کی سطح پر زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کیا ترکیبیں اختیار کرنی ہیں اور کیسے آج کی نئی ٹیکنالوجی کے عہد میں اپنی زبان کا تحفظ کرنا ہے۔

آخر میں چھٹی عالمی اردو کانفرنس کی ایک مفصل روداد بھی ہے۔

'آج کے عالمی تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ' کے عنوان سے شائع یہ کتاب بیش قیمت اطلاعات، نکات اور اشارات پر مبنی ہے۔اردو کی عالمی صورت حال سے آگہی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ اردو کے اساتذہ، طلبا اور شیدائیوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔

اردو زبان و ادب پر عربی کے اثرات

مصنف: ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی، مترجم: محمد طارق
صفحات: 508، قیمت: 225 روپے، سنہ اشاعت: 2019
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: امیر حمزہ
K-12 تھرڈ فلور، حاجی کالونی، جامعہ نگر، نئی دہلی

اس دنیا کی لسانی تاریخ میں کئی موڑ ایسے دیکھنے کو ملتے ہیں جب ایک زبان کا غلبہ دوسری زبان پر ہو جاتا ہے اور علاقائی زبان ثانوی زبان بن کر رہ جاتی ہے، اسی طریقے سے کئی زبانیں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے اثرات بہت ہی دور اور دیر تک قائم کیے ہیں۔ یہ جغرافیائی اور مذہبی دونوں سطح پر ہوا ہے۔ اسلام کی آمد کے بعد عربی زبان کے سامنے کئی علاقائی زبانوں نے دم توڑا تو کئی قدیم اور مضبوط تہذیبوں کی نمائندگی کرنے والی زبان بھی فاتح کی زبان کو اپنے اندر سموتی چلی گئی اس کی واضح مثال فارسی زبان ہے جس میں عربی کا اثر اتنا زیادہ بڑھا کہ ایک مکمل زبان ہونے کے باوجود عربی کے الفاظ و تراکیب فارسی کے ہر جملے میں نظر آنے لگے ساتھ ہی شاعری میں عربی کے مصرعے تک باندھے جانے لگے۔ یہی کچھ اردو زبان کے ساتھ بھی پیش آیا کہ اس زبان نے اپنی ادبی اور علمی شروعات فارسی زبان کے ماتحت کی اور تب تک فارسی، عربی کے الفاظ و تراکیب سے پر ہو چکی تھی تو ایسے میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اردو کے شاعروں نے فارسی و عربی شاعری سے کشید کیا، ساتھ ہی شاعری بھی فارسی میں کی اور اسی کے ساتھ عربی کے اثرات بھی اردو پر ہوئے دوسری وجہ دینی بھی ہے۔ زبان کس طرح بدلتی ہے اس کے واضح اثرات آپ اردو کے دو شاعروں کے یہاں دیکھ سکتے ہیں ایک جعفر زٹلی اور دوسرے اکبر الہ آبادی۔ زٹلی کے یہاں ہندوی اور اردو کے اسما و صفات رقم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کے عہد کے بعد اردو زبان اپنے عروج کو پہنچتی ہے اور اکبر الہ آبادی کے دور سے ہی زبان کروٹ لینا شروع کر دیتی ہے یعنی انگریزی کا اثر اردو زبان میں بڑھنے لگتا ہے۔ اردو زبان کا بیشتر ادبی سرمایہ فارسی زبان سے آیا ہے اور اس زمانے کے اردو کے اکثر علما عربی زبان و ادب سے واقف تھے۔ ان دونوں وجوہات کا ایسا گہرا اثر ہوا کہ اردو زبان و ادب میں ہزاروں الفاظ عربی کے داخل ہو گئے، جس پر زیر تبصرہ کتاب میں مدلل گفتگو کی گئی ہے۔

'اردو زبان و ادب پر عربی کے اثرات' کے مصنف عربی زبان و ادب کے مشہور و مستند عالم پروفیسر علیم اشرف جائسی ہیں جن کا تعلق مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے ہے۔ یہ کتاب ان کے تحقیقی مقالہ کا حصہ ہے جو پروفیسر سید کفیل احمد کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ اس کو اردو کا جامہ محمد طارق نے پہنایا جن کا تعلق مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ ترجمہ سے ہے۔ جہاں تک ترجمہ کی بات ہے تو فنی طور پر بہت ہی عمدہ اور سلیس ہے اس میں معنوی ترسیل کی مکمل کوشش ملتی ہے، بلکہ زبان سے یہ احساس ہوتا ہی نہیں کہ یہ ترجمہ ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے اور تمام ابواب میں کل فصول کی تعداد چودہ ہے۔ پہلے باب میں اردو زبان کی نشو و نما اور ارتقا کا ایک تاریخی جائزہ ہے۔ اردو زبان کی نشو و نما پر جتنے بھی نظریے ہیں ان میں سے انھوں نے ہندوستانی، پنجابی اور ہریانوی نظریات پر بحث کی ہے۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف کو "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر کسی نے اپنے نظریے کے اثبات پر توجہ دینے کے بجائے دوسروں کے خیالات و آرا کی تردید و ابطال پر زیادہ توجہ دی ہے۔"

ارتقا کی فصل میں دس مقامات و ادوار کے ساتھ صوفیا کا بھی خصوصی ذکر ہے جن میں سے اکثر کا تعلق تشکیلی دور سے ہے۔

دوسرے باب میں اردو لغات پر عربی زبان کے اثرات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب کی تمہید پر وہ دلچسپ باتیں لکھتے ہیں کہ عربی زبان میں تمدن، حکومت اور فرنیچر سے متعلق الفاظ کی بڑی تعداد فارسی سے، علم و فلسفہ سے متعلق یونانی سے، زراعت کے الفاظ نبطی سے، دینی رسومات عبرانی یا سریانی سے، مسالہ، دوا اور خوشبو وغیرہ کے الفاظ ہندی سے آئے ہیں۔ دو زبانوں کے درمیان آپسی رشتہ کیسے قائم ہو جاتا ہے اس پر بھی معروضی گفتگو ہے۔ جیسے آج کے دور میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اردو سمیت کئی زبانوں میں سائنس اور جدید ایجادات کے متعلق الفاظ انگلش سے بلا کسی تغیر و تبدل کے آ رہے ہیں۔ اس باب میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں ان عربی الفاظ کا ذکر ہے جو بغیر کسی لفظی و معنوی تصرف کے اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس فصل کے حاشیے میں انھوں نے سمیر عبدالحمید ابراہیم کے لغت کا ذکر کیا ہے جس میں ہزاروں ایسے عربی الفاظ شامل کر دیے گئے ہیں جو نہ کسی اور دوسرے اردو لغت میں موجود ہیں اور نہ ہی اردو والے اس کو بولتے ہیں۔ حاشیہ میں ہی انھوں نے سیکڑوں الفاظ کے متعلق تلفظ کی تفریق کا ذکر کیا ہے۔ دوسری فصل میں ان الفاظ کا ذکر ہے جو لغت میں لفظی، معنوی یا دونوں قسم کے تغیر کے ساتھ درج ہیں۔ اس فصل میں انھوں نے لفظی تغیر کے چار اور معنوی تغیر کے چھ اسباب بیان کیے ہیں ساتھ ہی صوتی و دلالتی تغیر کی چھبیس اقسام کا ذکر کیا ہے۔ ایسے الفاظ کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے، اس میں انھوں نے ہر لفظ کے اردو معنی اور عربی معنی کا ذکر الگ الگ کیا ہے۔ اس کے بعد دو سو سے زائد ان الفاظ کا ذکر کیا ہے جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں لیکن عام بول چال میں حرکاتی تغیر واقع ہو چکا ہے۔ اس باب کی تیسری فصل میں ان عربی الفاظ کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ غیر عربی لاحقے اور سابقے آ گئے ہیں۔ چوتھی فصل میں ان عربی مرکبات کا ذکر ہے جن کا ذکر اردو میں بکثرت ہوتا ہے بلکہ وہ روزمرہ کی زبان میں بھی مستعمل ہیں جیسے فی الحقیقت، فارغ البال وغیرہ۔

تیسرا باب اردو زبان کے علوم پر عربی زبان کے اثرات پر ہے۔ اردو زبان جب انیسویں اور بیسویں صدی میں بہت ہی زیادہ متعارف ہوگئی، ہر طرف لکھی اور پڑھی جانے لگی یہاں تک کہ ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی ہوگئی اور اردو زبان میں علوم کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جو علوم پہلے عربی زبان میں پڑھائے جاتے تھے وہ اب اردو زبان میں پڑھائے جانے لگے۔ اگر صرف علوم کی بات کی جائے تو کئی علوم ہیں جو پہلے عربی زبان میں پائے جاتے تھے وہ اب اردو زبان میں بھی ہیں جن سے اصطلاحات و اسما و صفات براہ راست عربی زبان سے ہی آئے ہیں جیسے علوم حکمت و کلام و فلسفہ و دیگر لیکن یہاں مصنف نے صرف ان علوم کو شامل کیا ہے جن کا تعلق داخل زبان سے ہے جیسے پہلی فصل میں بلاغت سے علم بیان، معانی اور بدیع۔ دوسری فصل میں عروض و قافیہ۔ تیسری فصل میں صرف و نحو۔ چوتھی فصل میں رسم الخط و املا اور پانچویں فصل میں تنقید کے اردو زبان پر اثرات کیا ہیں۔ واضح ہو کہ ان علوم میں عربی کا اثر اردو زبان پر اتنا زیادہ ہے کہ گویا تمام اصطلاحات کو ہو بہو نقل کر دیا گیا ہو۔

چوتھے باب میں اردو ادب پر عربی زبان کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اس پر گفتگو ہے۔ اس میں تین فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں مجموعی اثرات کا ذکر ہے جس میں مفردات، تلمیحات، تشبیہات و استعارات، اصطلاحات و تراکیب وغیرہ پر گفتگو ہے۔ دوسری فصل میں اردو نثر پر عربی کے اثرات کو پیش کیا گیا ہے، نثر کی جو اقسام عربی میں پائی جاتی ہیں وہ اردو میں بھی پائی جاتی ہیں نام بھی وہی ہیں اس کے علاوہ چند نثری اصناف وہ ہیں جن کا تعلق عربی زبان و ادب سے رہا ہے جیسے تحریری قصے، خطبات، خطوط و مکاتیب،

سیرت وسوانح، ادبی مقالات۔ اردو کی دینی تحریروں پر عربی کے اثرات کا مختصر ذکر کیا گیا ہے اگر اس کی تفصیل میں جاتے تو شاید اتنی ہی ضخیم ایک اور کتاب تیار ہو جاتی۔ تیسری فصل میں پہلے تو مجموعی طور پر اردو شاعری پر عربی زبان کے اثرات پر گفتگو ہوئی ہے اس کے بعد عربی شاعری اور فارسی شاعری کے اردو زبان پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اس پر بات کی گئی ہے۔ اردو اور عربی اصناف شعر جیسے قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی اور رباعی جن کا سرا عربی زبان سے ملتا ہے اور اردو میں براہ فارسی منتقل ہوئی ہیں۔ رباعی میں اشکال بھی ہو سکتا ہے لیکن اتنا تو واضح ہے کہ اس کے اوزان وارکان عربی سے ہی ہیں۔ الغرض یہ کتاب مکمل دستاویز ہے ان تمام عناصر کا جن کا ورود اردو میں عربی سے ہوا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں جس قدر محنت کی گئی ہے وہ جدید محققین کے لیے مثال ہے اور مترجم کی محنت صاف جھلکتی ہے کہ انھوں نے کس جانفشانی سے تمام چیزوں کو اردو کے ماحول میں ڈھال کر پیش کر دیا۔ قومی کونسل کا شکریہ کہ وہ نے اس قیمتی علمی وتحقیقی سرمایے کو شائع کر کے بین لسانی روابط کو منظر عام پر لائی۔

رامپور کے فارسی گو شعرا

مولفہ: ساجدہ شیروانی

صفحات: 290، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عشرت جہاں، محلّہ ٹنڈولہ ٹانڈہ رامپور، یوپی

'رامپور کے فارسی گو شعرا' ساجدہ شیروانی کی تازہ تالیف ہے۔ اس کتاب میں ان 194 فارسی شعرا کا تذکرہ ہے جن کا تعلق رامپور سے رہا ہے۔ یعنی وہ شعرا جو رامپور میں پیدا ہوئے یا پھر ان کا اچھا خاصا وقت رامپور میں بسر ہوا۔ جن شعرا کی جائے ولادت رامپور ہے وہ تو یقیناً رامپوری کہلانے کے مستحق ہیں ہی لیکن جو کہیں اور پیدا ہوئے ان کے رامپوری کہلانے کے جواز کے حوالے سے مولفہ نے لکھا ہے: ''...اسی طرح رامپور کے ابتدائی دور کے علما اور شعرا کو بھی جو اگرچہ پیدائشی طور پر اس خطہ کے نہیں تھے لیکن یہیں آکر بس گئے یا یہیں پرورش پائی، یہاں ان کے فن کو جلا ملی اور یہیں اپنی کل زندگی یا زندگی کا بیشتر حصہ گذار دیا اور وفات پائی رامپوری کہلانے کے مستحق ہیں۔'' اس طرح دیکھا جائے تو یہ کتاب ان تمام فارسی کے شعرا کا احاطہ کرتی ہے جن کا پیدائشی رشتہ رامپور سے رہا ہے یا رامپور سے ان کی گہری وابستگی رہی ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو یہ کتاب رامپور کی فارسی شاعری کے حوالے سے ماٰخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ رامپور کی فارسی شاعری پر کام کرنے والے اسکالرس کے لیے بھی یہ کتاب نہایت مفید ہے۔

کتاب میں جن شعرا کو شامل کیا گیا ہے، ان کا تذکرہ جامع انداز میں لکھا گیا ہے، غیر ضروری طوالت سے گریز کیا گیا ہے، البتہ جس قدر تفصیلات پیش کرنا ضروری ہیں، وہ ضرور مہیا کی گئی ہیں تاکہ تشنگی محسوس نہ ہو۔ لیکن اس التزام کے باوجود بعض شعرا کے احوال وکوائف کا بیان نہایت مختصر معلوم ہوتا ہے غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ان شعرا کے تفصیلی حالات مولفہ کو نہ مل پائے ہوں اور جس قدر ملے ہوں مجبوراً انہی پر اکتفا کرنی پڑی ہو۔ ہر شاعر کی حیات وخدمات کے ساتھ اس کی شاعری کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے جس سے کہ شاعر کی شاعری کے نہج وطرز کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی کی ایک تحریر بعنوان 'تعارف' ہے۔ اگرچہ یہ تحریر مختصر ہے تاہم اس کے ذریعے رامپور کا علمی وتاریخی پس منظر سامنے آجاتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ رامپور کے ادیبوں وقلمکاروں نے کس کس طرح کی کتابیں لکھی ہیں۔ 'پیش گفتار' میں مولفہ نے کتاب کے حوالے سے جو باتیں تحریر کی ہیں وہ اہمیت کی حامل ہیں۔ 'پیش لفظ' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے لکھا ہے جس میں انھوں نے کتاب کی اہمیت ومعنویت پر روشنی ڈالی ہے اور کتاب کو قارئین کے لیے مفید بتایا ہے۔ کتاب میں شعرا کا تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کتاب میں تقدم وتاخر کو شعرا کی اولیت وفضیلت کا معیار نہ خیال کیا جائے۔ رامپور کے جن نمائندہ شعرائے فارسی کا کتاب میں تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں منشی امیر احمد مینائی، مولوی حکیم شفیق الرحمٰن خاں شفیق، مولانا مفتی سعد اللہ، عبدالرزاق خاں طالب، مولوی محمد عثمان خاں بہادر، کریم اللہ خاں کرم، قاضی نور الحق منعم، مولوی غلام جیلانی رفعت، امام الدین خاں، محمد علی خاں اثر، مولوی جلال الدین احمد خاں، مولوی محمد یوسف خاں اور منشی سید محمد اسمٰعیل حسین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پیش نظر کتاب 'رامپور کے فارسی گو شعرا' میں مولفہ نے ایک مقدمہ شامل کیا ہے جسے انھوں نے خود لکھا ہے۔ یہ مقدمہ کتاب کی اہمیت وافادیت کو دو چند کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس مقدمہ میں فارسی شاعری کا عہد بعہد اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ اولاً ہندوستان میں فارسی شاعری کے حوالے سے تاریخی گفتگو کی گئی ہے، اس کے بعد رامپور میں فارسی شاعری کی روایت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقدمہ کو پڑھ کر رامپور میں فارسی شاعری کی پوری روایت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ فارسی شاعری کے تعلق سے تفصیلی وتحقیقی مضمون یا مقدمہ کا اضافہ اس لیے ضروری تھا کہ اس کے بغیر رامپور کے فارسی گو شعرا پر گفتگو تشنہ محسوس ہوتی۔ اردو زبان وادب کے حوالے سے رامپور کی خدمات تو سبھی کے سامنے ہیں، لیکن فارسی شاعری کے تعلق سے رامپور کی خدمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے، اس کا اندازہ اس کتاب کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کی تاریخ وروایت رامپور کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ یقیناً یہ مولفہ کا بڑا کارنامہ ہے کہ وہ رامپور کی فارسی شاعری کو سامنے لائیں، وہ اس کے لیے مبارکباد کی مستحق ہیں۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے شائع کیا ہے جو اردو کا ایک موقر اور مستند ادارہ ہے۔ ٹائٹل، کاغذ اور طباعت کے اعتبار سے بھی کتاب دیدہ زیب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

اذکار ادب (اردو ادب کا عالمی منظر نامہ)

مصنف: ایم۔ نصر اللہ نصر
صفحات: 480 قیمت: 400 روپے، اشاعت 2020
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس، دہلی 6
مبصر: عظیم انصاری، رحمت منزل 20/2-B، روڈ بی ایل نمبر 5،
پوسٹ: جگتدل 24، (مغربی بنگال)

دنیا کا کوئی بھی ادب ہو وہ تحقیق و تنقید کے بغیر ادھورا ہے تنقید و تحقیق سے رشتہ براہ راست تخلیق سے ہے۔ دونوں لازم و ملزوم بھی ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور محال ہے۔ دونوں میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ تنقید کے بغیر تحقیق کا کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ادب میں جب بھی کوئی تحقیق کے لیے قدم بڑھاتا ہے اسے تنقید کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کوئی بھی محقق تنقیدی شعور کے بغیر تحقیق کے میدان میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اچھا محقق وہی ہے جو اپنی تحقیق پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے اور اپنی کمزوریوں کو اسی کے مطابق دور کرتے ہوئے اپنی متعینہ سمت کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور اس طرح وہ اپنے تحقیقی کام کو مستند بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اس کے لیے اسے کافی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ ساتھ ہی اپنے بالغ ذہن سے مشاہدات و تجربات کو بروئے کار لا کر اسے اپنی سمت اور منزل کو طے کرنا پڑتا ہے۔

ایم۔ نصر اللہ نصر ان تمام کوائف سے مکمل طور پر واقف ہیں۔ لہٰذا 'اذکار ادب' میں شامل نگارشات میں ان کی بالغ نظری پوری طرح نمایاں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر مشتاق انجم، معروف شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور کامیاب مترجم ان کی صلاحیتوں کو تسلیم کرتے ہیں ان کو ایک خوش فکر شاعر کے ساتھ ساتھ شگفتہ و شیریں نثر نگار بھی گردانتے ہیں۔ پروفیسر علیم اللہ حالی بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ''اگر ایک طرف ان کی شاعری جذب و کیف سے مملو ہے تو دوسری طرف یہ تنقیدی مقالات علمی اطلاعات، عالمانہ تجربات اور سنجیدہ تحقیقی نکات سے بھرے پڑے ہیں۔''

ایم۔ نصر اللہ نصر واقعی شاعری و نثری ادب میں مجموعی طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایسا بالغ نظر شاعر جب تحقیق و تنقید کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو وہ اپنی تلاش کو ایک اچھے مقام تک پہنچانے کے لیے مصمم ارادہ کر لیتا ہے۔ مذکورہ کتاب 'اذکار ادب' میں اردو ادب کا عالمی منظر نامہ پیش کیا گیا ہے جس میں کل 61 مضامین شامل ہیں۔ یہ نصر کی تنقیدی و تحقیقی نگارشات کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ اس میں موصوف کی محنت و لگن اور تنقیدی بصیرت کا اشارہ ملتا ہے۔ نصر نے اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب شہر مکالمہ ہے جس میں دو مضامین ہیں، دوسرا باب 'سخن زار' ہے جس میں 33 مضامین ہیں۔ تیسرا باب جہان افسانہ ہے جس میں 8 مضامین شامل ہیں۔ چوتھا باب 'ناول نگر' ہے اس میں بھی 8 مضامین ہیں۔ پانچواں باب 'چوپال' (تحقیق و تنقید) ہے جس میں 7 مضامین شامل ہیں اور چھٹا باب 'کولاژ' ہے جس میں 3 مضامین زینت قرطاس ہیں۔ ان مضامین کو مختلف ابواب میں تقسیم کرنے کا سبب یہ ہے کہ ہر باب میں کسی نہ کسی مخصوص صنف ادب کے تعلق سے گفتگو موجود ہے۔

شہر مکالمہ میں دو مضامین ہیں ایک 'ساحر میرے خوابوں میں' اور دوسرا 'منٹو سے مکالمہ بعد از مرگ'۔ پہلے مضمون میں نصر نے جہاں ساحر کی ابتدائی زندگی اور ان کے آباو اجداد کے بارے میں ذکر کیا ہے، وہیں ان کی شاعری، عشق کی داستان اور اشتراکی نظریات کا بھی بھرپور احاطہ کیا ہے۔ مکالمے کا انداز اور جملوں کی شگفتگی سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ نصر کی تحریر میں روانی اور برجستگی ہے۔ سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ پورے مضمون میں ان کا خلاقانہ ذہن نمایاں ہے۔ مکالمے کے آخر میں انھوں نے ساحر سے متعلق اپنے افکار و نظریات کو واضح کر دیا ہے۔ انھوں نے ساحر سے وہ سارے راز کھلوا دیے ہیں جس کی خواہش ایک قاری کو ہوسکتی ہے۔ اس مکالمے کو پڑھ کر قاری ساحر کی پوری زندگی سے آشنا ہوسکتا ہے۔

دوسرے مضمون میں نصر نے جہاں منٹو کی ابتدائی زندگی، صحافتی دنیا میں ان کی آمد اور ازدواجی زندگی کا ذکر کیا ہے وہیں انھوں نے ان کی خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری پر بھی تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ نیز انھوں نے ادب نگاری سے متعلق ان کی آرا کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس مکالمے میں انھوں نے منٹو کی فحش نگاری پر کھل کر بحث کی ہے اور منٹو کے نظریات کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہاں ہمیں نصر کی تنقیدی صلاحیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ انھوں نے اس مکالمے کے ذریعہ اپنی ذہانت اور فکری بصیرت کا عمدہ نقش چھوڑا ہے۔ دوسرے باب میں اردو غزل کا جدید عالمی منظر نامہ پیش کیا ہے اور مختلف شعرا کے کلام کے بارے میں اپنی رائے دی ہے۔ قدیم شعرا کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے آج اکیسویں صدی کی اردو دنیا کے شعرائے کرام کی شاعری کے تعلق سے اپنی بصیرت افروز رائے دی ہے۔ جس میں بیرون ملک کے شعرا کے تذکرے بھی شامل ہیں۔

تیسرے باب میں افسانہ نگاری کے فن کے مختلف گوشوں اور ان کی امتیازی خصوصیات کا بطریق احسن احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے افسانے کی محدودیت، اختصار، وحدت زمان و مکان، وحدت کردار، موضوعات کی عمدگی، دلچسپی کا عنصر، مربوط انداز، مشاہدے کا عنصر، نظم و ضبط، کردار نگاری، منظر کشی، مقصدیت، افسانے کے مراحل اور اجزا، موضوع کا انتخاب، عنوان، پلاٹ، مکالمے، کشمکش، نقطۂ عروج اور اختتام افسانہ کو مد نظر رکھ کر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور زبان و بیان کی شگفتگی سے قاری کو باندھے رکھنے میں کامیاب ہیں۔

چوتھے باب 'ناول نگر' میں معروف ناول نگاروں کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ادب کے شائقین اور قارئین کے لیے ڈھیر سارے لوازمات مہیا کیے ہیں جن کے سہارے وہ اپنی ایک الگ رائے قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔ پانچویں باب چوپال میں سات مضامین شامل ہیں ان میں ڈاکٹر پروفیسر کرامت علی کرامت، خالد محمود، ڈاکٹر شکیل اختر، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر سرور کریم کی کاوشوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تجزیات کو پڑھنے سے نصر کے اعلیٰ تنقیدی ذوق کا پتا چلتا ہے

چھٹے اور آخری باب 'کولاژ' میں تین مضامین زینت قرطاس ہیں۔ پہلے مضمون میں قاضی مشتاق احمد کی ڈراما نگاری کے امتیازی نقوش کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسرے مضمون میں رؤف خوشتر کی ظرافت نگاری کا بھی سلیقے سے جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے طرز طنز و مزاح نگاری پر اچھی بحث کی گئی ہے۔ تیسرا مضمون احسن امام احسن بحیثیت نثر نگار بھی خوب ہے جس میں موصوف کی نثر نگاری کا اچھا خاصا محاسبہ پیش کیا گیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے 'اذکار ادب' اردو کا عالمی منظر نامہ ہمارے سامنے لانے میں کامیاب ہے جس سے نصر کی ذہنی بالیدگی اور بالغ نظری سے ہمیں کما حقہ واقفیت ہوتی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے جن کو بروئے کار لا کر وہ اپنے مضامین کو سنوارتے ہیں۔ ان کی فکر میں گہرائی اور گیرائی دونوں ہے۔ انداز سیدھا سادہ ہے مگر شعریت اور موسیقیت کی موجودگی سے قرأت میں بڑا لطف آتا ہے۔ یہی وہ اوصاف ہیں جو نثری ادب میں ان کو اپنے ہمعصروں میں امتیازی حیثیت عطا کرتے ہیں۔

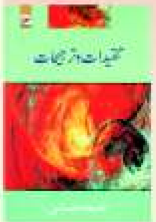

تنقیدات وترجیحات

مئولفہ: ناصحہ عثمانی

صفحات: 244، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: محمد شارب ضیا رحمانی

آر 85، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

'تنقیدات وترجیحات' ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ناصحہ عثمانی نے مختلف سمیناروں اور ادبی اجلاسوں میں پیش کیے ہیں یا مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ کچھ مضامین وہ ہیں جنھیں طالبات کے استفادے کے لیے حمیدیہ گرلس ڈگری کالج الہ آباد میں دوران تدریس تحریر کیا گیا ہے۔ ان میں زیادہ تر مطبوعہ مضامین ہیں۔ یہ نثر اور شعر دونوں کی تنقید و جائزے پر مبنی ہیں۔ 'تنقیدات وترجیحات' کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں میر، جوہر، مجاز، اکبر، ناصر کاظمی، بیاض عاصی، مرزا غالب اور ظفر کی شاعری پر مختلف زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ میر کے تصور حیات پر ان کے اشعار کے ذریعے مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ 'جوہر کی شاعرانہ خصوصیات' کا بالتفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔ عثمانی نے جوہر کی شاعری کا صحیح تجزیہ نہ کیے جانے کا شکوہ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ان کی شاعری کا سیاسی نقطہ نظر سے تجزیہ کیا گیا اور ان کی شخصیت کا اصل جوہر جنگ آزادی اور خلافت تحریک کو مانا گیا، اسی لیے سارے پہلو کھل کر سامنے نہیں آسکے۔ چنانچہ ناصحہ عثمانی، جوہر کے شعری اوصاف کا مزید باریک بینی سے جائزہ لینے کی ضرورت پر زور دیتی ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ اگر جوہر کی پوری توجہ شاعری پر ہوتی تو بڑے شاعروں میں شمار کیے جاتے۔ مضمون نگار نے جوہر کی شاعری میں استاد شعرا کے اثرات ڈھونڈے ہیں اور مثال پیش کرتے ہوئے میر، درد، غالب کے اشعار کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔

'اکبرالہ آبادی' کی غزلیہ شاعری' میں عثمانی نے واضح کیا ہے کہ گرچہ اکبر کا تعارف طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے حوالے سے ہے، لیکن روایتی انداز میں بھی وہ کہیں پیچھے نہیں ہیں۔ غالب اور پہلی جنگ آزادی پر گفتگو کرتے ہوئے عثمانی نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے سماجی وسیاسی حالات کا غالب پر کیا اثر رہا۔ مضمون نگار نے غالب کے خطوط کو سلطنت مغلیہ کے زوال کی تاریخی دستاویز قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی عثمانی نے، متعدد نثری اور شعری حوالوں کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ غالب صحیح معنوں میں ملک کے حالات سے فکر مند تھے اور دلی کی بربادی پر بے انتہا مغموم تھے، لیکن انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ شاید ضروریات زندگی نے غالب کو اقتدار کی مدح سرائی پر مجبور کیا۔ ایک مضمون میں مضمون نگار نے 'بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں مذہبی رجحانات' تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور رسمی شاعری کو عشقیہ فضا سے نکال کر اخلاقی بلندیوں سے روشناس کرانے پر ظفر کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اقبال کے حوالے سے جنگ آزادی میں اردو ادب کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس میں حسرت، جوہر، لیاقت علی، اشفاق اللہ خان کی انقلابی شاعری پر اجمالی گفتگو اور اقبال کے اشعار وخطاب پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ نثر پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں اردو داستان اور موجودہ تہذیب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تصانیف کے حوالے سے تہذیبی المیہ کو بیان کیا گیا ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں عورتوں کے سماجی اور نفسیاتی مسائل پر غور کیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے پریم چند کے میدان عمل کے اقتباسات کے ذریعے بتانے کی کوشش کی ہے کہ:

''جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے، ناول نگار کے نظریے گاندھی جی کے نظریات سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ گاؤں کو وہ ہندوستانیوں کا اصل میدان عمل سمجھتے ہیں۔'' (ص 162)

اس کے علاوہ اس حصے میں مقدمہ شعر وشاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ غالب کی خطوط نگاری پر بحث کی گئی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر کی بدلتی ادبی روایت پر منشی نول کشور کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ مطبع نول کشور کی خدمات پر سرسری روشنی ڈالتے ہوئے انیسویں صدی میں اس کے غیر معمولی ادبی کارناموں کو سراہا گیا ہے۔ اس ضمن میں اردو تراجم، مخطوطوں اور نایاب کتب کی اشاعت کا حوالہ دیا گیا ہے اور مطبع کی مقبول کتابوں کی مختصر فہرست بھی پیش کی گئی ہے۔

تیسرے حصے میں اقبال کی نظم 'شمع وشاعر' کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ پھر حسن نعیم کی اہم نظم 'انقلاب آئے گا دوست' کی معنویت ثابت کی گئی ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے معرکۃ الآراء ڈرامے 'ضحاک' کا تنقیدی مطالعہ بھی گراں قدر ہے۔ سجاد ظہیر کے معروف ناول 'لندن کی ایک رات' میں لندن میں زیر تعلیم طلبہ کی زندگی بلکہ نوجوان طبقے کے احوال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناصحہ عثمانی نے رشید حسن خان کے باغ وبہار کے نسخے کی افادیت اور تحقیقی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ نسخہ، تا حال کیوں اہم مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر قمر الہدی فریدی کی مرتبہ طلسم ہوشربا کی تلخیص پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے جس میں مضمون نگار نے بتایا ہے کہ اسے طلسم ہوشربا کی تلخیص نہیں بلکہ جلد اول کی تلخیص کہنا چاہیے بلکہ تلخیص کہنے پر ہی اعتراض کرتے ہوئے قصہ کا مسلسل انتخاب قرار دینے کی پیروی کی ہے۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

''کیونکہ ہزار صفحات پر مشتمل جلد جس کے مصنف محمد حسین جاہ ہیں، کو تقریباً 100 صفحات میں الگ الگ واقعات کو منتخب کر کے اس طرح پیش کیا ہے کہ قصہ گوئی کا تسلسل کہیں بھی منقطع نہیں ہونے پایا ہے اور قصہ میں کہیں کچھ حذف کیا گیا ہے، اس کا شائبہ بھی نہیں نہیں ہوتا۔'' (ص 242)

مضمون نگار نے افادیت بیان کرتے ہوئے اس نسخے کو طلبہ کے لیے قیمتی سرمایہ اور تنقیدی وتحقیقی میدان میں قابل قدر اضافہ بتایا ہے۔ عثمانی نے طلسم ہوشربا کی بھی باقی ماندہ جلدوں کے انتخاب کی بھی خواہش ظاہر کی ہے تاکہ اسے اردو شائقین تک بآسانی پہنچایا جانا ممکن ہو اور اس اہم ادبی سرمائے کی حفاظت ہو سکے۔

کتاب میں بعض اقتباسات کے حوالے تو پیش کیے گئے ہیں، لیکن کچھ حوالے نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ اگر بھی اقتباسات مآخذ اور صفحہ نمبر کے ساتھ درج کیے جاتے تو بہتر ہوتا۔ کہیں کہیں پروف کی غلطی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں یہ چیزیں دیکھ لی جائیں گی۔ مجموعی طور پر ناصحہ عثمانی اپنے دعوے میں درست ہیں کہ انھوں نے نفس مضمون کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ مثبت تنقیدی رویے بھی مضامین کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ الغرض مضامین کا یہ مجموعہ مفید ہے اور طلبہ وریسرچ اسکالروں کے لیے اس میں بہت کچھ معلومات کا سامان بھی ہے۔ کتاب کی قیمت اور طباعت مناسب ہے اور مکتبہ جامعہ دہلی، انجمن ترقی اردو دہلی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، عثمانیہ بک ڈپو کولکاتہ سمیت متعدد مکتبوں میں دستیاب ہے۔

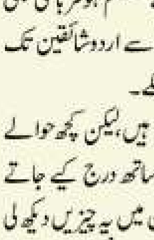

سجاد حیدر یلدرم کا فکر وفن

مصنف: اسود گوہر

صفحات: 260، قیمت: 250

ناشر: اسود گوہر

مبصر: شاہدہ شاہد پی آر ٹی (اردو) نئی دہلی 25

جدید اردو ادب کی تاریخ میں جن شخصیات کو معمار کی حیثیت حاصل ہے ان میں سجاد حیدر یلدرم کا نام بھی شامل ہے۔ انھوں نے اردو ادب بطور خاص تخلیقی نثر کو

ثروت مند بنانے کی کوشش کی۔ گزشتہ صدی کی ابتدا میں انھوں نے افسانہ نگاری اور انشائیہ نگاری کے میدان میں جو کارنامے انجام دیے ان کے ذکر کے بغیر اردو نثر کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی ہے۔ اس وقت میرے سامنے اسود گوہر کی تنقیدی و تحقیقی کتاب 'سجاد حیدر یلدرم کا فکر وفن' ہے۔ جس میں سجاد حیدر یلدرم کی شخصیت اور فکر وفن کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کا نام سنتے ہی ہمارا ذہن ایک خاص قسم کی رومان انگیز نثر کی طرف جاتا ہے۔ اردو شعر وادب کی تاریخ میں بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ اسی قسم کی رومانی اور جذباتی تخلیقات وتراجم کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ اس عہد کا ایک نمایاں ترین حوالہ سجاد حیدر یلدرم کی تحریریں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں انھیں وہ توجہ نہیں دی جاسکی جس کا تقاضہ ان کی شخصیت اور تحریریں کرتی ہیں۔ اردو کے افسانوی ادب بالخصوص افسانہ اور انشائیہ پر گفتگو کرتے ہوئے ان کا ذکر سرسری طور پر کیا جاتا رہا ہے لیکن باضابطہ انھیں موضوع بنانے کی مثال کم ملتی ہے۔ اسود گوہر کی کتاب سے قاری سجاد حیدر یلدرم کو کلیت میں دیکھ سکتا ہے۔

کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے، ابتدا میں معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی اور منفرد فکشن نگار نور الحسنین کی تحریریں بطور تمہید وتعارف شامل ہیں۔ باب اول سے پہلے اسود گوہر کا پیش لفظ موجود ہے، جس میں انھوں نے کتاب اور سجاد حیدر یلدرم سے متعلق کچھ بنیادی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلا باب 'اردو نثر کی روایت میں یلدرم کی انفرادیت' ہے۔ اس میں اردو نثر کے آغاز وارتقا پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر اس روایت میں سجاد حیدر یلدرم کی نثر نگاری کے امتیازات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سجاد حیدر یلدرم نے ایک خاص قسم کے اسلوب کی طرح ڈالی لیکن وہ طرز انشا وقت کے ساتھ اپنی آب وتاب کھو چکی ہے البتہ اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کا دوسرا باب 'سجاد حیدر یلدرم کی زندگی' ہے۔ اس باب میں اسود گوہر نے سجاد حیدر یلدرم کی پیدائش، خاندانی پس منظر، بچپن، تعلیم، دوران تعلیم دیگر دلچسپیاں، ملازمت، شادی، اولادیں، ادبی زندگی کی شروعات، تصانیف، افکار وخیالات، سفر، وفات جیسے ذیلی عنوانات کے تحت سجاد حیدر یلدرم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اسی باب میں 'شخصیت' کا عنوان بھی ملتا ہے جس کے تحت سجاد حیدر یلدرم کی شخصیت اور مزاج واطوار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شخصیت کے ذیل میں سراپا، لباس، مزاج، مشغلہ، عادت واطوار اور دوست احباب جیسے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ اس باب کے مطالعے سے سجاد حیدر یلدرم کی شخصیت قاری پر واضح ہوجاتی ہے۔ اسود گوہر نے اپنی باتوں کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس سے ان کے مطالعے اور ذہانت کا علم ہوتا ہے۔ کتاب کا تیسرا باب 'خیالستان' کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کی شناخت اسی کتاب کے مشمولات سے قائم ہے۔ مقالہ نگار تجزیاتی مطالعے کے دوران باریک بینی اور ژرف نگاہی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس حصے کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر تنقیدی صلاحیت موجود ہے جو وقت کے ساتھ اور بھی بہتر ہوسکتی ہے۔ کتاب کے چوتھا حصے کو تحقیق اور تنقید کہا جاسکتا ہے۔ اس کا عنوان 'یلدرم کی دیگر ادبی کاوشیں' ہے۔ اس میں یلدرم کی ناول نگاری، یلدرم کی ڈرامہ نگاری، یلدرم کی رپورتاژ نگاری، یلدرم کی خطوط نگاری اور یلدرم کی شاعری پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر تحریریں اسود گوہر کی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔

غالباً یہ پہلا موقع ہے جب سجاد حیدر یلدرم کی تمام تخلیقات کو ایک ساتھ پڑھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گو کہ یہ کتاب ایم فل کا مقالہ ہے لیکن محدود وقت میں اسود گوہر نے جس ذہانت اور سنجیدگی سے سجاد حیدر یلدرم کی تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے اور اخذ نتائج کے مرحلے سے گزرتے ہوئے تعین قدر کی کاوش کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ ایم فل کی سطح پر ایسے مقالے کم ہی لکھے جاتے ہیں۔ امید ہے یہ کتاب سجاد حیدر یلدرم کی تفہیم کے نئے در وا کرے گی۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔

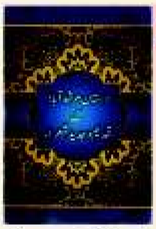

دبستان مرشد آباد کے قدیم و جدید شعرا

مصنف: سیدہ جنیفر رضوی

صفحات 240، قیمت: 129، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: عفان پبلی کیشنز، کولکاتا

مبصر: اطہر آفاق مرزا اطہر مرشد آبادی

اردو زبان وادب کا قدیم مرکز مرشد آباد اپنے سیاسی، ادبی، ثقافتی اور معاشی میدان میں کبھی شہرۂ آفاق رہا ہے۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے تو اس شہر کو بڑی اہمیت حاصل ہے مگر ادبی میدان میں بھی یہ شہر شعر وادب کا ماہ تاباں تھا اس نے وقت کے ستم اتنے جھیلے کہ اس کی چاندنی کالی رات میں بدل گئی۔ اس شہر کی ادبی شان آہستہ آہستہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو کر رہ گئی۔ ادب وثقافت کا یہ تابندہ ستارہ قرنوں تک گمنامی کے بادلوں میں چھپا رہا۔

وقت نے کروٹ بدلی اور زبان وادب کے چند پرستار اس کے منظر نامے پر ظاہر ہوئے اور انھوں نے مرشد آباد کو موضوع بنا کر یہاں کی ادبی خدمات کو منظر عام پر لانے کی مہم شروع کی۔ ان میں پروفیسر عبدالرؤف، ڈاکٹر رضا علی خان، ڈاکٹر نعیم انیس، ڈاکٹر عمر غزالی، ڈاکٹر شکیل احمد خان، اصغر انیس کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کی محنت کا نتیجہ ہے کہ آج دبستان مرشد آباد کا ماضی لوگوں کے سامنے ہے۔ اس فہرست میں اب سیدہ جنیفر رضوی کا نام بھی شامل ہوگیا ہے۔

سیدہ جنیفر رضوی مرشد آباد سے تعلق رکھتی ہیں۔ مرشد آباد کے اردو ادب کے حوالے سے ان کے مضامین اکثر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی زیر نظر کتاب 'مرشد آباد کے قدیم وجدید شعرا مرشد آباد کی ادبی تاریخ کے حوالے سے' ایک شاندار کام ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ نے مرشد آباد کے چند نامور شعرا ماضی تا حال کے حالات زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ان شعرا کا مفصل حال بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ جن شعرا کا تذکرہ سیدہ جنیفر رضوی صاحبہ نے کیا ہے ان کا بیان ڈاکٹر سید رضا علی خان اور سید اصغر انیس کی کتابوں میں پہلے بھی آچکا ہے۔ جنیفر رضوی نے اپنے طور سے شعرا کے حالات لکھنے کی جو کوشش کی ہے وہ ان کا منفرد انداز ہے۔ انھوں نے بڑے دلچسپ طریقے سے تحریر کیا ہے۔ شخصیت کے اعتبار سے الفاظ اور جملوں کی موزونیت کا بڑا خیال رکھا ہے۔

کتاب کا نام 'مرشد آباد کے قدیم وجدا شعرا' ہے مگر اس میں صرف 25 شعرا کا ذکر ہے بلکہ یوں کہوں کہ انھوں نے 25 شعرا کا انتخاب کیا ہے۔ دبستان مرشد آباد کے 25 پھولوں کا ایک گلدستہ ترتیب دیا ہے جبکہ دبستان مرشد آباد کے حوالے سے سو سے بھی زیادہ شعرا کا نام آتا ہے جن میں کئی کا شمار صاحب دیوان اور اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔ ان میں سید فتح علی مرزا، بیدل، سید نواب جانی مرزا محشر، سید شباہت علی مرزا شباہت، سید اسد علی مرزا ثریا، نواب محمد فیاض علی خاں داؤد، کیکاؤس، مرزا اکمل، حسن عسکری، مرزا شوکت، سید ابرار حسین ضو کے نام قابل ذکر ہیں۔ اصغر انیس نے اپنی کتاب میں لگ بھگ سو شعرا کا مفصل احوال درج کیا ہے۔

بہرحال سیدہ جنیفر رضوی نے اپنی اس کتاب میں جن شعرا کو جگہ دی ہے وہ سبھی دبستان مرشدآباد کے باکمال شعرا ہیں۔ انھوں نے ان شعرا کے حالات کو قلمبند کرنے میں بڑی جانفشانی سے کام کیا ہے اور بڑے منصفانہ طریقے سے ان کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے۔ آفاق مرشدآبادی کے حوالے سے ایک اہم بات ان سے چھوٹ گئی ہے، وہ یہ کہ بیدل مرشدآبادی کے بعد آفاق دوسرے شاعر ہیں جن کا مجموعہ کلام 'حاصل زیست' کے نام سے مغربی بنگال اردو اکادمی نے 2013 میں شائع کیا اور پھر مغربی بنگال اکادمی نے انھیں 2016 کے پرویز شاہدی اوارڈ سے نوازا۔ آفاق مرشدآباد کے واحد شاعر ہیں جن کو ریاستی سطح پر کسی بڑے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

خودنوشت

میں، میری یادیں، میرے سفر

مصنف: کندن لال کندن

صفحات: 209، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: صبا انجم

B-221 گلی نمبر 11 مکند پور، پارٹ 1، دہلی 42

یہ ڈاکٹر کندن لال کندن کی خودنوشت ہے جس میں انھوں نے بٹوارہ سے قبل کے ہندوستان اور بٹوارہ کے بعد کے نئے ہندوستان کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی اس کاوش کا انتساب شہیدوں کے نام کیا ہے۔ کتاب کا نام 'میں، میری یادیں، میرے سفر' انھوں نے جس انداز سے رکھا ہے اسے تین حصوں میں رکھا جاسکتا ہے 'میں' یعنی وہ اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔ 'میری یادیں' اس میں وہ اپنے گزرے ہوئے لمحات کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا بچپن کہاں اور کیسے گزرا ہے اور 'میرے سفر' جس میں وہ اپنے اسفار کو قلم بند کرنا چاہتے ہیں۔ دو صفحے پر مبنی ایک طویل نظم کے ذریعہ انھوں نے عہد طفلی سے لے کر جوانی کی چھیڑخوانی اور فرصت کے لمحات میں بیت وبازی وشعرخوانی نیز ہند کی آزاد ہونے کی کہانی اور سر پر آپڑی بلائے آسمانی وخون کی ندیوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ذیل میں دو اشعار جو کتاب کی وجہ تسمیہ بھی بن سکتے ہیں، دیکھیں۔

جستہ جستہ ان کا اب کرتا بیاں ہوں میں یہاں — پر سکوں ہوجائے ہر دل لبھانی یاد ہے
لکھ رہا ہوں مختصر احوال کندن اب یہاں — حق پہ مبنی اب تلک جو کچھ زبانی یاد ہے

انھوں نے بعنوان 'پرکھوں کے وطن کے بارے میں اجمالی ذکر' کے تحت پاکستان کا اس وقت کا نقشہ اور کون کون سے لوگ یعنی کون کون سے قبیلے آباد تھے جیسے کھتران قبیلہ، قیصرانی قبیلہ، لنڈ قبیلہ، کھوسا قبیلہ، لغاری قبیلہ، گرچانی قبیلہ، دریشک قبیلہ، مزاری قبیلہ، بزدار قبیلہ، نکانی قبیلہ وغیرہ کا مختصر تعارف کرایا ہے جو دستاویزی ہے۔

عام طور پر لوگ خودنوشت میں ایام طفلی کے حالات لکھتے ہوئے اپنی شیخی بگھارتے ہیں لیکن کندن لال جی کو یہ کہنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں بچپن میں شرارتی تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''میں بچپن میں شرارتی تو تھا ہی مگر اسکول کے کھیل کود میں بھی سب سے آگے رہتا تھا'' ص 27۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ جو لوگ شرارتی ہوتے ہیں وہ ذہین بھی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے اپنے بچپن کے زمانے کے اسکول کے لڑکوں کی دلچسپی اور خالی وقت میں اپنی مشغولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اسکولوں میں اکثر طالب علم فرصت کے وقت بیت بازی کا مقابلہ کرتے تھے'' (ص 34) ان بچوں کی ادبی دلچسپی اس حد تک تھی کہ ''جب کسی رشتے دار یا پڑوس میں کسی کی شادی ہوتی اور برات آس پاس کے دوسرے گاؤں میں جاتی تھی تو براتی اونٹوں پر کجاؤں میں بیٹھ جاتے تھے۔ اونٹ بڑی لمبی قطار میں چلتے تھے آگے پیچھے والے اونٹ پر بیٹھے بچے بیت بازی کا مقابلہ شروع کر دیتے تھے۔ ہچکولے کھاتے بیت بازی کرتے سفر بھی کٹ جاتا تھا۔ ذہنی تشفی ہوجاتی تھی اس طرح ادبی کتابوں کے بہت سے اشعار بھی ازبر ہوجاتے تھے۔'' (ص 35)۔

ڈاکٹر کندن نے اپنی خودنوشت میں بٹوارے کے وقت کے حالات کو قلم بند کیا ہے اور اس کے لیے 'کوٹ قیصرانی اور بلوچستان کو خیرباد' کا عنوان دیا ہے۔ اس معنی کر یہ کتاب اہم ہوجاتی ہے کہ اس کے مصنف چشم دید گواہ ہیں اور آنکھوں دیکھا حال انھوں نے اپنی اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بٹوارہ تو زمین جائداد کا ہوتا ہے آبادیوں کا بٹوارہ میں نے کسی اپنے بزرگ سے بھی نہیں سنا۔ سیاسی لیڈروں کی عقل کہاں گھاس چرنے گئی تھی کہ ہندوستان کا بٹوارہ تسلیم کرلیا۔

ایک عنوان '1948 سے 31 مارچ 1994 کے حالات' ہے، اس میں انھوں نے اپنی نوکری، شادی اور مکان کے حالات کو خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک عنوان یہ بنایا '1959 سے 31 مارچ 1994 کے حالات' اس میں دوبارہ پڑھائی شروع کرنے کے اسباب اور ادیب سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا سفر بالتفصیل بیان کیا ہے۔ موصوف نے دہلی کالج اجمیری گیٹ میں B.A میں داخلہ لے کر PhD کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیوں اور اپنے اساتذہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

'جامع مسجد پوسٹ آفس میں کچھ عجیب وغریب ملاقاتیں' مصنف جامع مسجد دہلی پوسٹ آفس میں بحیثیت پوسٹ ماسٹر تھے۔ انھوں نے اس عنوان کے تحت ایک شخص کا ذکر کیا گیا ہے جس کی ماں تقسیم ہند کے وقت اپنے خاندان سے بچھڑ گئی تھی۔ اس کی دیرینہ خواہش پوری کرنے میں انھوں نے کافی مدد کی اور اس کے لیے پورے ہندوستان میں اشتہار دیا۔ تلاش بسیار کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی ایک فیملی اسی کے محلے میں رہتی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے 'پاکستان کا پہلا یادگاری سفر' پھر پاکستان کا دوسرا سفر اسی طرح تیسرا اور پھر چوتھا سفر کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد 'ہندوستان کے طول وعرض کی سیر وسیاحت کا اجمالی ذکر' کا عنوان دے کر جموں کشمیر، گوا، اوٹی وغیرہ مقامات کی مختصر روداد سیاحت بیان کی ہے۔ آخر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے منعقد 'پانچویں عالمی اردو کانفرنس (24 مارچ تا 26 مارچ 2018)' میں پڑھے گئے مقالہ بعنوان 'رباعیات میں عالمی مسائل' کو شامل کیا ہے جو کافی اہم مضمون ہے۔

آخر میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ موصوف نہ صرف اس کے کتاب کے مصنف ہیں بلکہ ان کی دوسری کئی کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں جن میں سے چند کے نام مندرجہ ذیل ہیں: ارمغان کندن، رباعیات اختر، جنوبی وشمالی ہند کی تاریخی مثنویاں، ارمغان عروض، چون آہنگوں میں رباعیات کندن، رباعیات وماہیے اور ماہیے کی ہیئت، معراج فن، کندن پارے وغیرہ۔

خاکہ

پورے، آدھے، ادھورے

مصنف: عابد سہیل

صفحات: 232، قیمت: 131

ناشر: عابد سہیل

مبصر: عبدالسمیع، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

عابد سہیل کی بنیادی شناخت افسانہ نگار کی ہے، لیکن انھوں نے صحافت، ادبی صحافت، تراجم اور تنقید کے ساتھ خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ خاکوں پر مشتمل ان

کی اولین تصنیف 'کھلی کتاب' نے انھیں ادبی دنیا میں بطور مستحکم خاکہ نگار متعارف کرایا۔ اس کتاب میں 14 شخصیات اور 'اولڈ انڈیا کافی ہاؤس' کے قلمی چہرے شامل تھے۔ ادبی دنیا میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی۔ خود عابد سہیل نے اس کتاب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے سامنے ان کے خاکوں کی دوسری اور آخری کتاب 'پورے، آدھے، ادھورے' ہے، اس کے پیش لفظ میں وہ اپنی خاکہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں: ''برسوں پہلے، مجنوں گورکھپوری نے انجمن کے ایک جلسے میں کہا تھا کہ موضوع مصنف کے ذہن میں واضح نہ ہو تو زبان گنجلک ہو جاتی ہے۔ یہ بات سولہ آنے صحیح تو اسی وقت معلوم ہوئی تھی لیکن ثابت 'کھلی کتاب' کی اشاعت کے وقت ہوئی۔ میرے پاس خاکہ نگاری کے بارے میں لکھنے کو تو کچھ خاص نہیں تھا، سو میں نے 'بقراطیت' سے کام چلانا چاہا۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا مجھے میری 'بقراطیت' لے ڈوبی اور میرے 'قائم' کیے ہوئے اصول اپنا سا منھ لے کے رہ گئے۔ خیر یہ تو ہونا ہی تھا لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ تنقید انتہائی مدلل اور نرم الفاظ میں کی گئی تھی، کچھ اس طرح کہ پڑھ کر خوشی ہوئی اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔'' عابد سہیل نے یہاں اپنے تعلق سے جس پیرائے میں گفتگو کی ہے وہی شگفتگی اس کتاب کے بیشتر خاکوں میں نظر آتی ہے۔

کتاب میں پیش لفظ کے علاوہ 25 خاکے شامل ہیں۔ پیش لفظ گو کہ اس کتاب کے بارے میں لکھی گئی تعارفی تحریر ہے لیکن اسے بھی خاکہ سمجھنا چاہیے۔ خاکہ میں اس کتاب کے محرک، عابد سہیل کے صحافی اور ادیب دوست حسن واصف عثمانی کا مختصر مگر دلچسپ خاکہ بھی ہے، اس طرح یہ کتاب اول تا آخر خاکوں پر مشتمل ہے۔ اشخاص کے خاکوں کے ساتھ اس کتاب میں ادبی ماہنامہ 'کتاب' کا خاکہ بھی شامل ہے۔ ان خاکوں کی اہم اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں صرف ادبی شخصیات سے متعلق خاکے نہیں ہیں بلکہ عابد سہیل نے حسن واصف عثمانی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ایسے احباب کے خاکے بھی لکھے ہیں جو لکھنؤ کے ادبی، علمی اور صحافتی حلقے میں استاد، قاری اور باذوق افراد کی حیثیت رکھتے تھے۔ کتاب کے مطالعے کے دوران لکھنؤ کی ادبی، تہذیبی اور صحافتی زندگی کی چلتی پھرتی تصویر نظر آنے لگتی ہے۔ اس لیے ان خاکوں کو محض خاکے کی طرح پڑھنا ممکن نہیں رہ پاتا۔ عابد سہیل کو پیکر تراشی کا ہنر معلوم ہے، نیز قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے کا سلیقہ وہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ وقت بدل چکا ہے اور ان خاکوں میں موجود زندگی بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔ وہ خود اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ 'پورے آدھے، ادھورے' شاید ویسی کتاب نہیں جیسی 'کھلی کتاب' تھی۔ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ اچھا برا پہلے جیسا لکھ لیتا تھا ویسا بھی اب بس میں نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن ایک سبب اور بھی ہے۔ اب شاید ایسا کچھ، جس کے لیے جان کی بازی لگائی جائے یا جیا ہی جائے، بہت تھوڑا بچ رہا ہے۔'' عابد سہیل کے اس بیان میں مایوسی اور ناامیدی سے زیادہ تھکن اور ایک قسم کی بیزاری کا احساس نمایاں ہے۔ جس شخص نے لکھنؤ کی وہ دنیا دیکھی ہو جس میں مسعود حسن رضوی ادیب، احسن فاروقی، عبدالعلیم، احتشام حسین، مجاز، محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، عرفان صدیقی، نیر مسعود، نسیم انہونوی، رام لعل وغیرہ چلتے پھرتے نظر آتے ہوں، جہاں اپنے وقت کے اہم ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی کہکشاں آباد ہو، اس کا رفتہ رفتہ مٹ جانا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ عابد سہیل نے اپنی زندگی جن دوستوں کے درمیان گزاری تھی لکھنؤ ان سے خالی ہو رہا تھا۔ اس ضمن میں خود نوشت 'جو یاد رہا' ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کو بھی اسی تسلسل میں دیکھنا چاہیے۔ عابد سہیل نے اس الٹتی بساط کا تذکرہ جس کرب کے ساتھ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب کیوں ضروری تھی۔ وہ لکھتے ہیں: ''ایسے میں ان خاکوں میں جو کچھ بھی مل پائے اسی پر قناعت کیجیے اور خوش ہو لیجیے کہ اس بساط کی، جو بس پلٹی ہی جانے والی ہے، کچھ جھلکیاں تو مل گئیں۔ بیس پچیس سال نہیں، دس پندرہ سال بعد ہی یہ جھلکیاں بھی شاید شہر کی زندگی سے متعلق سماجی تاریخ کی نئی کتابوں تک میں دیکھنے کو نہ ملیں۔''

کتاب میں جن اشخاص سے متعلق خاکے شامل ہیں ان میں سے بیشتر کو ہم جانتے ہیں لیکن عابد سہیل نے ان کے جن پہلوؤں کو روشن کیا ہے ان سے ہم اب تک ناآشنا تھے۔ سریندر کمار مہرا کا خاکہ منفرد تکنیک میں لکھا گیا ہے، مجھے ذاتی طور پر یہ خاکہ بہت پسند آیا۔ اسی طرح ماہنامہ 'کتاب' کے تعلق سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی اہمیت ادبی بھی ہے اور تاریخی بھی۔ اردو کی ادبی صحافت میں اس رسالہ نے جو معیار اور اصول قائم کیے ان پر سختی کے ساتھ عمل کیا اور جب یہ احساس ہوا کہ رسالہ ان معیارات پر جاری نہیں رہ سکتا تو مفاہمت کے بجائے اس کے اجرا کو روک دیا گیا۔ ترقی پسند فکر اور جدید ادب کی ترجمانی میں 'کتاب' کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

اس کتاب کا مطالعہ دراصل لکھنؤ اور اردو ادب کے ایک عہد کا مطالعہ ہے جس میں شگفتگی بھی ہے، ہمدردی بھی اور ادبی تاریخ بھی۔ یہ کتاب عابد سہیل کی زندگی میں شائع ہونے والی آخری کتاب بھی ہے۔ کتاب کی اشاعت کا اہتمام عرشیہ پبلی کیشنز دہلی نے کیا ہے، سرورق خوبصورت بلکہ دیدہ زیب ہے، مشمولات کتاب اور حسن طباعت کے پیش نظر اس کی قیمت بھی مناسب ہے۔

فکشن

چاندنی کا بدن (ناول و ناولٹ)

مصنفہ: ڈاکٹر جنتی اکرم (علیگ)

صفحات: 248، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: ابن سعید، 168 / حسینی علم، جامعہ نظامیہ، حیدر آباد

اردو فکشن میں ایسے ناول کثیر تعداد میں موجود ہیں جن کا عنوان مشہور شعرا کے کلام سے ماخوذ ہے۔ آگ کا دریا، کارِ جہاں دراز ہے، سلسلۂ روز و شب، میرے بھی صنم خانے، آخری شب کے ہم سفر وغیرہ اردو شاعری سے مستعار لیے گئے ہیں۔ جنتی جہاں کا ناول 'چاندنی کا بدن' بھی اردو کے مشہور شاعر 'بشیر بدر' کے اس شعر سے لیا گیا ہے۔

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایہ ہے
بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

ناول کا پلاٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یونیورسٹی ہر دور میں سماجی اور سیاسی کارکردگی کا مرکز بھی رہی ہے اور علی گڑھ کی تعلیمی اور سیاسی فضا کو تبدیل کرنے کا محور بھی، اس لیے جب بھی کوئی فکشن نگار مسلم یونیورسٹی سے متعلق واقعات بیان کرے گا تو وہ اس کی سیاسی اور سماجی تاریخ اور فضا کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ 'چاندنی کا بدن' میں اس طرح کے واقعات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ناول نگار نے اپنی فکر کی گہرائی اور گیرائی سے ناول میں ایسی فضا قائم کی ہے کہ پڑھنے والا یکے بعد دیگرے ہر ایک واقعے کو فلم کی طرح دیکھتا چلا جاتا ہے۔

خواتین سے متعلق واقعات کو پیش کرنے میں ان کی نسوانی حس قدرے بیدار نظر آتی ہے۔ دور حاضر میں خواتین کے ساتھ ہونے والے صنفی امتیازات اور درندگی کو بھی پس پردہ ناول میں جگہ دی گئی ہے۔ مصنفہ کے اندر فکشن نگاری کی خداداد صلاحیت موجود ہے جس کی وجہ سے وہ قاری کی دلچسپی کو سامنے رکھتے ہوئے کہانی کو جب چاہیں جس طرف چاہیں آسانی سے موڑ دیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ ایک مضبوط پلاٹ ترتیب

دینے میں کامیاب ہو سکی ہیں۔

عام طور پر تخلیق کار اپنی فنی مشاق کو چھوٹے فن پارے کے ساتھ شروع کرتا ہے۔ اس لیے فکشن میں شاذ ہی ایسے تخلیق کار ملتے ہیں جن کا پہلا کارنامہ طویل ہونے کے باوجود فن کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہو۔ مبالغہ سے گریز کرتے ہوئے کہا جائے تو جنتی جہاں کا یہ ناول عصر حاضر میں ایک یونیورسٹی کی فضا کے پس منظر میں سماجی اور سیاسی حالات کا جس طرح احاطہ کرتا ہے وہ اس کے کامیاب پلاٹ کی ضمانت ہے۔ پہلا ناول ہونے کے باوجود واقعات کی ترتیب اور کرداروں کی مداخلت کا تناسب کبھی بھی غیر متوازن نہیں معلوم ہوتا۔

زبان کے لحاظ سے ناول اپنے اندر عام فہم الفاظ اور محاوراتی زبان کو سمیٹے ہوئے ہے۔ علی گڑھ میں اقامتی زندگی گزارنے والے اس زبان سے دوسروں کے مقابلے زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ شفاف اور پرکشش عنوان سے مزین ہونے کے ساتھ اس ناول کا ہر کردار 'جنتی' ہے اور ہر مقام اپنے آپ میں ایک 'جہان' کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے کردار نوجوان نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہر محاذ پر ان کی رائے معاشرے کے نوجوانوں کی رائے سے قطعی طور پر اختلاف نہیں رکھتی۔ لڑکیوں کے مکالمے کے انداز سے ان کی ذاتی زندگی میں انسان دوستی، خلوص، ہمدردی اور رفیقانہ مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ناول میں کرداروں کی تعداد صرف اس قدر ہے جس سے واقعات کا حق ادا کیا جا سکے۔ کرداروں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے قاری مکمل طور پر محظوظ نہیں ہو پاتا اور کرداروں کے نام میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے یہ ناول کردار نگاری کے لحاظ سے بھی کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

ناول کے پہلے جملے سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ناول محض مصوری کو بنیاد بنا کر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ مصنفہ خود اس کے رنگوں میں گھل کر اس کی تصویر میں رنگ بھرنے میں ایک اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ اس لیے ابتدا سے ہی ان کی مداخلت ناول کی فضا کو دلچسپ بنائے رکھتی ہے۔

کل 248 صفحات میں سے 201 صفحات پر ناول کا کینوس پھیلا ہوا ہے۔ بقیہ 47 صفحات میں ناولٹ 'کہانی میں کہانی' پیش کر کے اپنی تخلیقی صلاحیت کے انواع سے ہمیں متعارف کرایا ہے۔ ناول کی طوالت اگرچہ ضخامت کے درجے میں داخل نہیں ہوتی تاہم اگر ناولٹ کو انفرادی طور پر مستقبل میں چند دوسرے ناولٹ کے ساتھ پیش کیا جاتا تو اس کتاب کے عنوان کے ساتھ مکمل انصاف ہو جاتا۔ بہر کیف ناول اور ناولٹ کی اشاعت کے لیے میں انھیں مبارک باد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ قارئین اس کے صحیح مقام کا تعین کریں گے۔

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے۔ یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟
س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟
س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟
س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
س: سینٹرل اسکولوں اور نو ودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ اردو دنیا میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: urduduniyancpul@yahoo.co.in editor@ncpul.in

خبر نامہ

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

قومی اتحاد وسالمیت کی مضبوطی اور نئی نسل کو تعمیری افکار ونظریات سے لیس کرنے کے لیے مولانا آزاد کو آئیڈیل بنانا ضروری: شیخ عقیل احمد

’مولانا ابوالکلام آزاد: بحیثیت ایک ہندوستانی مفکر‘ کے عنوان سے آن لائن لیکچر

نئی دہلی: قومی یوم تعلیم کی مناسبت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ’مولانا ابوالکلام آزاد: بحیثیت ایک ہندوستانی مفکر‘ کے عنوان سے ایک آن لائن لیکچر کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت معروف ماہر سماجیات اور مولانا آزاد کے فکر و فلسفہ سے خاص تعلق رکھنے والی ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اس موقعے پر تعارفی خطاب کے دوران کہا کہ جدید ہندوستانی قوم کی اجتماعی زندگی کا کوئی حصہ، کوئی گوشہ، کوئی پلان اور کوئی پروگرام ایسا نہیں، جس پر مولانا

آزاد کے افکار واقدامات کا عکس نہ پڑا ہو۔ مولانا آزاد کی شخصیت جتنی دلکش تھی اتنی ہی ہمہ گیر بھی تھی۔ وہ بیک وقت آزادی ہند کے عظیم مجاہد، مایہ ناز دانشور، دیدہ ور سیاسی رہنما، مذہبی مفکر اور بے خوف صحافی تھے۔ مولانا آزاد کی قیادت کا میدان بہت وسیع تھا، انھوں نے جس میدان میں بھی قدم رکھا، اپنی عظیم شخصیت کا انمٹ نقش ثبت کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد ہندوستان کے گیارہ سال وزیر تعلیم رہے، انھوں نے تعلیم کو قومی حالات وروایات کے تناظر میں دیکھا، ملک کے مفادات کے تحت ان کے عہد وزارت میں تعلیمی منصوبہ بندی اور سائنسی وتکنیکی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ شیخ عقیل نے کہا کہ مولانا آزاد کی وفاداری کا واحد محور ان کا ضمیر تھا اور بھارت کی مشترکہ ثقافت، جس کے تحفظ کے لیے وہ آخری سانس تک جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا کی شخصیت اور ان کے افکار میں موجودہ ہندوستان کے لیے رہنمائی کے کئی پہلو ہیں، وطن عزیز کے اتحاد وسالمیت کو برقرار رکھنے اور نئی نسل کو تعمیری افکار ونظریات سے لیس کرنے کے لیے مولانا آزاد کو آئیڈیل بنانے کی ضرورت ہے۔

کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے مولانا آزاد کی زندگی اور سیاسی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے نہ صرف خود جنگ آزادی میں قائدانہ حیثیت سے حصہ لیا بلکہ مسلمانوں کو بھی اس کی دعوت دی اور اس ملک سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہندو اور مسلمانوں کو مل کر جدوجہد کرنے کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان کی زندگی اور ان کے افکار آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

معروف اسلامی اسکالر پروفیسر انور معظم نے مولانا کے افکار کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں کئی مسلم مفکرین نے جنم لیا جنھوں نے دنیا کے مختلف خطوں کے مسلمانوں کو متاثر کیا، ان میں جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، سرسید احمد خان، عبیداللہ سندھی اور مولانا آزاد کے نام اہم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد جمال الدین افغانی سے بہت زیادہ متاثر تھے اور انھوں نے الہلال کی شروعات انہی کے رسالے العروۃ الوثقیٰ کی تقلید میں کی تھی، مگر مولانا میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ ان کے یہاں ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانیت کا گہرا اثر ہے۔ بحیثیت وزیر تعلیم مولانا آزاد کے کارناموں کا بھی انھوں نے مبسوط جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر موصوف نے کہا کہ مولانا کا ماننا تھا کہ ہندوستانی تعلیمی نظام کو اس ملک کی تہذیب وثقافت کے مطابق ہونا چاہیے اور اس میں باہمی اتحاد، حب الوطنی، ہم آہنگی اور بھائی چارہ کے عناصر ضرور ہوں۔ بچے کو ابتدا میں ہی اخوت واتحاد کی تعلیم دینی چاہیے تاکہ آیندہ وہ کسی بھی قسم کے ذہنی وسماجی انتشار وخلفشار سے محفوظ رہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد خود نئے تعلیمی سسٹم کی پیداوار نہیں تھے، وہ ایک مذہبی عالم تھے، جدید تعلیم انھوں نے خود مطالعہ کرکے حاصل کی تھی مگر انھوں نے ہندوستان کے نئے تعلیمی نظام کی تشکیل میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے لیکچر میں ایک اہم بات یہ کہی کہ مولانا کی پوری شخصیت کی تفہیم اسی وقت ہو سکتی ہے جب مولانا اور آزاد دونوں پیش نظر رہیں، ایسا نہ ہو تو مولانا کو سمجھنے میں کئی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اگر ایسا ہو تو رفتہ رفتہ یہ احساس ہوگا کہ وہ

دعوت فکر و عمل دینے والی ایسی شخصیت ہیں، جس کی پورے جنوبی ایشیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ بلاشبہ مولانا آزاد کی شخصیت ہمہ گیر ہے اور میرے پیش رو مقررین نے ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے موجودہ حالات کے تناظر میں کہا کہ آج مولانا آزاد کی معنویت پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ چکی ہے، کیوں کہ ہمارے جو قومی و بین الاقوامی مسائل ہیں انھیں دور کرنے میں مولانا کی فکر بڑا کردار ادا کرسکتی ہے۔ انھوں نے کونسل کو مولانا کے علمی ورثہ کے فروغ اور ان کی بہت سی غیر مطبوعہ علمی متروکات کی اشاعت پر توجہ دلاتے ہوئے مولانا کے یوم پیدائش کی مناسبت سے اس لیکچر کے انعقاد پر اردو کونسل اور ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کا خصوصی شکریہ بھی ادا کیا۔ اس پروگرام کی نظامت کا فریضہ کونسل سے وابستہ ڈاکٹر یوسف رامپوری نے بحسن وخوبی انجام دیا اور ملک و بیرون ملک سے سیکڑوں لوگوں نے آن لائن اس لیکچر میں شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 11 نومبر 2020

قومی اردو کونسل کے نیچرل سائنس پینل کی آن لائن میٹنگ

نئی دھلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نیچرل سائنس پینل کی آن لائن میٹنگ کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر ماجد احمد تالی کوٹی نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام شرکا کا استقبال کیا۔ افتتاحی خطاب میں انھوں نے کہا کہ کورونا اور لاک ڈاؤن کے دوران بھی کونسل نے اپنی تمام سرگرمیاں جاری رکھی ہیں، اس کے علاوہ آن لائن پروگراموں اور میٹنگز کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کا مقصد اردو زبان و ادب کے فروغ کے

علاوہ دیگر اہم موضوعات پر اردو زبان میں کتابیں شائع کرنا اور طلبہ وطالبات کو ضروری مواد فراہم کرنا بھی ہے۔ نیچرل سائنس پینل بھی اسی لیے تشکیل دیا گیا ہے تاکہ سائنسی موضوعات پر ضروری اور اہم کتابیں شائع کی جائیں اور طلبا کی تعلیمی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل اس سلسلے میں ماہرین کے مشوروں اور تجاویز کا خیر مقدم کرتی ہے اور طلبا وطالبات کو ہر ممکن مدد فراہم کرنے کے لیے پابند عہد ہے۔ آج کی میٹنگ کے دوران گزشتہ میٹنگ کی تجاویز کو اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ اس کے علاوہ نیچرل سائنس کے مختلف پہلوؤں پر کونسل کے زیر اہتمام جاری اشاعتی پروجیکٹس پر غور وخوض کیا گیا اور مختلف سائنسی کتابوں کی تیاری واشاعت کو منظوری دی گئی۔ اس موقعے پر NEET اور دیگر مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے اردو زبان میں مواد کی تیاری پر خاص زور دیا گیا۔ ساتھ ہی پہلے سے زیر غور سائنسی اصطلاحات پر مشتمل ڈکشنری کے پروجیکٹ پر جلد از جلد کام شروع کرنے پر اتفاق کیا گیا۔ اس سلسلے میں کونسل کی جانب سے جلد ہی ایک اشتہار شائع کرایا جائے گا اور ماہرین کی خدمات حاصل کرکے اس ڈکشنری کی تالیف واشاعت کو یقینی بنایا جائے گا۔

میٹنگ میں پروفیسر رئیس الدین، ڈاکٹر عزیز عزیز، ڈاکٹر احمد علی، ڈاکٹر رضا رفیق الحق کے علاوہ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ ذیشان فاطمہ اور محمد افضل خان نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 اکتوبر 2020

'اردو شاعری کا عصری منظرنامہ' پر آن لائن مذاکرہ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 'اردو شاعری کا عصری منظرنامہ' کے موضوع پر ایک آن لائن مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس میں موجودہ اردو شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اردو کے فاضل اساتذہ اور دانشوروں نے اظہار خیال کیا۔ اس مذاکرے کی صدارت کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو کے شاعروں نے معاشرے پر ہر دور میں دیرپا اثرات چھوڑے اور معاشرے کے احوال ومسائل کے تئیں اپنی ذمے داریوں کو بخوبی انجام دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو شاعری کا عصری منظرنامہ بھی کئی اعتبار سے حوصلہ افزا وتابناک ہے اور اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ جدید شاعری کے امتیازات کی نشان دہی کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ معاشرے کے ثقافتی تقاضوں کے پیش نظر اردو شاعری کے موضوعات میں غیر معمولی تبدیلی آچکی ہے اور آج کا شاعر نہ صرف روایتی شعری موضوعات کو اپنی فنکاری کا حصہ بنا رہا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تازہ ٹکنالوجیکل حصولیابیاں، ان کے نتیجے میں سماجی سطح پر رونما ہونے والے تغیرات اور انسانی رویہ و اخلاق پر پڑنے والے ان کے اثرات بھی شاعروں کی قوتِ تخیل کو مہمیز کررہے

قومی کونسل اگلے 6 ماہ میں اردو پر مبنی موبائل ایپ لانچ کرے گی

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) نے نہ صرف عالمی وبائی مرض کووڈ 19 کے چیلینجنگ مرحلے میں اپنی علمی سرگرمیاں جاری رکھیں بلکہ ملک کی 21 ریاستوں میں ورچوئل سیمینارز کے لیے بھی ٹکنالوجی کا استعمال کیا اور اردو کی تشہیر اور ترقی کے کام بخوبی انجام دیے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے ڈائرکٹر عقیل احمد نے 'ہندوستان سماچار' کے ساتھ ایک خصوصی بات چیت میں کہا کہ NCPUL ملک بھر کی 21 ریاستوں میں اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے گزشتہ دو سال میں ایک ہزار سے زائد سیمینارز، سمپوزیم، مشاعرے اور تہذیبی وثقافتی پروگراموں اور لیکچرز کا اہتمام کرچکی ہے۔ ان میں سے کونسل نے ملک کے مختلف حصوں میں 28 پروگراموں کا اہتمام کیا۔ وہیں، کونسل کے ذریعے دیے گئے فنڈز کے ذریعے 933 سے زیادہ پروگراموں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کونسل سے اسپانسرڈ پروگراموں پر تقریباً 33 کروڑ روپے خرچ کیے گئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کونسل اردو موبائل ایپ کے پروجیکٹ پر بھی کام کررہی ہے اور آئندہ چھ ماہ میں یہ ایپ لانچ ہوجائے گا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 اکتوبر 2020

ہیں۔ آج کی اردو شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دائرے میں سمٹاؤ اور محدودیت نہیں ہے۔ نئی دنیا کی طرح نئی شاعری میں بھی بے پناہ وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ موجودہ دور کی نمایاں شعری اصناف میں غزل اور نظم شامل ہیں اور ان دونوں میں زیادہ مقبولیت غزل کو حاصل ہے۔ روایت کی پاسداری کے ساتھ نئے شعرا جدید افکار و مسائل پر بھی بہتر اظہار خیال کر رہے ہیں، لفظی سطح پر بھی ایک بدلاؤ سامنے آیا ہے کہ عربی و فارسی تراکیب سے روگردانی کرکے آسان اضافی یا توصیفی تراکیب کے استعمال کا چلن بڑھا ہے۔ جناب اکرم نقاش نے اپنی گفتگو میں خاص طور پر نئے دور میں اردو نظم سے بے اعتنائی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج ایسے شعرا بہت کم بلکہ نہ کے برابر ہیں جن کی شناخت نظم کے شاعر کے طور پر کی جاسکتی ہو۔ ممبئی یونیورسٹی کے قمر صدیقی نے کہا کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کی بے پناہ ترقیات کے عہد میں تخلیق کاروں کے سامنے رسائی کا مسئلہ نہیں رہا، کوئی ادیب یا تخلیق کار اگر چاہے تو منٹوں میں اس کی تخلیق پوری دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ البتہ اس کی وجہ سے معیار کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور جلدی مقبولیت حاصل کرنے کے چکر میں بعض غیر معیاری کلام بھی ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ نئے فنکاروں اور شاعروں کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مشق و ریاضت سے کام لیں، اس کے بعد اپنا فن دنیا کے سامنے پیش کریں، ایسے میں ان کے کلام کو مقبولیت کے ساتھ زندگی بھی ملے گی۔ اس مذاکرے کی نظامت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر احمد محفوظ نے بحسن و خوبی انجام دی۔ انھوں نے اردو شاعری کی طویل تاریخ پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے موجودہ دور کی اردو شاعری اور اسے درپیش مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ اس موقعے پر کونسل کے اسٹاف کے علاوہ بڑی تعداد میں اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے سامعین و ناظرین بھی آن لائن موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 اکتوبر 2020

کویت میں مقیم ادیب و شاعر جناب افروز عالم کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب

نئی دہلی: موجودہ دور میں اردو زبان کی مقبولیت و شہرت کا دائرہ روز بروز پھیلتا جارہا ہے اور اب یہ صرف برصغیر ہندو پاک کی زبان نہیں رہی، بلکہ پوری دنیا میں اردو زبان بولنے، سمجھنے اور پڑھنے لکھنے والے موجود ہیں۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے

فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے کویت سے تشریف لائے مشہور شاعر و مصنف اور گلف اردو کونسل کے صدر جناب افروز عالم کے استقبال میں اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ مجلس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ خلیجی ممالک میں اردو زبان کے تئیں لوگوں میں غیر معمولی محبت اور دلچسپی پائی جاتی ہے اور جب ہم وہاں کسی سمینار یا پروگرام کے سلسلے میں جاتے ہیں تو اردو کے پرجوش محبین کو دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوتی ہے۔ انھوں نے مہمانِ مجلس جناب افروز عالم کے بارے میں بتایا کہ ان کا تعلق بہار سے ہے اور وہ گزشتہ کئی دہائیوں سے خلیج میں مقیم ہیں، فی الحال کویت کی ایک پرفیوم کمپنی کے جنرل منیجر ہیں اور ساتھ ہی علم و ادب کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور ان کی کئی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں جن میں 'کویت میں ادبی پیش رفت' کو خاص اہمیت حاصل ہے، یہ کتاب مہجری ادب پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالرز کے لیے حوالہ جاتی و دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو شعری مجموعے بھی شائع ہوچکے ہیں اور کئی قومی و بین الاقوامی اعزازات سے انھیں نوازا جاچکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ افروز عالم صاحب جیسے اردو کے بے لوث خادمین کی بدولت ہی غیر اردو خطوں میں اردو کا چراغ روشن ہے۔ اس موقعے پر محترم افروز عالم نے قومی کونسل کے ڈائرکٹر کا شکریہ ادا کیا اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے خلیجی ممالک میں اردو کی صورت حال پر مختصر مگر معلومات افزا روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ پورے مشرق وسطی میں اردو بولنے والوں کی تعداد دوسرے نمبر پر ہے اور اردو بولنے والے یہ لوگ وہ ہیں جو بھارت اور پاکستان سے جاکر وہاں اپنے کاروبار یا دیگر مقاصد کے تحت مقیم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خلیجی ملکوں میں اردو زبان میں ہزاروں لکھنے والے ہیں، بہت ساری ادبی انجمنیں ہیں اور اردو کا کارواں تیزی سے محوِ سفر ہے۔ ان ملکوں میں اردو کے اخبارات و رسائل بھی نکلتے ہیں۔ وہاں ادبی پروگرام اور مشاعرے بڑے پیمانے پر منعقد ہوتے ہیں، جہاں ہزاروں لوگوں کی شرکت معمول کی بات ہے۔ انھوں نے بتایا کہ انتظامی یا سرکاری اور عوامی سطح پر اردو کو کچھ مسائل بھی درپیش ہیں، جنھیں خادمینِ اردو اپنی سطح پر دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر مہمان محترم نے سامعین کو اپنی غزلیں اور نظمیں بھی سنائیں، جن کی خاصی پذیرائی کی گئی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، آبگینہ عارف اور محمد انصر نے بھی اپنے اشعار سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 اکتوبر 2020

ڈاکٹر محمد فاروق اعظم کی کتاب 'اظہار الاسلام: شخصیت و فن' کی تقریب اجرا

نئی دہلی: اظہار الاسلام اردو کے ایک جینوئن افسانہ نگار تھے اور انھوں نے پورے خلوص اور بے لوثی کے ساتھ ادب کی خدمت انجام دی، ان کی شخصیت اور فن کے جائزے پر مشتمل کتاب کی ترتیب خوش آیند اور قابل مبارکباد ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں ڈاکٹر محمد فاروق اعظم کی مرتبہ کتاب 'اظہار الاسلام: شخصیت و فن' کی تقریب رونمائی میں خطاب کرتے ہوئے کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ فاروق اعظم صاحب کا یہ کام اظہار الاسلام شناسی کے ضمن میں مشعل راہ ثابت ہوگا اور آیندہ ان کی شخصیت اور فن پر مزید منظم اور مفصل کام کیا جائے گا۔ اظہار الاسلام کی افسانہ نگاری کی خصوصیات اور خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ عقیل نے کہا کہ چوں کہ وہ اردو کے کسی معروف مرکز یا متعارف دبستان سے تعلق نہیں رکھتے تھے، اس لیے ایک عظیم افسانہ نگار ہونے کے باوجود انھیں اردو ادب و تنقید میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ حق دار تھے۔ انھوں نے کہا کہ علاقائی ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں پر کام کرنا ضروری ہے۔ اور جہاں

بھی اردو کے خادم اور تخلیق کار پائے جاتے ہیں ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی ہونی چاہیے؟ انھوں نے بتایا کہ اسی وجہ سے اردو کونسل کے زیر اہتمام علاقائی ادب کی تاریخ مرتب کی جارہی ہے، تاکہ پورے ملک کے دوردراز خطوں کے ادبا و مصنفین کی خدمات بھی سامنے آئیں اور ان کا کما حقہ اعتراف کیا جائے۔ اس موقعے پر انھوں نے پورے ملک میں علاقائی سطح پر سرگرم اردو کے مصنفین، ادبا، تخلیق کاروں سے اپیل کی کہ وہ مسودات قومی کونسل میں بھیج سکتے ہیں، ہم انھیں شائع کروائیں گے یا ان کی اشاعت میں کونسل کی جانب سے مدد کی جائے گی۔ دہلی یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد کاظم نے مرتب کتاب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اس کتاب کے ذریعے نہ صرف اظہارالاسلام کا حق ادا کیا ہے بلکہ اس حوالے سے اردو والوں پر جو قرض تھا اسے بھی ادا کیا ہے؟ انھوں نے اس کتاب میں بہت اچھے مضامین جمع کر دیے ہیں، جنھیں پڑھ کر اظہارالاسلام کی شخصیت اور فن سے بخوبی آگاہی ہوتی ہے۔

حقانی القاسمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ادب میں افراد کے ساتھ ساتھ زمینوں کے ساتھ بھی ناانصافیاں ہوئی ہیں۔ مغربی بنگال کی بہت ساری اولیات کے باوجود اسے وہ مرکزیت حاصل نہیں ہے جو بعض دوسرے علاقوں کو ہے۔

انھوں نے حاشیائی تخلیق کاروں کو نظر انداز کیے جانے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ تمام تر تخلیقی توانائیوں اور کارناموں کے باوجود مرکز سے دور دیہات اور قصبات میں رہنے والے فنکاروں کی تخلیقی ہنرمندی کا اعتراف نہیں کیا جانا افسوسناک ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر فاروق اعظم کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اظہارالاسلام اور ان جیسے دیگر افسانہ نگاروں پر مربوط اور مبسوط تنقیدی اور تحقیقی کام کی شدید ضرورت ہے۔

ڈاکٹر قمر صدیقی نے بھی اپنے تاثرات میں کہا کہ اردو میں عام طور پر مشہور شخصیات پر ہی لکھنے اور تحقیق کرنے کا رواج ہے جس کی وجہ سے بہت سے حقیقی تخلیق کار نظر انداز کر دیے جاتے ہیں، اس روایت کو توڑنے کی ضرورت ہے؟ فاروق اعظم نے اظہار صاحب پر کام کرکے اس کا آغاز کیا ہے جس کے لیے وہ قابل مبارکباد ہیں؟ اس موقعے پر ڈاکٹر فاروق اعظم نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کونسل اور ڈائریکٹر کا خصوصی شکریہ ادا کیا کہ ان کی خصوصی محبت و عنایت کی وجہ سے ہی کونسل کے پلیٹ فارم سے اس کتاب کا اجرا ممکن ہو سکا؟ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر یوسف رامپوری نے بحسن و خوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 نومبر 2020

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو اپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ میں این سی ای آر ٹی کا اہم کردار: وزیر تعلیم

نئی دھلی: مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر رمیش پوکھریال نشنک نے کہا کہ اسکولوں کی تعلیم اور اساتذہ کی تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لیے 34 سال کے بعد ایک نئی قومی تعلیمی پالیسی لائی گئی ہے اور اس پالیسی کو نافذ کرنے میں

قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیق و تربیت (این سی ای آر ٹی) کا کردار انتہائی اہم ہے کیونکہ یہ اسکول کے نئے نصاب، درسی کتب اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں رہنما ہدایات فراہم کرے گی۔ این سی ای آر ٹی کے 60 ویں یوم تاسیس کے موقعے پر ڈاکٹر رمیش پوکھریال نے کہا کہ کسی ادارے کی اصل شناخت اس کی عمارت سے نہیں بلکہ اس کے افعال سے ہوتی ہے اور این سی ای آر ٹی نے اپنی تعلیمی کامیابیوں کے ذریعے ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ انھوں نے این سی ای آر ٹی کے ڈائرکٹر پروفیسر ریشکیش سیناپتی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ این سی ای آر ٹی کے لازمی کاموں میں اسکول کی تعلیم کے معیار کو بڑھانے کے لیے مستقل تحقیق کرنے کے ساتھ ہی بچوں، اساتذہ، والدین اور دیگر متعلقہ افراد کے لیے مفید تعلیمی مواد تیار کرنا اور ضرورت کے مطابق تربیتی پروگراموں کا اہتمام کرنا شامل ہے۔ انسٹی ٹیوٹ نے پانچ دہائیوں سے زیادہ طویل عرصے سے ان شعبوں میں عمدہ کام کیا ہے۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ 34 سال بعد ہم ایک نئی قومی تعلیمی پالیسی لے کر آئے ہیں جس میں اسکولی تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں یکسر تبدیلی کی سفارش کی گئی ہے۔ اس پالیسی کو نافذ کرنے میں این سی ای آر ٹی کا کردار انتہائی اہم ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے این سی ای آر ٹی کے ذریعے قومی نصاب کا خاکہ تیار کیا جائے گا، جو نئے نصاب، درسی کتب اور اسکول کے دیگر پہلوؤں کے بارے میں رہنما ہدایات فراہم کرے گا۔ ڈاکٹر نشنک نے کہا کہ این سی ای آر ٹی نے اساتذہ کی صلاحیت سازی اور استعداد میں اضافہ کے لیے 23000 افراد اور 17.5 لاکھ اساتذہ اور اسکول کے سربراہوں کو وزارت تعلیم کے مخصوص پروگرام کے ذریعے تربیت دی ہے۔ کورونا وائرس کی عالمی وبا کے چیلنج کے پیش نظر آج مجھے آن لائن پورٹل کے آغاز کرنے پر خوشی ہو رہی ہے، اس آن لائن پروگرام کے ذریعے ہم ابتدائی سطح کے بقیہ 24.5 اساتذہ تک پہنچ سکیں گے۔ اس موقعے پر وزیر موصوف نے پورٹل پر آن لائن کے ذریعے رجسٹریشن بھی شروع کیا اور این سی آر ٹی اور انڈین سائنس لینگویج ریسرچ اینڈ ٹریننگ سنٹر (آئی ایس ایل آر ٹی سی) کے درمیان مفاہمت نامہ پر بھی دستخط ہوئے۔ ڈاکٹر نشنک نے این سی ای آر ٹی اور آئی ایس ایل آر ٹی سی کے مابین مفاہمت نامہ پر دستخط ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس تاریخی معاہدے کے تحت ہندی اور انگریزی میڈیم کے درجہ ایک سے لے کر درجہ بارہویں تک این سی ای آر ٹی کی تمام نصابی کتابوں اور دیگر ضمنی نصابی کتب اور وسائل کو ہندوستانی علامتی زبان میں منتقل کیا جائے گا۔ اس اقدام سے ان تمام طلبا اور اساتذہ کو فائدہ ہوگا، جو سن نہیں سکتے یا قوت سماعت سے محروم ہیں۔ انھوں نے کورونا بحران کے دوران این سی ای آر ٹی کے ذریعے تعلیم کے میدان میں کیے گئے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے امید ہے کہ این سی آر ٹی اپنی انتھک کوششوں سے ملک میں اسکولی تعلیم کی رہنمائی جاری رکھے گی۔" اس موقع پر مرکزی وزیر برائے سماجی انصاف و تفویض اختیارات تھاور چند گہلوت، مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم سنجے دھوترے، محکمہ اسکولی تعلیم کی سکریٹری انیتا کروال، این سی ای آر ٹی کے ڈائرکٹر پروفیسر ریشکیش سیناپتی، این سی ای آر ٹی کے جوائنٹ ڈائرکٹر پروفیسر سریدھر سریواستو، شعبہ تکنیکی تعلیم کے سربراہ پروفیسر رنجنا اروڑہ اور وزارت تعلیم، وزارت سماجی انصاف نیز این سی ای آر ٹی کے دیگر اعلیٰ عہدیدار موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 17 اکتوبر 2020

تعلیم خود کفیل ہندوستان کی سب سے مضبوط اکائی: ڈاکٹر نشنک

نئی دھلی: مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر رمیش پوکھریال نشنک نے کہا ہے کہ تعلیم ہندوستان کو مؤثر، پائیدار، معنی خیز اور بااختیار بنانے کی سب سے مضبوط اکائی ہے۔ ڈاکٹر نشنک

نے آج ویڈیو کانفرنس کے ذریعے پنجاب سنٹرل یونیورسٹی کے بھٹنڈا کے نئے کیمپس کے افتتاح کے دوران کہا یہ کیمپس 500 ایکڑ پر تعمیر کیا گیا ملک کا پہلا کیمپس ہے جس کی ماحول دوست اور توانائی کی بچت والی عمارتوں کی تعمیر کے لیے پانچ ستارہ درجہ بندی کی گئی ہے۔ مرکزی وزیر نے اس موقعے پر پنجاب سنٹرل یونیورسٹی کی طرف سے کیے گئے تحقیقی کام کو سراہتے ہوئے کہا کہ ریسرچ کو بنیاد بنا کر اور خود کفیل ہندوستان کی جانب مزید قدم بڑھاتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی نے کئی اہم تحقیق کی ہے، چاہے وہ دماغی کینسر کے پھیلاؤ پر کام ہو یا نباتات کا استعمال کرتے ہوئے بائیو ہربل سائڈ پر تحقیقی کام ہو یا 'لوکل ٹو گلوبل اپروچ جو ہمیں خود کفیل بنائے گا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ حکومت ہند کی این آئی ایف رینکنگ میں 87 ویں رینک حاصل کرنے والی پنجاب سینٹرل یونیورسٹی ملک کی سب سے کم عمر یونیورسٹی ہے۔ وزیر تعلیم نے انٹارکٹیکا کے دورے پر یونیورسٹی کے دونوں اساتذہ کا تعارف کرتے ہوئے کہا کہا مجھے یہ جان کر بہت

فخر ہوا کہ ڈاکٹر فیلکس باست اور ڈاکٹر جتیندر پٹنائک نے انٹارکٹیکا میں ہونے والی 36 ویں ہندوستانی سائنسی مہم میں حصہ لیا اور انٹارکٹیکا میں تحقیق کے لیے تقریباً چار ماہ گزارے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 13 اکتوبر 2020

اردو اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی وراثت

نئی دہلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ صدی سال کے موقع پر 26,27/ اکتوبر 2020 کو 'اردو اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی وراثت'

کے عنوان سے دو روزہ بین الاقوامی ویبینار کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے شرکت فرمائی۔ اس ویبینار میں بطور مہمان اعزازی الازہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر یوسف عامر اور تہران یونیورسٹی، ایران میں اُردو کی استاد ڈاکٹر وفا یزداں منش نے شرکت کی۔ اس ویبینار کا کلیدی خطبہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے پیش کیا جب کہ تمام مہمانوں کا خیر مقدم شعبہ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر شہزاد انجم نے کیا۔ اس ویبینار کے افتتاحی جلسے میں مہمان خصوصی شیخ الجامعہ پروفیسر نجمہ اختر نے اردو کو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی سب سے اہم وراثت قرار دیتے ہوئے مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کرنے والی تنہا ہندوستانی زبان قرار دیا۔ شیخ الجامعہ نے اردو کے سیکولر مزاج اور کردار پر زور دیتے ہوئے مختلف ہندوستانی گروہوں کی اردو کے لیے محبت اور اس کے گیسو سنوارنے میں تمام ہندوستانیوں کی محنت کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اقبال کی مشہور نظم 'رام' کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چند اشعار بھی پیش کیے۔ انھوں نے فرمایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو زبان کا تعلق بہت دیرینہ اور گہرا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیان اسی اردو کلچر اور تہذیب کے پروردہ تھے۔ اسی اردو تہذیب نے ان کے مزاج میں ان کی رگ رگ کو حب الوطنی، اتحاد و یگانگت، مساوات اور رواداری کا گنگا جمنی شربت پلایا تھا۔ افتتاحی اجلاس کے صدارتی خطبے میں پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے فرمایا کہ اردو کے بغیر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی عمارت زمیں بوس ہو جائے گی، تہذیبوں میں آویزش نہیں ہوتی بلکہ تہذیبیں گلے لگانے سے پروان چڑھتی ہیں۔ انھوں نے اس حقیقت کو دوبارہ یاد کیا کہ بین الاقوامی ادبی منظرنامے پر بھی ہندوستان کی نمائندگی کرنے والے دو شعرا ہیں، ایک ٹیگور (بنگالی) اور دوسرے علامہ اقبال (اردو)۔ اردو ہمارا اجتماعی حافظہ ہے اگر ہم اس کو بھلا دیں تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اردو نے ہماری پوری تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اس بات کو بھی اجاگر کیا کہ ہندوستان کی 23 زبانوں میں سے کسی زبان کو دوسری زبان پر کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے، بلکہ تمام زبانیں مساوی حیثیت واہمیت کی حامل ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کو اپنا دامن سبھی زبانوں کے لیے کھلا رکھنا چاہیے اور باہمی اشتراک اور فیض رسانی کے عمل کو تیز تر کرنا چاہیے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مرکزی موضوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مشترکہ تہذیب کے عناصر تشکیلی پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کے نہ صرف باقاعدہ آغاز کا سہرا بھگتی تحریک اور صوفیا کے سر جاتا ہے بلکہ ان لوگوں نے اس روایت کو مستحکم بھی کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ کبیر داس کا نام لیا جنھوں نے اپنی شاعری میں انسان دوستی کی لازوال فضا قائم کی اور جس کے اثر سے ہندوستانی معاشرہ مذہب اور ذات سے بالاتر ہو کر محبت کے رنگ میں رنگ گیا۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر یوسف عامر، ڈپٹی پریسیڈنٹ، الازہر یونیورسٹی، مصر نے اپنی پُر مغز گفتگو میں فرمایا کہ اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے خمیر سے تیار ہوئی۔ اردو کی تمام اصناف میں اسی کی خوشبو رچی بسی ہے اور اس تعلق سے اردو دنیا کے ممالک کے مابین سفیر ہند کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے مہمان اعزازی محترمہ ڈاکٹر وفا یزداں منش، استاد، تہران یونیورسٹی نے ماضی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شاندار تاریخی کامیابیوں اور حال میں اس کے تسلسل پر جامعہ برادری کو مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو کے دوران اس خیال کا اظہار کیا کہ زبان خود ایک تہذیب ہے، لہٰذا اردو کی تہذیب مشترکہ قومی وملی عناصر سے مل کر نمو پاتی ہے۔ اردو میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے مختلف علاقوں کی تہذیب جھلکتی ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے شرکا اور مندوبین کا خیر مقدم کیا اور ویبینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شہپر رسول نے تمام مندوبین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا ساتھ ہی اردو اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کا افتتاح حافظ ڈاکٹر شاہنواز فیاض کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور ویبینار کے کنوینز ڈاکٹر محمد مقیم نے ویبینار کی غرض وغایت اور جامعہ صدی کے موقع پر اس موضوع کے انتخاب کا جواز دیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت کے فرائض پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور پروفیسر کوثر مظہری نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی (ہندوستانی تہذیب وثقافت اور اردو زبان وادب)، پروفیسر حدیث انصاری (تاریخ کے پس منظر میں اردو کا تہذیبی سرمایہ)، ڈاکٹر واحد نظیر (اردو کا جوہر اور مشترکہ تہذیب)، ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو[ماریشس] (قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں مشترکہ تہذیب) اور ڈاکٹر ثاقب عمران (دکنی شاعری میں مشترکہ تہذیب کے عناصر) نے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر جاوید حسن نے ادا کیے۔

اس سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے سیشن کی صدارت کے فرائض پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر انور پاشا نے انجام دیے۔ پروفیسر خالد محمود نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ اقوام عالم ہندوستان کی جس تہذیب کو جانتی ہے اور جس کی وہ ستائش کرتے ہے اس کا علم اردو زبان سے عام ہوا، اردو گویا مشترکہ تہذیب کی عرفیت ہے۔ اجلاس کے دوسرے صدر پروفیسر انور پاشا صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام ہی مشترکہ تہذیب وثقافت کے تصور سے عمل میں آیا ہے۔ انھوں نے مرکزی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ اردو زبان لسانی، سماجی، مذہبی اور علاقائی ہر سطح پر مشترکہ تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر خالد جاوید (قرۃ العین حیدر کے فکشن میں مشترکہ تہذیب: آگ کا دریا کے حوالے سے)، ڈاکٹر دبیر احمد (مشترکہ تہذیب کا استعارہ: نظیر اکبرآبادی)، ڈاکٹر مسرت جہاں (قلی قطب شاہ کی نظموں میں مشترکہ تہذیب کی عکاسی)، ڈاکٹر ریحان حسن (بابا نانک اردو ادب میں مشترکہ تہذیب کی ایک علامت) نے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مشیر احمد نے ادا کیے۔

تیسرے تکنیکی اجلاس میں صدارت کا فریضہ پروفیسر م۔ن۔ سعید صاحب اور پروفیسر احمد محفوظ نے ادا کیا۔ پروفیسر م۔ن سعید نے دکنی اردو ادب کو تہذیبی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے اس تعلق سے فرمایا کہ مقیمی کی مثنوی 'چندر بدن و مہیار' کا قصہ اور کردار کو مشترکہ تہذیب کی علامت قرار دیا، اس مثنوی کا قصہ ہماری سائیکی میں بس گیا ہے اسی لیے نہ صرف اس

قصے کو بلکہ وبینار کے موضوع پر بھی بار بار گفتگو ہوتی ہے۔ دکنی ادب کو مشترکہ تہذیب کے تناظر میں از سرِنو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے صدارتی خطاب میں حقِ میزبانی ادا کرتے ہوئے از اول تا آخر تمام مقالہ نگاروں کو محنت اور عرق ریزی سے مقالہ لکھنے کے لیے مبارکباد پیش کی اور خوشی کا اظہار کیا۔ صدارتی گفتگو کے دوران انھوں نے یہ ایک نادر خیال پیش کیا کہ اردو حروف تہجی جدا جدا لکھے جاتے ہیں لیکن تحریر میں آتے ہی باہمی اشتراک اور تعاون کی معنویت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر درخشاں زریں (ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا ناقابلِ فراموش جزو کبیر داس)، ڈاکٹر عمیر منظر (غیر مسلم شعرا کی نعتیہ شاعری)، ڈاکٹر وفا یزداں منش [تہران] (اردو ادب میں علاقائی تہذیب)، ڈاکٹر غضنفر اقبال (اردو افسانے میں مشترکہ تہذیب کی جھلک) اور ڈاکٹر محمد یوسف وانی (اقبال اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب: ایک جائزہ) نے مقالے پیش کیے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہزاد انجم صاحب نے تمام مقررین، صدور، مہمانان اور شرکا کے لیے کلماتِ تشکر پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ صدی کے موقع پر اس موضوع کے انتخاب کا مقصد جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو زبان کے پیغامِ محبت کو عام کرنا ہے، وہ پیغامِ محبت جس کا ترانہ 1920 میں قوم و ملک کے چند جیالے دوبارہ لکھ رہے تھے۔ نظامت کی ذمہ داری ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی نے نبھائی۔ وبینار کی تزئین کاری میں شعبے کے ہونہار طالبِ علم جناب سفیر صدیقی نے بڑی لگن اور محبت کا ثبوت دیا نیز ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر ثاقب عمران اور ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی کے ساتھ تکنیکی امور کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔

اس موقعے پر پروفیسر حمید سہروردی (گلبرگہ)، پروفیسر تسنیم فاطمہ، پروفیسر عبدالحلیم (دہلی)، پروفیسر محمد ظفر الدین (حیدرآباد) ڈاکٹر الطاف انجم (سری نگر)، ڈاکٹر شاداب تبسم، محترمہ استوتی اگروال، محترمہ شگفتہ انصاری، محترمہ طاہرہ نورانی، ڈاکٹر محمد عثمان احمد اور شعبہ کے تمام اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبا و طالبات نے شرکت فرمائی۔

پریس ریلیز: پروفیسر شہزاد انجم، صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 9 نومبر 2020

دھلی

یادِ سرسید

نئی دھلی: سرسید نے نہ صرف ادب و صحافت کو مقصدیت سے جوڑا بلکہ تعلیمی میدان میں بھی انقلاب برپا کر دیا اور ان کے فلسفے میں موجودہ عہد کے لیے بھی ایک سے ایک سبق موجود ہے۔ یہ بات معروف ادیب پروفیسر سید سجاد حسین (مدراس) نے تسخیر فاؤنڈیشن اور دی وِنگس فاؤنڈیشن دہلی کے زیرِ اہتمام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سو سال مکمل ہونے پر 'یادِ سرسید' کے عنوان سے منعقدہ ایک پروگرام میں کہی۔

ممتاز فکشن نگار اور ماہرِ تعلیم پروفیسر غضنفر علی نے سرسید احمد خان کے خاندانی پس منظر، ان کے فلسفے اور عملی اقدامات کو موضوع بناتے ہوئے ایک بہترین داستان پیش کی۔ معروف ناقد و دانشور پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ سرسید کے عہد میں تہذیبی تصادم سے کئی مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ انھوں نے گہرائی و گیرائی سے ان مسائل پر غور و فکر کیا اور ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش کی۔ سرسید احمد خان کا فلسفہ دراصل ارضیت اور حالات کے تقاضوں سے مربوط ہے۔ سرسید کے اقوال و نظریات کا فقط ورد کرنے سے کوئی حاصل نہیں بلکہ ان کی طرح عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اے ایم یو کے پروفیسر اور مشہور کالم نگار شافع قدوائی نے کہا کہ سرسید کا فلسفہ بقائے باہم، تعلق پسندی اور جذباتیت سے گریز میں پیوست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ ہندوستان میں امن و شانتی کی فضا قائم کرنے میں سرسید کے افکار و نظریات بھی معاون ہو سکتے ہیں۔ اس آن لائن پروگرام میں خصوصی طور پر ڈاکٹر طیب خرادی، ڈاکٹر قسیم اختر، ڈاکٹر شاداب تبسم، معین اختر، نعیم النسا قریشی، سعدیہ، ڈاکٹر شاکرہ خانم، سید ظہیر احمد، محمد علم اللہ، نہاں انصاری، ڈاکٹر سلمان فیصل، ساجد حسین ندوی، گلاب ربانی، ڈاکٹر عطاء اللہ سنجری، نذر الاسلام، عائشہ صدیقہ، ڈاکٹر شاہانہ، مالکہ ساسا، ڈاکٹر عرفان سوداگر اور محمد رفیع کے علاوہ تقریباً تین درجن سامعین نے شرکت کی۔ مترجم اور کالم نگار ذیشان مصطفیٰ (جے این یو) نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق کئی سوالات اٹھائے اور سرسید مطالعات کے نام سے خصوصی کورس شروع کرنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ منظم طریقے سے سرسید احمد خان کو اے ایم یو کے نصاب میں بھی شامل نہیں کیا گیا جو کہ ایک افسوس کی بات ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی 23 اکتوبر 2020

گاندھی: تقلید سے تحقیق کی طرف عرب مفکرین کی نظر میں

نئی دھلی: انڈیا عرب کلچرل سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام آن لائن توسیعی خطبہ کا انعقاد کیا گیا، اسلامک یونیورسٹی یورپ (اسپین) کے عربی زبان و بلاغت کے استاد اور جنرل ڈائرکٹر برائے تحقیق اور کانفرنسز ڈاکٹر زکریا السرتی نے بحیثیت مہمان خطیب شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں انڈیا عرب کلچرل سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر محمد ایوب تاج الدین ندوی نے انڈیا عرب کلچرل سینٹر کا تعارف اور اس کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالی نیز اس سینٹر میں پڑھائے جانے والے کورسیز کے بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ ماہ اکتوبر میں مہاتما گاندھی کی پیدائش ہوئی تھی اور پورے ملک میں 2 اکتوبر کو گاندھی جی کی شخصیت پر مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں اور اسی مہینے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد بھی رکھی گئی تھی اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کا جامعہ کی تاسیس میں اہم کردار رہا ہے۔ اس لحاظ سے آج کا یہ لیکچر منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد پروفیسر محمد ایوب ندوی نے مہمان خطیب کو دعوت دی۔ فاضل خطیب ڈاکٹر زکریا السرتی نے مہاتما گاندھی کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی عظیم مفکر و دانشور کے ساتھ صرف ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ پوری دنیا کے عظیم لیڈر تھے، انھوں نے گاندھی جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے عرب دنیا کے کئی ادبا اور رائٹرز کے گاندھی جی کے بارے میں میں لکھے ہوئے اقتباسات کو پیش کیا۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں گاندھی جی کے کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی ایک ایسی شخصیت تھی جس نے پوری زندگی ظلم و بربریت اور تاریکی کے خلاف اپنی آواز کو بلند کیا، فاضل خطیب نے کہا کہ مہاتما گاندھی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے کئی دہائیاں گزر چکی ہیں لیکن صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عرب ملکوں میں بھی ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و ریسرچ آج بھی جاری ہے جو عربوں کے درمیان مہاتما گاندھی کی شخصیت کی مقبولیت کی غماز ہے۔ لیکچر کے بعد کچھ اساتذہ، اور اسکالرس نے اس موضوع سے متعلق سوالات کیے جن کے فاضل مقرر نے جوابات دیے۔ پروگرام کے آخر میں پروفیسر محمد ایوب ندوی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اکتوبر 2020

بہار

شہاب ظفر اعظمی پٹنہ یونیورسٹی شعبۂ اردو کے نئے صدر

پٹنہ: سہ ماہی تبدیلی صدور ضابطے کے تحت 3 نومبر کو اردو کے مشہور ادیب، فکشن ناقد، درجنوں کتابوں کے مصنف ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ کا عہدہ سنبھالا۔ سابق صدر پروفیسر جاوید حیات نے گلدستہ کے ساتھ کرسی صدارت پر ان کا استقبال کیا

اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ واضح ہو کہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی ایک تاریخ رہی ہے۔ ڈاکٹر عظیم الدین سے لے کر اختر اورینوی، پروفیسر اسلم آزاد، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر اسرائیل رضا جیسے ممتاز اہل قلم و دانش صدور شعبہ رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر واحد نظیر نے کہا کہ ہمیں توقع ہے کہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی صدارت میں شعبہ اردو کا تاریخی شعبہ نئے رنگ و روغن سے مزید پر کشش ہوگا۔ سابق صدر شعبہ پروفیسر اسرائیل رضا نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر اعظمی کے دور صدارت میں شعبہ اردو کے وقار میں مزید اضافہ ہوگا۔ اس موقعے پر شعبہ میں ڈاکٹر صفدر امام قادری، ڈاکٹر اکبر علی، پروفیسر اسرائیل رضا، ڈاکٹر سرور عالم ندوی، ڈاکٹر منہاج الدین، ڈاکٹر نجم الحسن عارض، ڈاکٹر نعمت شمع، ڈاکٹر عندلیب عمر، عارف حسین وغیرہم کے علاوہ طلبا و طالبات اور ریسرچ اسکالر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 نومبر 2020

راجستھان

اکیسویں صدی میں اردو افسانہ۔سمت و رفتار

اودے پور: اردو ادب کی ہمیشہ سے انسان، سماج اور سیاست کی تعمیر و اصلاح میں غیرمعمولی حصے داری رہی

ہے۔ اردو کا افسانوی ادب بھی اس طرح کی حیات بخش دائمی نسخۂ کیمیا کے سرمائے سے بھرا ہوا ہے اور ہر روز اس میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ یہ پیغام شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی نے 'اکیسویں صدی میں اردو افسانہ۔ سمت و رفتار' کے موضوع پر منعقدہ یک روزہ عالمی ویبنار میں دیا۔ ویبنار کا آغاز یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر امریکا سنگھ کے دست مبارک سے آن لائن ہوا۔ افتتاح سے قبل شعبۂ اردو پروفیسر حدیث انصاری نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ویبنار کے خصوصی مہمان ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، ڈاکٹر نازیہ جھوبیگم، ماریشس، محترمہ نازنین علی کویت اور ڈاکٹر محمد نعیم، جوائنٹ سکریٹری، ہائر ایجوکیشن راجستھان سرکار اور ویبنار کے تمام شرکا کا فرداً فرداً خیر مقدم کیا۔ پروفیسر حدیث انصاری نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ تخلیق کار اگر ایک حکیم ہے تو اس کی تخلیقات بیمار ذہنیت فرد، سماج اور سیاست کی شفایابی کے لیے دائمی نسخہ کیمیا کا درجہ رکھتی ہے لیکن تخلیق کار کو بھی اپنی تخلیقات میں دائمی شفایابی کی خوبیاں پیدا کرنے کے لیے مشاہدات، تجربات، ریاضت اور صالح فکر و خیال کی معمل گاہ سے گزرنا پڑے گا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر امریکا سنگھ نے اپنے پیغام میں کہا کہ خوشی اور غم کے حادثات و واقعات کے تانے بانے سے زندگی کا پیکر گلاب کی طرح کھلتا ہے۔ انھیں واقعات اور حادثات کو کہانی کار خوش اسلوبی سے اپنی کہانی میں پیش کرسکتا ہے۔ اسی لیے کہانی کو سماج و سیاست کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ اس کی مناسب اور صحیح مثال منشی پریم چند کے افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آج کی دہلیز پر اردو افسانہ کو اپنی سمت و رفتار متعین کرنے کے لیے اپنے ماضی کے سرمائے خاص کر منشی پریم چند کی تخلیقات سے سبق لینا چاہیے۔

ویبنار کے افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند نے اپنے جامع خطاب میں کہا کہ ماضی سے آج تک اردو افسانہ نگاروں نے بڑی خوبی اور فنکاری سے افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کی یہ ریاضت مسلسل جاری ہے۔ بیسویں صدی کے وسط میں برصغیر کی تقسیم سے سماج و سیاست کا منظر نامہ یکا یک بدل گیا۔ اس کا اثر سماج و سیاست دونوں پر پڑا۔ اس دور انتشار کے حادثات و واقعات کو موضوع بنا کر ایسے شاہکار افسانے تحریر کیے گئے جو بیسویں صدی کے اردو افسانے کی اہمیت اور عظمت کی نمائندگی عالمی ادبیات میں کرتے ہیں۔ آج اکیسویں صدی میں اردو افسانہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے کئی نئی شکلیں اختیار کر چکا ہے۔ آج کا افسانہ سماجی ناہمواریوں، سماج میں بڑھتے نفسیاتی مسائل اور گلوبلائزیشن کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنا رہا ہے۔ اس برق رفتار تکنیکی اور مشینی دور میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اردو ادب میں جدید افسانوی روایت کا جائزہ لیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ آج فکشن کی روایت میں اردو افسانے کو بنیادی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ کویت سے نازنین علی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان و ادب کے اندر قدرت نے ایک مقناطیسیت کا وصف دے رکھا ہے۔ جو ہر عہد میں نشیب و فراز کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس کے عہد بہ عہد مطالعہ کرنے سے ہر عہد کے انفرادی اور اجتماعی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر محمد نعیم، جوائنٹ سکریٹری ہائر ایجوکیشن صوبائی حکومت راجستھان نے اپنے پرمغز بیان میں کہا کہ ادب اپنے عہد کے بدلتے ہوئے فرد، سماج اور سیاست کا عکس و آئینہ ہوتا ہے۔ یہ ادب تخلیق کاروں کے فکر و خیال کا مرہون منت ہوتا ہے۔ آج سماج و سیاست کے شب و روز کے جو حالات ہیں، آج کی اکیسویں صدی کا جو ہر منظر نامہ ہے اس صدی کی دو دہائیوں میں سماجی اور سیاسی طور پر جو تبدیلیاں آئی ہیں۔ اسی میں گلوبل تکنیکی تبدیلیوں کے ساتھ فکر و خیال کی تبدیلیاں بھی شامل ہیں۔ ان سب کے اثرات کو اردو افسانے نے قبول کیا ہے۔

'اکیسویں صدی میں اردو افسانہ۔ سمت و رفتار' ویبنار کے پہلے اجلاس میں پروفیسر غیاث الدین مرکزی یونیورسٹی کشمیر، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پٹنہ یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد کاظم دہلی یونیورسٹی، پروفیسر سعید ظفر انصاری کوروائی، ڈاکٹر شیخ محمد شکیل برہان پور، ایم پی کل پانچ مقالہ نگاروں نے اپنے تحقیقی اور علمی مقالات پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت کی ذمے داری پروفیسر محمد غیاث الدین صاحب نے نبھائی۔

ویبنار کے تیسرے اور آخری اجلاس میں پروفیسر سید شاہ حسین احمد آرا یونیورسٹی آرا، ڈاکٹر نعیم انیس کلکتہ، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز ممبئی یونیورسٹی، ڈاکٹر عثمان انصاری برہانپوری اور ڈاکٹر افروز ظہیر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے اپنے تحقیقی اور معلومات مقالے پیش کیے۔

رپورٹ: پروفیسر حدیث انصاری، صدر شعبۂ اردو/ کنوینر ویبنار موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور، 19 اکتوبر 2020

مہاراشٹر

اردو طنز و مزاح: کل اور آج کل

ممبئی: اردو کارواں کے زیر اہتمام مشہور و معروف طنز و مزاح نگار پطرس بخاری کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے بعنوان 'اردو طنز و مزاح کل آج اور کل اور پطرس' ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ نشست کے آغاز میں فرید احمد خان صدر اردو کارواں نے اردو کارواں کے اغراض و مقاصد اور ادبی نشست کے تعلق سے معلومات فراہم کیں، اور مہمان مقررین کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ عصر

حاضر میں اردو ادب کی یہ صنف معدوم ہوتی جارہی ہے۔ پطرس بخاری نے بہت کم لکھا لیکن جتنا لکھا ہے وہ شاہکار ہے، ہمارے طلبا کو ان کے مضامین سے واقفیت ہونی چاہیے یہی وجہ ہے کہ اس ادبی نشست میں طلبا کی بڑی تعداد موجود ہے۔ مہمان مقرر ڈاکٹر عبدالماجد نائب پرنسپل مہاراشٹر کالج نے پطرس بخاری کے تعلق سے معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا کہ طنز و مزاح اردو ادب کی اہم صنف ہے جس کا مقصد ہے معاشرے میں پیدا ہونے والی برائیوں، مسائل کو طنز اور مزاح کی چاشنی میں لپیٹ کر اس طرح بیان کرنا کہ برا بھی نہ لگے اور معاشرے کی اصلاح بھی ہوجائے۔ پطرس بخاری نے اپنے قلم سے یہی کام لیا۔ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح میں پتا ہوا اصلاح معاشرہ بھی ہے، اور مزاح کا پہلو بھی۔ جواں سال ادیب اور شاعر رضوان الدین فاروقی (بھوپال) نے پطرس بخاری کے تعلق سے اپنی بات رکھتے ہوئے پطرس کے ادبی لطیفوں کا ذکر کیا، اسی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں طنز و مزاح پر بات کرتے ہوئے میر، سودا، انشا، مصحفی اور نظیر اکبرآبادی سے لے کر اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبال تک کا تذکرہ کیا، وہیں اردو نثر میں طنز و مزاح کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے قدیم داستانوں اور غالب کے خطوط سے لے کر مشتاق یوسفی اور مجتبی حسین کے اسلوب کا تذکرہ کیا۔ پروفیسر شبانہ خان نے کہا کہ طنز و مزاح اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے، لہٰذا طلبا کے درمیان دلچسپی پیدا کرنے کے لیے نصاب میں اس کو شامل رہنا چاہیے۔ وبینار میں نوید الحق (اردو آفیسر بال بھارتی)، نصرت قادری لاتور اشفاق عمر (ثمر اکادمی مالیگاؤں)، وقار شیخ (صدر خادمان اردو شولہ پور)، منور پیر بھائی (پونہ)، سید شاہد اکرم الہ آبادی پروفیسر عائشہ شیخ (مالیگاؤں) دلاور چوگلے (ممبرا)، پروفیسر عائشہ پٹھان (شولہ پور) وغیرہ شریک رہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 17 اکتوبر 2020

اعزاز واکرام

ڈاکٹر رضیہ پروین

رامپور: صولت پبلک لائبریری کی جانب سے گورنمنٹ گرلز پی جی کالج کی پروفیسر ڈاکٹر رضیہ پروین کو 'اردو ایوارڈ' سے نوازا گیا ہے۔ لائبریری کے کانفرنس ہال میں منعقدہ ایک مختصر اور سادہ تقریب کے دوران لائبریری کے صدر سین شمین عالم نے اردو ادب کے ساتھ ہی شعبہ تعلیم و ثقافتی سرگرمیوں میں نمایاں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر رضیہ پروین کو سند امتیاز و اعزاز سے نوازا۔ غور طلب ہے کہ 2018 میں اترپردیش اردو اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر رضیہ پروین کو ان کی تخلیق 'تلاش (اکبرالہ آبادی: حیات و شاعری)' کے لیے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ اس پرمسرت موقعے پر معروف صحافی و صولت پبلک لائبریری کے رکن مجلس عاملہ اور ترجمان ذیشان محمد خاں المعروف ذیشان مراد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رامپور جو اردو ادب کا تیسرا اسکول ہونے کے ساتھ ہی علم و ادب کا گہوارہ کہلاتا ہے، اس نے اس مشکل ترین حالات میں بھی اپنی پہچان برقرار رکھی ہے۔ یہاں کے ادبی سپاہی آج بھی اپنے قلم سے بزرگوں کی وراثت کی پاسبانی میں مصروف ہیں۔ صولت پبلک لائبریری کی جانب سے کسی مجاہد اردو کو اعزاز دیا جانا انتہائی خوشی اور فخر کا مقام ہے۔ ساتھ ہی یہ اعزاز نئے لکھنے والوں کے لیے بھی تحریک ثابت ہوگا۔ انھوں نے ڈاکٹر رضیہ پروین کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم آپ سے مستقبل میں اردو ادب کی مزید آبیاری و پاسداری کی توقع رکھتے ہوئے دعا گو ہیں کہ آپ بلند مقام پر پہنچیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 10 اکتوبر 2020

کل ہند مضمون نویسی مقابلہ-2020

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) نے بانی درسگاہ سرسید احمد خاں کے یوم پیدائش کی مناسبت سے منعقدہ 'کل ہند مضمون نویسی مقابلہ 2020' کے نتائج کا اعلان کردیا ہے، جس کے مطابق 25 ہزار روپے پر مشتمل پہلا انعام انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان ایجوکیشن، سری نگر کے بی ایڈ کے طالب علم مشتاق الحق احمد سکندر نے جیتا ہے، جب کہ 15 ہزار روپے پر مشتمل دوم انعام اے ایم یو کی ایم اے کی طالبہ بشریٰ عزیز اور 10 ہزار روپے پر مشتمل سوم انعام مہاراجہ کالج، ارنا کولم، کوچی (کیرالہ) کی پی ایچ ڈی اسکالر انجنا مینن نے حاصل کیا ہے۔ مقابلہ میں حصہ لینے والے مختلف ریاستوں کے ٹاپرس جنھیں فی کس 5 ہزار روپے اور سرٹیفکیٹ بطور انعام دیا جائے گا، ان میں شروتی تیواری، نیشنل لا یونیورسٹی (نئی دہلی)، شیخ نسرین سلطانہ، ایس آر لتھرا انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، سورت (گجرات)، اینہ تبسم، سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر (جموں و کشمیر)، اقرا شمیم، اے ایم یو ملاپورم سنٹر (کیرالہ)، مومن نکہت پروین شفیق احمد، محمدیہ طبیہ کالج، منصورہ مالیگاؤں (مہاراشٹر)، گرویپ کور، کالج آف بیسک سائنسز اینڈ ہیومنٹیز، پنجاب ایگریکلچرل یونیورسٹی، لدھیانہ (پنجاب)، سلیمان ایم اے، شعبۂ اقتصادیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد (تلنگانہ)، محمد عبداللہ سرکار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اترپردیش)، اور چندریل چٹوپادھیائے، شعبۂ قانون، بردوان یونیورسٹی (مغربی بنگال) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کماری دویاوتی آنند ڈی اے وی کالج فار ویمن، کرنال کی طالبہ ساریکا اور چودھری چرن سنگھ ایگریکلچرل یونیورسٹی، حصار کے طالب علم چمن گرگ کو مشترکہ طور سے ہریانہ کا ریاستی ٹاپر اور الکریم ڈگری کالج فار ویمن، رائچور کی طالبہ عرفانہ فردوس اور یونیورسٹی آف ایگریکلچرل سائنسز، بنگلورو کے طالب علم فیروز پاشا کو مشترکہ طور سے کرناٹک کا ریاستی ٹاپر قرار دیا گیا ہے۔ مشترکہ ریاستی ٹاپرس کی انعامی رقم فاتحین میں برابر برابر تقسیم کی جائے گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اکتوبر 2020

رسم اجرا

پیام میوات

نوح، میوات: تاریخ، تمدن و ثقافتی سرگرمیاں کسی قوم کے زندہ ہونے کی نشانی ہوتی ہے جو قوم اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتی ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مورخ صدیقی احمد میو نے کیا۔ وہ آج یہاں جامعہ صدیقہ عین العلوم نوح میں رسالہ 'پیام میوات' رسم اجرا کے موقعے پر بطور مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ میوات کی تاریخ کو زندہ رکھنے میں اہم رول ادا کرے گا۔ سب سے پہلے مجلّہ کے مدیر اعلیٰ مولانا توصیف الحسن نے اس کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور تازہ شمارہ کا اداریہ پڑھ کر سنایا۔ بعد ازیں مولانا شیر محمد امینی، خطیب میوات مولانا حکیم الدین اشرف اٹاوڑی، مولانا ظفر الدین دہلی، مفتی رفیق جالیکی و مولانا حنیف منا کا وغیرہ نے بھی اپنے اپنے تاثرات پیش کرکے موجود نوجوان علما کی توجہ تحریر و مضمون نگاری کی طرف مرکوز کرائی۔ انھوں نے اردو کے تئیں اپنی فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ میوات جیسے علاقہ میں جہاں بے شمار مدارس و مکاتب موجود ہوں وہاں کوئی بچہ اردو سے نابلد ہو۔ انھوں نے پیام میوات کے ذمہ داروں کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے حاضرین کو پیام میوات کا مستقل ممبر بننے کی ترغیب بھی دی۔ دعا سے قبل مجلس کے صدر مولانا جمیل نوحی نے اپنے چند ناصحانہ کلمات پیش کرتے ہوئے علما کو ضیاع وقت سے مکمل اجتناب کرنے و کتب بینی و مطالعہ کا خاص

مشورہ دیا۔ بزرگ عالم دین و مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی کے شیخ الحدیث مولانا جمیل احمد نوحی کی صدارت و مفتی تعریف سلیم ندوی و مولانا مبارک کی نظامت میں منعقد رسم اجرا کی اس تقریب میں میواتی مصنفین و مولفین، اہل قلم حضرات سمیت علاقہ کے مقتدر علماء کرام نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 اکتوبر 2020

جامع العدد والتاریخ

پانی پت: آج یہاں اپنے فن کی منفرد کتاب 'جامع العدد والتاریخ' کا اجراعمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت شاملی سے آئے ہوئے مولانا عبدالنور اور نظامت مفتی شاہ نواز قاسمی نے کی۔ واضح ہو کہ تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل اس وقیع کتاب پر جمعیۃ علمائے ہند کے قومی صدر مولانا سید ارشد مدنی کے توصیفی و تعریفی کلمات ہیں۔ کتاب میں عدد کی تعریف، اقسام، عدد، جمع سالم ومکسر، اعداد کے عربی اور انگریزی و اردو زبان کے متبادل الفاظ، سنین کی تاریخ، ماقبل مسیح کے سنین و ماہ کی دریافت کے طریقے، اخبارات میں رائج الفاظ کی تصحیح، اعشاریہ عدد کا نظام، عدد ترتیبی کے قواعد، تاریخ و سنین، ماضی میں تاریخ کا مدار ہجری تقویم، انگریزی و سریانی تقویم، شمسی و قمری تاریخ لکھنے اور دیکھنے کے رائج طریقے، قبل از تاریخ لکھنے پڑھنے کے طریقے جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کتاب پر کئی دوسرے اہل علم کی تقریظ بھی ہے، جنھوں نے اس موضوع پر کتاب کو منفرد قرار دیا ہے۔ اس موقعے پر مولانا عبدالنور نے کہا کہ کتاب میں ان کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جن تک عام اہل علم کی رسائی کم ہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر اچھوتی اور نرالی ہے۔ مفتی شاہ نواز قاسمی نے کہا کہ انھوں نے کتاب کو حرف بحرف پڑھا ہے، اس کتاب میں اعداد اور سنین کے بارے میں جو تحقیق پیش کی گئی ہے وہ یکجا طور پر کہیں ان کی نظر سے نہیں گزری ہے۔ مفتی عزیز قاسمی نے کہا کہ حیرت ہے کہ آج کے دور میں بھی ایسے خشک موضوع پر سیکڑوں صفحات کی کتاب لکھنے والے موجود ہیں۔ کتاب کے مولف مولانا ہدایت اللہ قاسمی نے کہا کہ ان کے پیش نظر یہ ہے کہ ہمارے مدارس کے نصاب میں اعداد کے حوالے سے جو کچھ آیا ہے، وہ اصل کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ عرصۂ دراز سے یہ موضوع مجھے کھٹک رہا تھا، مگر حالات سازگار نہیں تھے۔ الحمدللہ اعداد اور سنین کی جملہ اقسام کے تعلق سے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آخر میں مولانا مجیب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اکتوبر 2020

بزم ادب

علی گڑھ: بزم ادب خواتین علی گڑھ کا ترجمان بزم ادب کے پچیسویں شمارے کی رسم اجرا کے موقعے پر بزم ادب کی ایڈیٹر ہما خلیل نے کہا کہ گزشتہ کئی مہینوں سے کووڈ 19 کی وجہ سے تمام سرگرمیاں معطل ہیں اور بزم ادب خواتین کی ماہانہ نشستوں کا انعقاد بھی نہیں ہو سکا۔ مذکورہ شمارہ بھی پچھلے ماہ تیار ہو گیا تھا لیکن روایت کے مطابق بڑے پیمانہ پر اجرا کا موقع نہ مل سکا، سردست بزم ادب کا شمارہ حاضر ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جیسا کہ سبھی کے علم میں ہے کہ ہندوستان کا یہ واحد مجلّہ ہے جس میں صرف خواتین قلم کاروں کی کاوشیں ہی شائع ہوتی ہیں۔ اس میں لکھنے والی خواتین کا تعلق ملک کے علاوہ بیرون ملک سے بھی ہوتا ہے۔ مجلّہ میں شریک خواتین قلم کار زندگی کے ہر پہلو پر لکھتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مذکورہ شمارے میں قدرے تاخیر ہوگئی۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اگلا شمارہ جنوری 2021 میں شائع ہوگا اور توقع ہے کہ روایتی انداز میں اجرا کی تقریب بھی عمل میں آئے گی۔ انھوں نے سبھی شرکا سے اپیل کی کہ وہ اپنا قلمی تعاون جاری رکھتے ہوئے نگارشات روانہ کریں، معاون ایڈیٹر بیگم آصف اظہار اور بیگم شمیم اظہار نے شمارے کے مشمولات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ مذکورہ شمارہ 272 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں انتہائی وقیع مضامین ہیں۔ انھوں نے سبھی لکھنے والوں کا مختصر تعارف کرایا۔ انھوں نے خاص طور سے مجلّہ کی ایڈیٹر ہما خلیل کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ان مساعد حالات میں رسالہ کو ترتیب دیا اور طباعت کے مرحلہ سے گزارا، آخر میں شیدہ سلمان نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اکتوبر 2020

گرہ

دیوبند: انجمن پاسبان ادب کے زیر اہتمام تین شعری مجموعوں کے شاعر اور افسانہ نگار حسرت دیوبندی کی کتاب

'گرہ' (افسانوں کا مجموعہ) کا اجرا آشو پیلس میں ہوا۔ اس موقعے پر اپنے خطبۂ صدارت میں ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ ایک ہی وقت میں درس و تدریس کے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ شاعری کرنا، افسانے اور مضامین لکھنا اور اپنے کنبے کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ بہترین تربیت کرنا یقیناً بہت مشکل کام ہے، مگر حسرت دیوبندی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اس کام کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آدمی کی سب سے بڑی ذمے داری یہ بنتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بھرپور وقت دے اور تعلیم سے اور ادب سے جوڑ کر رکھے۔ منگلور سے تشریف لائے پروفیسر تنویر چشتی نے کہا کہ اردو زبان کسی خاص فرقے یا مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ اس سے سارے ہندوستانی لطف اندوز ہوتے ہیں، نیز یہ پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ حسرت دیوبندی اپنی شاعری کی طرح افسانوں اور کہانیوں سے بھی سماج کو ذہنی آلودگی سے دور رہنے کا پیغام دیتے ہیں۔ حسرت دیوبندی نے کہا کہ وہ اردو زبان کے ایک معمولی خادم ہیں جو اپنی شاعری، افسانوں اور مضامین کے ذریعہ آپسی بھائی چارے اور ایک دوسرے کے لیے دلوں میں احترام کا جذبہ رکھنے کا پیغام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے رسم الخط کو زندہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہمارا ملی فریضہ ہے۔ نیز ہر شخص کو عہد کرنا چاہیے کہ وہ کم سے کم اپنے بچوں کو اور ایک دیگر شخص کو اردو ضرور پڑھائے گا۔ میونسپل بورڈ کے چیئرمین ضیاء الدین انصاری نے کہا کہ حسرت دیوبندی اور ان کے جیسے سبھی قلم کار دیوبند کا نام دنیا بھر میں روشن کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ نظامت کر رہے کمل دیوبندی نے حسرت دیوبندی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ دیوبند کی سرزمین سے افسانوں کا مجموعہ شائع کرنے والے حسرت دیوبندی پہلے افسانہ نگار ہیں۔ اس لیے ان کا کام تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، جمال الدین انصاری، ولی حسن انصاری، شاعر شمیم کرتپوری اور نوشاد عرشی نے بھی حسرت دیوبندی کی خدمات کو سراہتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں حسرت دیوبندی کے صاحبزادگان اور پروگرام کے کنوینر پروفیسر محمد فاروق، اعظم انصاری (آئی آئی ٹی) اندور و ڈاکٹر محمد طارق نیر (یوٹیوبر) نے تمام مہمانان کرام کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 اکتوبر 2020

وفیات

ساحر شیوی

نئی دھلی: معروف شاعر، ادیب اور ماہنامہ 'پرواز' لندن (برطانیہ) کے مدیر ڈاکٹر ساحر شیوی کا 17 اکتوبر کی

صبح نیوٹن (لندن) میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 84 برس تھی۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہیں۔ ساحر شیوی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان کا اصلی نام عبداللہ تھا، ساحر شیوی قلمی نام تھا۔ ان کی ولادت 29 دسمبر 1932 میں مہاراشٹر کے شیو، کوکن میں ہوئی تھی۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگرد مولانا قمر نعمانی سہرامی اور کالی داس گپتا رضا کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ہندوستان سے نیروبی (کینیا) آگئے۔ وہاں سے کراچی (پاکستان) پھر نیروبی ہوتے ہوئے برطانیہ آکر مستقل طور پر قیام پذیر ہوگئے۔ ہندوستان سے باہر مشرقی افریقہ اور پھر برطانیہ میں اردو کی بقا کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے والے اس سچے مجاہد اردو کی خدمات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ریلیز کے مطابق انھوں نے تمام مروجہ صنف سخن میں نہ صرف شاعری کی ہے بلکہ بیشتر اصناف میں ان کے پورے پورے یک موضوعی دیوان شائع ہوچکے ہیں۔۔ نثر میں بھی ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ شاعری اور نثر کی پچاس سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ساحر صاحب کو بے شمار چھوٹے بڑے اعزاز مل چکے ہیں۔ جشن ساحر شیوی ڈنمارک، ٹورنٹو، جے پور، علی گڑھ اور پونہ میں شاندار طریقے سے منائے گئے۔ صحرائے افریقہ میں اردو کا نقیب، ادیب انٹرنیشنل گولڈ ایوارڈ، ہولینڈ کے ادارے کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری، جرمنی میں کوکن کا فردوسی کے خطاب سے نوازا گیا، نیز انھیں بزم شعر و سخن (یو کے) کی جانب سے مغربی ممالک میں اردو کے نقیب کے خطاب سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 20 اکتوبر 2020

سلیم اختر

سیتاپور: شاعر و افسانہ نگار سلیم اختر کا طویل علالت کے بعد 2 نومبر 2020 کو 65 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ سلیم اختر کا شمار سیتاپور کے اچھے ادیبوں میں کیا جاتا تھا۔ ان کو نہ صرف بہترین شعر کہنے کا ملکہ حاصل تھا بلکہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کا کلام اور افسانے ہندوستان کے تمام ادبی رسالوں میں برابر شائع ہوتے تھے۔ سلیم اختر سیتاپور کی سب سے بڑی ادبی تنظیم بزم اردو کے سکریٹری بھی تھے۔ بزم اردو کے ذریعے انھوں نے تقریباً 45 برس تک ادب کی خدمت انجام دی۔ انھیں بزم اردو کا روح رواں تسلیم کیا جاتا تھا۔ گزشتہ کچھ برسوں میں انھوں نے قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر پر اردو زبان کی تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ سلیم اختر کے انتقال کی خبر سن کر یہاں ادبی حلقوں میں زبردست رنج و غم کا ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ وہ ایک عمدہ اور نیک دل انسان تھے۔ رانو کتاب گھر کے نام سے اردو لائبریری کی شروعات کرکے انھوں نے نوجوانوں کو ادب سے جوڑنے میں نمایاں کام انجام دیا۔ ان کی ادبی خدمات بیش قیمتی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 نومبر 2020

مولانا حسن الہاشمی

دیوبند: دیوبند کی معروف سماجی شخصیت، عالم دین، قلمکار، روحانی معالج مولانا حسن الہاشمی انتقال کرگئے۔

ادارہ خدمت خلق کے بانی اور روحانی شخصیت و سماجی خدمت گار مولانا حسن الہاشمی کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا ہے۔ مولانا حسن الہاشمی کے انتقال پر مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند کے منیجر و جملہ اسٹاف نے صدمہ کا اظہار کرتے ہوئے پسماندگان سے اظہار تعزیت کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیوبند پریس ایسوسی ایشن بالخصوص اردو صحافیوں نے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اہل خانہ سے تعزیت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے آمین۔ حسن الہاشمی (حسن احمد صدیقی) عامر عثمانی کے داماد، فاضل دیوبند عامر عثمانی مرحوم کے بعد کام کو جاری رکھنے والے ماہنامہ 'طلسماتی دنیا' کے مدیر اعلیٰ تھے۔ ان کی نگرانی میں 'ادارہ خدمت خلق دیوبند' بھی رہا۔ صاحب علم و قلم، متواضع اور بے حد مخلص و اخلاق مند تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 نومبر 2020

خراج عقیدت

ڈاکٹر عظیم امروہوی

امروھه: ڈاکٹر عظیم امروہوی کی وفات پر عالمی مرثیہ سنٹر میں آن لائن ایک بین الاقوامی تعزیتی اجلاس کا انعقاد کیا گیا، جس میں ملک و بیرون ملک کے نامور اسکالرس نے شرکت کی اور ڈاکٹر عظیم امروہوی کے کاموں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی صدارت آسام اور جھارکھنڈ کے گورنر سید سبط رضی نے کی جبکہ نظامت سلیم امروہوی نے کی۔ پروگرام میں 40 سے زیادہ اسکالرس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مرثیہ کے حوالے سے اردو ادب میں خصوصی طور پر ڈاکٹر عظیم امروہوی کو عظیم شاعر قرار دیا۔ پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ ڈاکٹر عظیم امروہوی ہمارے تہذیبی و علمی ورثہ کے حقیقی امین تھے۔ وہ آج کے عہد میں رثائی ادب کے میر کارواں تھے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر عظیم امروہوی ہمارے اعلیٰ نمونوں کی مثال تھے۔ معروف شاعر منور رانا نے کہا کہ عظیم بھائی سراپا محبت تھے، ان میں اتنی محبت تھی کہ اگر ان کے جسم کا کوئی حصہ کاٹا جاتا تو صرف دل ہی اس میں سے نکلتا اور محبت ہی محبت سے بھرا ہوتا۔ سابق گورنر سید سبط رضی نے کہا کہ ڈاکٹر عظیم امروہوی محبتوں کا دریا تھے، ان میں محبت کا ایک سیلاب ابلتا تھا، وہ جہاں بھی ملتے تھے خلوص سے ملتے تھے۔ آج انھیں اپنے مداحوں کے ذریعے پوری دنیا میں یاد کیا جارہا ہے۔ انھوں نے نہ صرف امروہہ شہر کا نام روشن کیا بلکہ پوری دنیائے اردو زبان میں ہمارے ملک کا نام روشن کیا ہے۔

عارف نقوی جرمنی نے کہا کہ ڈاکٹر عظیم کی شکل میں اردو زبان کا ایک روشن چراغ گل ہوگیا۔ برصغیر کے معروف شاعر اور ادیب ڈاکٹر عظیم امروہوی اپنے نام کی طرح عظیم تھے۔ ڈاکٹر محمد اعظم انگلینڈ نے کہا، جب ہم انگلینڈ میں اردو شاعروں کے اپنے ہندوستانی شاعر ڈاکٹر عظیم امروہوی کا ذکر سنتے تھے تو ہمیں بہت فخر ہوتا تھا۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اپنے وطن کے ایک شاعر نے پوری دنیا میں ایک منفرد مقام بنایا۔ میں نے انھیں پڑھا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے نہیں مل سکا۔ سنیتا جھنگران لکھنؤ نے کہا کہ عظیم نام، عظیم کام، عظیم لہجہ، عظیم فکر، عظیم شاعر عظیم امروہوی کی عظمت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج پوری دنیا میں عظیم بھائی کا غم منایا جارہا ہے۔ میں نے ان کا کلام پڑھا اور جلد ہی میں اسے اپنی آواز دوں گا۔ پروفیسر شاہد مہدی چانسلر جامعہ ہمدرد نے کہا کہ علم اور ادب و تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر عظیم امروہوی کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مسلسل تحقیق کے کام میں مصروف تھے اور آخری وقت تک وہ اردو زبان کے فروغ میں مصروف رہے۔ ڈاکٹر پاپولر میرٹھی نے کہا کہ ڈاکٹر عظیم امروہوی کی 50 کتابیں اردو ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہیں، جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مرثیہ کے میدان میں ایسا کوئی عظیم نہیں ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 نومبر 2020

مظفر حنفی

نئی دہلی: مشہور ناقد اور شاعر پروفیسر مظفر حنفی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے انھیں نابغہ روزگار قرار دیا اور کہا کہ ان کی شخصیت اردو ادب کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات انھوں نے پروفیسر مظفر حنفی کی یاد میں منعقدہ شعبہ اردو بھیرب گنگولی کالج کولکاتا کی جانب سے منعقدہ ایک بین الاقوامی ویبینار میں مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے مظفر حنفی مرحوم سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت شفیق تھے اور ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ بہترین نقاد تھے اور شاد عارفی پر ان کا بہترین کام ہمارا بہترین ترکہ ہے۔ پروفیسر صفدر امام قادری نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مظفر حنفی مرحوم کی ادبی خدمات پر مفصل گفتگو کی۔ آپ کا خطبہ عالمانہ تھا۔ آپ نے باریک بینی سے مظفر حنفی مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا۔ صفدر امام قادری نے حنفی صاحب کو بلند پایہ ادبی شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ آپ شاد عارفی کے شاگرد تھے۔ حنفی صاحب نے ان ہی کے طرز ادا کو مزید استحکام بخشا۔ آپ کی حیثیت نہ صرف بلند پایہ شاعر کی تھی بلکہ آپ اچھے ناقد بھی تھے۔ امید ہے آنے والی نسل مظفر حنفی مرحوم کے مقام ومنہاج کو متعین کرے گی۔ عالمی سطح پر اردو ادب کی خدمات انجام دینے والی تنظیم بزم صدف انٹرنیشنل کے چیئرمین شہاب الدین احمد نے قطر سے بحیثیت مہمان ذی وقار شرکت کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم مظفر حنفی کو اپنے والد محترم پروفیسر ناز قادری مرحوم کے ہمراہ بچپن میں دیکھا ہے اور وہ علم و ادب کا سمندر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سال کے بزم صدف انٹرنیشنل کا ایوارڈ پروفیسر مظفر حنفی کو دینے کا اعلان سال کے شروع میں ہی کیا جاچکا ہے لیکن کورونا کی وجہ سے ہم مجلس منعقد کرنے سے قاصر رہے اور حنفی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ادارہ بہت جلد یہ ایوارڈ قطر میں ادبی تقریب منعقد کرکے ان کے اہل خانہ کے سپرد کرے گا۔ جاوید دانش (کناڈا) نے مظفر حنفی سے کلکتہ میں ان کی رہائش گاہ پر ہونے والی ملاقات اور ادب اطفال پر ان کی کتاب اور اس سے متعلق گفتگو کا خصوصی ذکر کیا۔ جرمنی کی مشہور ادبی شخصیت انور ظہیر رہبر نے مظفر حنفی کو شاعر بے نظیر سے تعبیر کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر واحد نظیر نے مظفر حنفی کی شاعری کے رموز و نکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ پروفیسر ابوبکر جیلانی نے حنفی صاحب سے اپنے مراسم اور کلکتہ یونیورسٹی سے متعلق ان کی خدمات کا ذکر کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 27 اکتوبر 2020

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ-/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail: sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

بھارت کا آئین

چھٹی اشاعت: 2019

صفحات: 515

قیمت: 330 روپے

آج کے عالمی تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ

مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 467

قیمت: 240 روپے

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

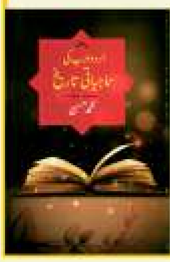

مصنف: محمد حسن

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 334

قیمت: 160 روپے

دربارِ اکبری

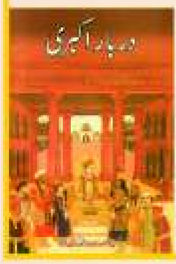

مصنف: شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

تیسری طباعت: 2020

صفحات: 1070

قیمت: 475 روپے

گرونانک: حیات وخدمات

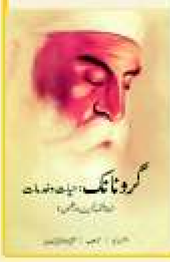

مرتبین: اختر الواسع، محمد حبیب

مفتی محمد مشتاق تجاروی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190، قیمت: 110 روپے

حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل

مصنف/مترجم: حافظ شائق احمد یحییٰ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 132

قیمت: 90 روپے

راسخ عظیم آبادی: کلاسیکیت، شعریت اور انفرادیت

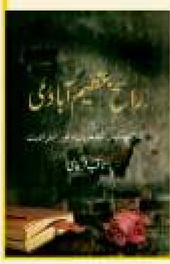

مصنف: ثاقب فریدی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 422

قیمت: 200 روپے

رامپور کے فارسی گو شعرا

مولفہ: ساجدہ شیروانی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 290

قیمت: 160 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, December-2020, Vol.22, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/11/2020**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025